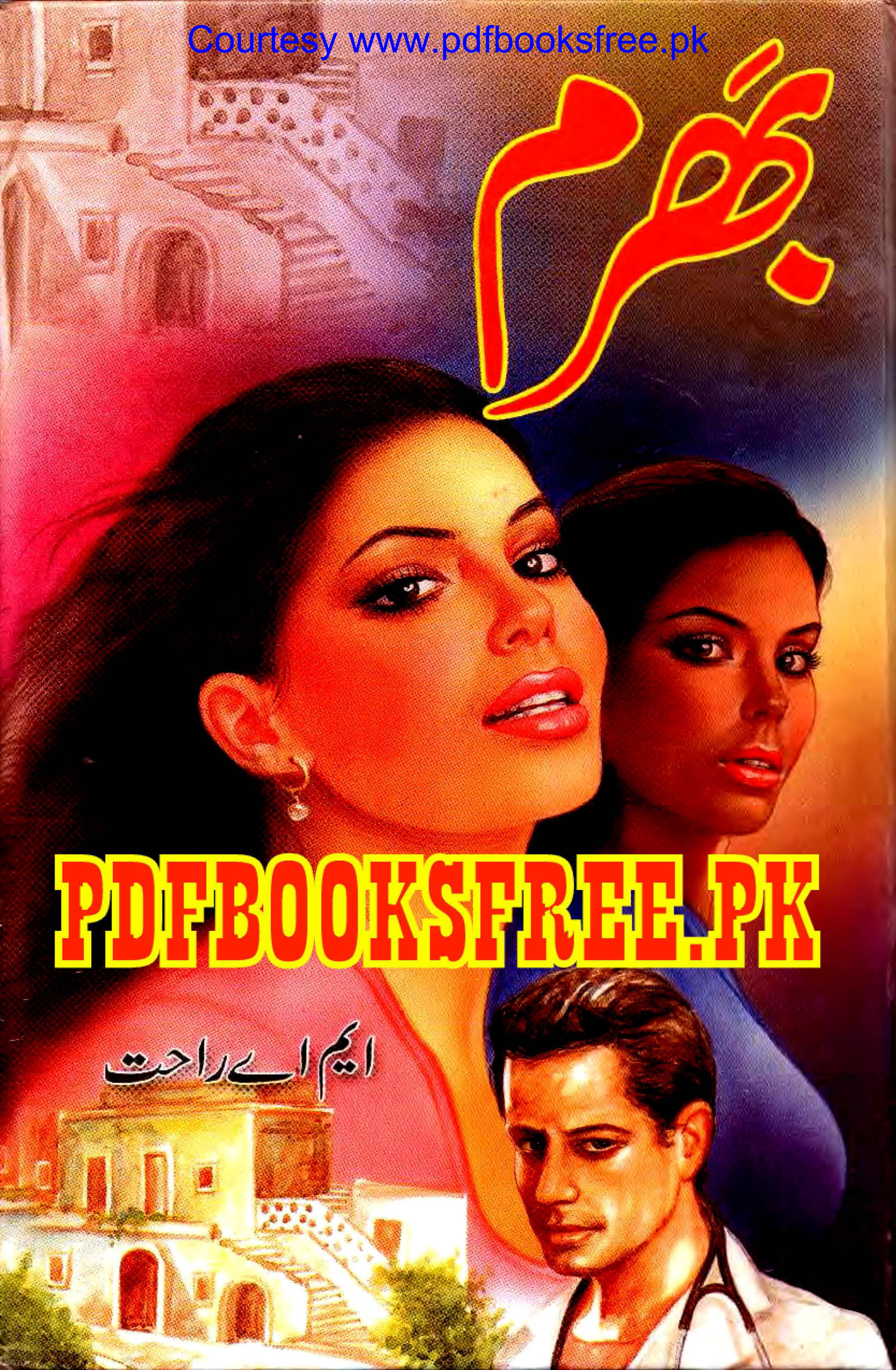


بھرم

PDFBOOKSFREE.PK

ایم اے راحت



نام کتاب	بھرم
مصنف	ایم اے راحت
طابع	نواب سنز پبلی کیشنز
مطبع	فیض الاسلام پرنٹرز
مروف آرائی	میٹرکس کمپوزرز
سرورق	ڈاکر
تعداد	۵۰۰
اشاعت	۲۰۰۸ء

قادر بیگ کا ایمان تھا کہ جنت صرف اور صرف ماں کے قدموں تلے ہے، چنانچہ جنت کے حصول کے لئے وہ ماں کی پرستش کرتا تھا۔ تعلیم سے فراغت کے بعد اسے ملازمت مل گئی۔ معقول تنخواہ تھی۔ گھر کے حالات بھی بُرے نہیں تھے۔ رنگ خاصا سیاہ اور نقوش بھدے تھے لیکن ایسا دنیا کی نگاہ میں تھا۔ ماں کے لئے وہ روایتی حسین تھا۔ اتنا حسین کہ کسی اور پر اس کی نگاہ ہی نہیں ٹکتی تھی۔ برسرِ روزگار ہونے کے بعد ماں کو اس کے لئے چاندی بہو کی تلاش شروع ہو گئی۔ ہر طرف سے کوششیں کرنے کے بعد اسے ایک چاندی بہو مل گئی۔ ایک برسرِ روزگار اور نہایت معقول تنخواہ کے نوجوان کے چہرے کو بھلا کون دیکھتا ہے۔ جس گھرانے میں رشتہ دیا گیا تھا انہوں نے فوراً رشتہ قبول کر لیا اور خوشی سے یہ شادی کرنے پر تیار ہو گئے۔ شاہینہ واقعی چاندی بہو تھی۔ لیکن اس چاندی بہو کو بھی کسی چاند زادے ہی کی آرزو تھی۔ ماں باپ ذرا قدامت پرست تھے چنانچہ انہوں نے بیٹی سے مشورہ کئے بغیر رشتہ منظور کر لیا تھا بھلا ایک ایسے ذہین اور ہونہار نوجوان کو ٹھکرانا کون پسند کرتا ہے۔ شاہینہ حسن پرست تھی۔ ماں باپ سے تو خیر کبھی اس طرح کا تذکرہ نہیں ہوا تھا لیکن دوستوں اور سہیلیوں سے وہ اکثر کہا کرتی تھی۔

”بھئی دیکھو، زندگی کا ساتھی کم از کم ایسی شکل و صورت کا تو ضرور ہو کہ اس کے ساتھ کہیں باہر نکلتے ہوئے کوئی شرم محسوس نہ ہو اور پہلوئے حور میں لنگور والی بات نہ ہو جائے۔“ اسے کالج کا ایک لڑکا بھی پسند تھا۔ جس کا نام ہمایوں تھا، ہمایوں سے اس کے کوئی عہد و پیمان تو نہیں ہوئے تھے لیکن دونوں کی نگاہوں میں ایک دوسرے کے لیے پسندیدگی کے جذبات تھے اور جب بھی کبھی کسی جگہ ٹکراؤ ہو جاتا۔ دونوں کی نگاہوں میں محبت کے آثار نمودار ہو جاتے تھے۔ تعلیم سے ابھی مکمل طور پر فراغت نہیں ہوئی تھی کہ یہ رشتہ ٹپک پڑا۔ اگر قادر بیگ اپنی حیثیت کے ساتھ ساتھ اچھی شکل و صورت کا مالک بھی ہوتا تو شاہینہ بآسانی ہمایوں کو نظر انداز کر

سکتی تھی کیونکہ وہاں بات ایک زیر لب مسکراہٹ سے کبھی آگے نہیں بڑھی تھی نہ ہی کبھی ساری زندگی کا ساتھ نبھانے کے بارے میں غور کیا گیا تھا۔

جب قادر بیگ بردکھاوے کے لئے آیا تو شاہینہ کی سہیلیوں نے لڑکے کو دیکھنے کا خفیہ اہتمام کیا۔ شاہینہ بھی اس وقت اس جگہ آگئی جہاں سے باہر جھانکا جاسکتا تھا۔ قادر بیگ ایک خوبصورت سوٹ میں ملبوس صوفے پر آکر بیٹھا تو جھانکنے والوں کے چہرے ایک جھٹکے سے پیچھے ہٹ گئے۔ انہوں نے ایک دوسرے کی شکل دیکھی شاہینہ نے بھی دلچسپی سے باہر نگاہ دوڑائی اور ایک لمحے میں اسے اندازہ ہو گیا کہ امیدوار کون سا ہے اس کا چہرہ فق ہو گیا تھا اور اس کے منہ سے نکلا تھا ”یہ..... یہ..... قادر..... یہ قادر بیگ ہے۔“

سہیلیوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ قادر بیگ کے نرم انداز گفتگو اور اس کی تہذیب نے ماں باپ کا دل موہ لیا تھا لیکن شاہینہ بہت دیر تک اپنی دوستوں سے کہتی رہی۔

یہ والدین اس طرح ہماری زندگی پر قابض کیوں ہو جاتے ہیں؟ کیا ان کی آنکھیں نہیں ہیں؟ کیا انہوں نے یہ نہیں دیکھا کہ وہ کالا ساٹھ میرے قابل ہے؟ کیوں نہیں سوچا انہوں نے یہ تو ظلم ہے۔

شاہینہ کے والد کافی سخت گیر انسان تھے لیکن ماں بیٹی کا رشتہ ذرا الگ ہوتا ہے۔ شاہینہ نے تنہائی میں ماں سے کہا۔ ”کیا فیصلہ کیا آپ نے اس حسین نوجوان کے بارے میں، جس کا رشتہ میرے لئے آیا ہے؟“

ماں بیٹی کے طنز کو نہ سمجھی اور والہانہ انداز میں بولی۔ ”بہت اچھا لڑکا ہے اتنا تہذیب یافتہ اور خوش مزاج کہ میں تو لٹو ہوگئی ہوں اس پر، میں تجھے اس کی تصویر منگوا کر دکھاؤں گی۔“

”خوب ہیں آپ امی، میں اسے دیکھ چکی ہوں اور بہتر یہ ہوگا کہ اس سے شادی کرنے کے بجائے میں خودکشی کر لوں۔“

ماں کچھ لمحوں کے لئے تو دنگ رہ گئی لیکن پھر اس نے کہا۔ ”بیٹا کون سی دنیا میں جی رہی ہو۔ جانتی ہو باہر کے حالات کیا ہیں؟ رشتوں کا تصور ہی مٹ چکا ہے۔ لوگ اتنا بڑا منہ کھول کر آتے ہیں، جہیز میں یہ چاہیے، وہ چاہیے۔ تمہیں پتہ ہے بہترین تنخواہ ہے قادر بیگ کی۔ صرف ایک ماں ہے، نہ نند نہ بھانج نہ اور کوئی۔ آرام سے زندگی گزرے گی بیٹا۔ صورت تو چند روزہ

ہوتی ہے پھر وہی صورت اس طرح آنکھوں میں کھب جاتی ہے کہ اس سے اچھا اور کوئی نہیں لگتا۔ قادر بیگ بہت ہی نفیس لڑکا ہے اور پھر سچی بات یہ ہے کہ پڑھا لکھا اور اچھی حیثیت والا ہے ہم تمہیں اس سے بڑا گھر نہیں دے سکتے شاہینہ۔“

”تو نہ دیں آپ مجھے بڑا گھر، پڑا رہنے دیں مجھے اسی گھر میں، مجھے کوئی ضرورت نہیں ہے۔ آپ میری شادی اس کے ساتھ کرنے کا فیصلہ نہ کریں امی جان۔ سچ بتا رہی ہوں آپ کو، میں خودکشی کر لوں گی۔“

تب اسی وقت ریاض احمد اندر داخل ہو گئے اور دونوں ماں بیٹیاں چونک پڑیں۔ ریاض احمد کے چہرے پر گہری سنجیدگی طاری تھی۔ انہوں نے کہا۔ ”یہاں آتے ہوئے میرے ذہن میں تم ماں بیٹیوں کی کوئی بات سننے کی خواہش یا خیال نہیں تھا۔ اتفاق سے میں نے تم دونوں کی باتیں سن لی ہیں۔ بیٹا شاہینہ میں تمہاری بہترین مدد کر سکتا ہوں کہ خودکشی کیسے کرو۔ گھر سے باہر جا کر خودکشی کرنا چاہو تو مجھے دو ایسی جگہوں کے بارے میں معلومات حاصل ہیں جہاں خودکشی آسانی سے کی جاسکتی ہے۔ پہلی ٹرین کا وقت تمہیں بتا دوں گا۔ پڑی پر سر رکھو آسان موت واقع ہو جاتی ہے۔ دوسری جگہ ندی کا پل ہے پل کے نیچے پانی بھی ہے اور چٹانیں بھی اور بلندی اتنی ہے کہ گروگی تو مرنے میں کوئی دقت نہیں ہوگی۔ اس کے علاوہ شیشے کی چوڑیاں گھر میں موجود ہیں۔ ذرا موٹی موٹی پیس کر پانی سے پھانک سکتی ہو۔ ہاتھ روم میں فلش صاف کرنے والا تیزاب رکھا ہوا ہے اسے پی کر بھی آسانی سے مرا جاسکتا ہے۔ اگر اس کے علاوہ کوئی اور نظریہ ہو تو مجھے بتا دینا میرا فرض ہے کہ میں تمہاری مدد کروں واقعی تمہیں مرجانا چاہیے۔“ یہ کہہ کر ریاض احمد باہر نکل گئے تھے اور ماں بیٹیاں ہکا بکا بیٹھی رہ گئی تھیں۔

موت بہر حال آسان چیز نہیں ہوتی۔ شاہینہ کئی راتیں سوچتی رہی تھی اور آخر کار خاموشی اختیار کر لی۔ چنانچہ قادر بیگ سے اس کی شادی ہوگئی۔ ہمایوں بھی اس شادی میں شریک ہوا تھا اور دور دور سے شاہینہ کو دیکھتا رہا تھا جو دلہن بنی ہوئی بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔

جملہ عروسی میں شاہینہ نے قادر بیگ پر اپنی دلی کیفیت کا اظہار کر دیا۔ ”دیکھئے میرا آپ کا کوئی تعارف نہیں ہے میں نے صرف آپ کے بارے میں سنا تھا حالانکہ دور یہ چل رہا ہے کہ لڑکا اور لڑکی ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں، پسند کرتے ہیں، تب شادی ہوتی ہے لیکن میرے ماں

دینے کے بعد اس نے سب سے پہلے بیٹی کا چہرہ دیکھا تھا اور دیکھ کر آنکھیں بند کر لی تھیں کیونکہ لڑکی اپنے باپ کی ہم شکل تھی۔ ماں جیسے حسین نقوش اس نے نہیں پائے تھے۔ پہلے ہی لمحے سے شاہینہ کو اپنی بیٹی سے نفرت ہو گئی۔ جس دن بیٹی پیدا ہوئی اسی دن ریاض احمد دل کے دورے سے چل بسے۔ ماں تو پہلے ہی دے کی مریض تھیں، شوہر کی موت کے بعد وہ بھی صاحب فراش ہو گئیں۔

شاہینہ اپنی بیٹی سے شدید نفرت کا اظہار کرتی تھی اور اسی نفرت محبت کے ساتھ شکیلہ پروان چڑھنے لگی۔ سانولے چہرے اور بھدے نقوش کی شکیلہ کو باپ کی محبت اور قربت حاصل تھی لیکن ماں کی طرف سے اسے ذرا بھی پیار نہیں ملتا تھا۔ صحیح معنوں میں قادر بیگ نے شکیلہ کی پرورش کی لیکن شکیلہ لمحہ لمحہ یہ محسوس کرتی رہی کہ ماں اسے نفرت کی نگاہ سے دیکھتی ہے کوئی ایک دن یا ایک رات یا ایک لمحہ ایسا نہیں ملا اسے جو ماں کی محبت سے مرصع ہو۔

سمجھدار ہوتی جا رہی تھی۔ شاہینہ کا رویہ باپ اور بیٹی کے ساتھ ایک جیسا تھا یہاں تک کہ شکیلہ کی عمر اچھی خاصی ہو گئی البتہ اس کے اندر ایک عجیب سی وحشت پلنے لگی تھی وہ فطرتاً اذیت رساں ہوتی جا رہی تھی نہ ماں کو پتہ تھا نہ باپ کو کہ تنہائی میں اس کے مشاغل کیا ہوتے ہیں پرندوں کو پکڑ کر ان کے پر توڑ دینا، انہیں جلتی ہوئی آگ میں ڈال دینا، اس کا محبوب مشغلہ تھا رنگین اور حسین تیلیوں کو وہ ہتھیلی کے درمیان مسل کر ہتھیلیوں کو دیکھتی رہتی پھر بات اس سے آگے بڑھی بلیوں اور دوسرے چھوٹے موٹے جانوروں کو ہلاک کر دینا اس کا محبوب مشغلہ بن گیا۔ باپ کے سامنے ٹھیک رہتی تھی البتہ ماں کی نفرت کا جواب وہ نفرت ہی سے دیتی تھی۔

تقدیر نے ایک اور جھٹکا دیا قادر بیگ ایک دن آفس سے گھر واپس آ رہا تھا کہ گاڑی نے اسے کچل ڈالا اور وہ موقع پر ہی ہلاک ہو گیا۔ اس کی میت گھر آئی تو شاہینہ نے جھوٹ موٹ کی رسمیں نبھائیں شکیلہ البتہ بہت دیر تک بیٹھی باپ کا چہرہ دیکھتی رہی تھی۔

قادر بیگ کی تدفین ہو گئی گھر میں ماں بیٹی تھیں اور دونوں کے درمیان نفرت کا ایک دلچسپ کھیل جاری ہو گیا تھا شکیلہ کا طرح طرح سے ماں کو اذیت دینا اس کا معمول بن گیا تھا جوان ہو گئی تھی، پڑھ لکھ بھی رہی تھی لیکن ماں کے ساتھ شرارتیں کرتی رہتی تھی۔

ایک رات ملازمہ نے دودھ کا گلاس لا کر رکھا اور شاہینہ نے اس کی جانب ہاتھ بڑھایا تو

باپ جو قد امت پرست ہیں انہوں نے مجھے میری مرضی کے خلاف آپ کے ساتھ شادی پر مجبور کر دیا۔ میں انتہائی معذرت کے ساتھ کہتی ہوں کہ میں آپ کو اپنی پسند کا مقام نہیں دے سکتی۔“ قادر بیگ پتھر کے بت کی طرح کھڑا یہ سب کچھ سنتا رہا پھر اس نے نرم لہجے میں کہا۔ ”مجھے افسوس ہے کہ میری عدم واقفیت آپ کے لئے مشکل بنی۔ آپ کی اس مشکل کا حل اگر میرے ذریعے آپ کو مل سکتا ہے تو آپ براہ کرم مجھے بتا دیجئے میں آپ کی بھرپور مدد کروں گا۔ ہاں ایک درخواست ضرور کروں گا مجھے اس کمرے میں سونے کے لئے جگہ دے دیجئے کیونکہ میری ماں بڑی اُمید بھری ہے۔ ہم کوئی حل ضرور نکال لیں گے اس وقت تک آپ ماں کا دل نہ توڑیے میں آپ کا یہ احسان مانوں گا۔“

شاہینہ خاموش ہو گئی اتنا تعاون اس نے قادر بیگ کے ساتھ ضرور کیا تھا کہ کسی کے سامنے اس نے کوئی اظہار نہ ہونے دیا۔ حل اس کی نگاہوں میں بھی نہیں تھا۔ ماں باپ کو چھوڑنا پڑتا سسرال کو چھوڑنا پڑتا۔ زندگی سے اتنی واقفیت نہیں تھی کہ اپنے لئے کوئی اعلیٰ مقام تلاش کر سکتی۔

قادر بیگ نے ایک لمحے کے لئے بھی ماں کو محسوس نہیں ہونے دیا کہ بیوی اور اس کے درمیان کوئی رشتہ نہیں ہے۔ قادر بیگ نے تو اپنی طرف سے شرافت کی حد کر دی تھی لیکن شاہینہ کے دل میں قادر بیگ کے لئے کوئی گنجائش نہیں پیدا ہوئی تھی حالانکہ وہ جانتی تھی کہ قادر بیگ انتہائی شریف اور نفیس انسان ہے۔ وہ اس کی ہر خوشی اور ہر ضرورت کو پورا کرتا تھا اور شاہینہ یہ بات بھی محسوس کرتی تھی کہ قادر بیگ کے دل میں اس کی طلب ہے۔

شاہینہ نے بہت کچھ سوچا تھا۔ ہمایوں سے بھی اس کے بعد ملاقات نہیں ہوئی تھی اور پھر اس نے قادر بیگ کو اپنے قریب آنے کی اجازت دے دی۔ سسک سسک کر زندگی گزارنے سے کیا فائدہ البتہ جب قادر بیگ اس کے قریب ہوتا تو وہ اپنی آنکھیں بند رکھتی تھی۔

قادر بیگ نے بھی یہ بات محسوس کر لی تھی۔ دل تو ہر انسان کا دکھتا ہے۔ کون اپنے آپ کو کسی سے کمتر سمجھنے کو تیار ہوتا ہے لیکن کچھ لوگ حماقت کی حد تک شریف ہوتے ہیں تمام تر قربتوں کے باوجود قادر بیگ کبھی شاہینہ سے شکایت نہ کر سکا۔

پھر ماں کا انتقال ہو گیا اور شاہینہ ایک بیٹی کی ماں بن گئی۔ البتہ ہسپتال میں بیٹی کو جہم

شکیلہ نے ایک دم اس پر ہاتھ رکھ کر اسے روک دیا۔ شاہینہ نے گھور کر اسے دیکھا۔ ”کیا بدتمیزی ہے؟“

”نہیں میری پیاری می ابھی آپ کو اور جینا چاہیے؟“

”کیا مطلب؟“

”بتاتی ہوں۔“ شکیلہ نے کہا اور گلاس کا دودھ ایک برتن میں ڈال کر بلی کے سامنے رکھ دیا بلی نے دودھ پیا ابھی آدھا دودھ بھی نہیں پیا تھا کہ اس کی ہولناک غرائشیں بلند ہونے لگیں اور وہ زمین پر گر کر ترپنے لگی۔

شاہینہ نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھا اور بولی۔ ”یہ یہ یہ..... یہ کیا ہے؟“

”زہری، دودھ میں ایک مہلک زہر ملا ہوا تھا۔“

”کک..... کیا..... کیا مطلب۔ یہ کیسی ملازمہ.....“

”نہیں می ملازمہ کی بھلا کیا ہمت کہ وہ ایسا کوئی قدم اٹھا سکے۔“

”تو پھر؟“

”میں نے ہی زہر ڈالا تھا دودھ میں۔“

”تت..... تم نے؟“

”ہاں می ایسے ہی تفریحا میں نے یہ زہر اپنے کالج کی لیبارٹری سے چرایا تھا آپ کے ساتھ مذاق کرنے کے لئے۔“

”اور اگر تم یہاں نہ ہوتیں اور میں یہ زہر پی لیتی۔“

”تو پھر آپ بھی اس بلی کی طرح ترپ رہی ہوتیں مگر آپ تو میری می ہیں جینا چاہیے

اتنی خوبصورت می کو دیکھ کر میرا دل باغ باغ ہو جاتا ہے چلیے میں خوبصورت نہ سہی میری ماں کو تو

آج بھی لوگ تعریفی نگاہوں سے دیکھتے ہیں بہت اچھا لگتا ہے مجھے می۔“

”شکیلہ..... مارنا چاہتی ہو تم مجھے؟“

”لیجئے کیسی باتیں کر رہی ہیں مارنا چاہتی تو اس زہر کے بارے میں آپ کو بتاتی کیوں یہ

تو ایسے ہی مذاق کر رہی تھی میں آپ سے۔“

نجانے کیوں شاہینہ کو شکیلہ سے خوف سا محسوس ہونے لگا تھا اکثر وہ کبھی کبھی شکیلہ کے علم

میں لائے بغیر اس کا چہرہ دیکھتی تھی گو اس بد صورت چہرے پر اسے بھی پیار نہیں آیا تھا مین وہ اسے دوسرے نظریے سے دیکھتی تھی یہ لڑکی کس قدر خوفناک ہوتی جا رہی ہے۔ شکیلہ کے مشاغل واقعی حد درجہ خوفناک ہو گئے تھے۔“

دہشت ناک فلمیں دیکھنا اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ راتوں کو جاگتی رہتی تھی نجانے کیا کیا سوچیں اس کے ذہن میں تھیں بہر حال شاہینہ اس کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکتی تھی شکیلہ کے ملنے جلنے والے بھی بہت کم تھے۔ ایک بار کسی شناسا کی عیادت کے لئے ہسپتال گئی تھی۔ وہاں ایک نرس اسے بہت پسند آئی تھی نادیا تھا اس کا نام۔ بہت ہی بھدے نقوش کی مالک نجانے کیوں وہ شکیلہ سے بڑی اپنائیت اور محبت کے ساتھ پیش آئی تھی اور شکیلہ نے اسے دوستی کی پیشکش کر دی تھی۔

نادیا اکثر شکیلہ کے ہاں آتی جاتی رہتی تھی۔ وہ خود ایک سرکاری ہسپتال کے ایک کوارٹر میں تنہا رہتی تھی شاید اس کا دنیا میں کوئی نہیں تھا بہر حال نادیا کے علاوہ شکیلہ کی اور کوئی گہری دوست نہیں تھی کئی بار شکیلہ نادیا کے کوارٹر میں بھی گئی تھی اور نادیا نے اس کی خوب خاطر مدارت کی تھی بہر حال شکیلہ جیتی رہی۔

وقت خود بخود کچھ نہ کچھ ایسے واقعات پیدا کرتا رہتا ہے جس سے کسی بھی انسان کی کہانی میں تبدیلی رونما ہو جاتی ہے شاہینہ ایک دن کسی جزل سنور سے نکل رہی تھی کہ اس نے ہمایوں کو دیکھا۔ ہمایوں کی شخصیت کچھ اور نکھر آئی تھی گو اس کی عمر کافی ہو گئی تھی کنپٹیوں کے بال سفید ہو گئے تھے اور جسم کسی قدر بھاری ہو گیا تھا دونوں نے ایک دوسرے کو پہچان لیا شاہینہ نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔ ”آپ ہمایوں ہیں ناں؟“

”کہنے میں کیا حرج ہے ہمایوں بہت بڑی شخصیت کا مالک تھا پتہ نہیں میرے والدین کو یہ نام کیوں پسند آیا؟“ یہ ہمایوں کا مخصوص تنگی کا نام تھا۔

شاہینہ اس سے مل کر بہت خوش ہوئی، کہنے لگی۔ ”آؤ اگر مصروف نہ ہو تو کسی ہوٹل میں بیٹھ کر چائے پیئیں گے۔“

شاہینہ کی عمر کم تو نہیں تھی لیکن اس کا حسن اب بھی بے مثال تھا۔ وہ اپنے آپ پر بہت توجہ دیتی تھی حالانکہ قادر بیگ کی موت کے بعد ذریعہ آمدنی بالکل ختم ہو گیا تھا۔ قادر بیگ کی

والدہ بھی اس دنیا میں نہیں رہی تھیں۔ گھر کے معاملات بھی بس کسی نہ کسی طرح چل رہے تھے البتہ قادر بیگ نے اچھے خاصے اثاثے جمع کر رکھے تھے جو رفتہ رفتہ خرچ ہوتے جا رہے تھے۔ مکان اپنا تھا ابھی تک شاہینہ کو ایسی کوئی مشکل پیش نہیں آئی تھی جس سے اس کی صحت پر اثر پڑتا بہر حال ہمایوں اس کے ساتھ ہوٹل میں جا بیٹھا شاہینہ نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ ”کہاں رہتے ہو ہمایوں؟“

”یہیں تھا اور وقت سے لڑ رہا تھا۔“

”اچھا..... یہ لڑائی کیوں؟“ شاہینہ نے پوچھا۔

”بس شاہینہ یہ زندگی واقعات کا مجموعہ ہے تم نے شادی کر لی اپنا گھر بسا لیا میں بھی اپنے مستقبل کی تلاش میں سرگرداں رہا۔ بہر حال جسے تقدیر کہتے ہیں نا بڑی ظالم چیز ہوتی ہے مجھے میری پسند کی زندگی نہیں ملی، شادی ہو گئی بیوی سے کوئی اولاد نہیں ہوئی ایک عام سی خاتون تھیں زندگی وفا نہ کر سکی اور کوئی چار سال پہلے وہ اس دنیا سے چلی گئیں۔ والدین ساتھ چھوڑ گئے بہر حال جی رہا ہوں۔“

”تہا۔“ شاہینہ نے غیر متوقع سوال کیا۔

ہمایوں چونک کر اسے دیکھنے لگا پھر بولا۔

”ہاں تہا۔“

”کیوں؟“ شاہینہ نے پھر حملہ کیا اور ہمایوں کے ہونٹوں پر ایک پھینکی سی مسکراہٹ پھیل گئی اس نے کہا۔ ”عجیب سوال کر رہی ہو میں نے بتایا نا کہ اب دنیا میں کوئی نہیں رہا میرا اس لئے تہا ہوں۔“

”نہیں میرا مطلب ہے زندگی تہا تو نہیں گزرتی کچھ نہ کچھ کرنا ہوتا ہے انسان کو اپنے لئے ابھی کون سی عمر زیادہ ہو گئی ہے بلکہ میں تو کہتی ہوں کہ تمہاری شخصیت پہلے سے کہیں زیادہ نکھر گئی ہے بھاری بھر کم ہو گئے ہو دوسری شادی کیوں نہیں کی؟“

ہمایوں پھر ہنس پڑا اور بولا۔ ”سکول ماسٹر کی طرح سوالات کر رہی ہو؟“

”ہمدردی بھی رکھتی ہوں اور اگر ماضی میں چلے جاؤ تو انیسیت بھی تھی ہمارے درمیان، بے شک زبان نہیں کھلی ہماری ایک دوسرے کے سامنے لیکن میں سمجھتی ہوں کہ تم بھی مجھے ناپسند تو

نہیں کرتے تھے۔“

ہمایوں نے نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا اور بولا ”غلط جملہ ہے ناپسند کی بات تو تصور میں بھی نہیں آتی اب جب تم نے اتنی زبان کھولی ہے تو میں تم سے کہوں کہ میں تو تم سے محبت کرتا تھا لیکن.....“

”نہیں..... میرا تصور نہیں تھا بس یوں سمجھ لو کہ ہم معاشرے کی قدروں کا شکار ہو گئے والدین نے میری مرضی کے خلاف میری شادی کر دی اور میں فلمی قسم کی لڑکی نہیں تھی کہ بغاوت کر دیتی حالانکہ کرنا چاہتی تھی تقدیر پر انحصار کر لیا اور سچی بات یہ ہے کہ میرے سینے میں دل کی جگہ صبر سما گیا اور آخر کار یہ صبر رنگ لایا اور قدرت نے میری جان میری ناپسندیدہ شخصیت سے چھڑا دی۔“

”کیا؟“ ہمایوں چونک پڑا۔

”ہاں قادر بیگ ایک حادثے کا شکار ہو گئے ٹریفک کے ایک حادثے میں ان کا انتقال ہو گیا۔“

”اوہ بہت افسوس ہوا۔“

”کیوں فضول قسم کے جملے بولتے ہو، بھلا تمہیں کیوں افسوس ہو گا جب مجھے افسوس نہیں ہے۔“

ہمایوں نے نگاہیں اٹھا کر سامنے بیٹھی ہوئی عورت کو دیکھا۔ پتہ نہیں کتنی عمر ہے اس کی لیکن کس قدر دلکش ہے اگر تھوڑا سا تصور میں واپس چلا جائے تو کالج کی حسین ترین لڑکی نگاہوں کے سامنے آ جاتی تھی۔

شاہینہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”تمہاری آنکھوں میں اس وقت بھی میرے لئے پسندیدگی ہے؟“

”ہاں ہے۔ اعتراف کرتا ہوں۔“

”اور اب ہمارے ارد گرد کوئی آہنی دیوار نہیں ہے آزاد ہیں ہم دونوں۔ مجھ سے شادی کرو گے؟“

کچھ لمحوں کے لئے تو ہمایوں سنائے میں رہ گیا پھر بے اختیار مسکرا پڑا اور بولا۔ ”ہاں۔“

ہوٹل سے اٹھے تو دنیا ہی بدل چکی تھی۔ ہمایوں تو اسے اپنے بارے میں بتا چکا تھا شاہینہ نے اپنے گھر اپنے حالات اور شکلیہ کے بارے میں بتایا۔ ہمایوں کو ساتھ لے کر اپنے گھر گئی۔ شکلیہ موجود نہیں تھی۔ ہمایوں نے کہا۔ ”بیٹی تو بڑی ہو گئی ہوگی؟“

”جوان ہے۔“ ابھی اتنی ہی گفتگو ہوئی تھی کہ شکلیہ اندر داخل ہو گئی اور ہمایوں کو دیکھ کر ٹھنک گئی۔

”سوری می آپ کے مہمان آئے ہوئے ہیں۔“

”ہاں..... ہمیں گفتگو کا موقع دو۔“ شاہینہ نے رکھائی سے کہا اور شکلیہ واپس چلی گئی۔

”یہ..... یہ کیا کہہ رہی تھی تمہیں می.....؟“

”ہاں یہ میری بیٹی ہے۔“

”کیا؟“ ہمایوں اچھل پڑا۔ شکلیہ دروازے کے باہر سے ان دونوں کی گفتگو سن رہی تھی۔

شاہینہ نے کہا۔ ”کیوں؟“

”مم..... معاف کرنا کیا یہ واقعی تمہاری بیٹی ہے؟“

”ہاں تقدیر کا ایک اور مذاق۔ تم نے قادر بیگ کو نہیں دیکھا تھا؟ تم تو ہماری شادی میں شریک ہوئے تھے۔“

”وہ تو ٹھیک ہے لیکن تمہاری بیٹی.....؟“

”باپ پر گئی ہے۔“

”واقعی تمہیں تو بڑی ذہنی اذیت سے گزرنا ہوتا ہوگا شاہینہ۔ یہ بات میں جانتا ہوں کہ تم حسن پرست ہو اور ہر خوبصورت چیز تمہیں پسند ہوتی ہے۔ اس بیٹی کے ساتھ معاف کرنا اولاد الگ چیز ہوتی ہے۔“

”نہیں..... مجھے اس بیٹی سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ میں نے اس کی پیدائش کے بعد جب اس کا چہرہ دیکھا اس وقت سے آج تک میری بھرپور نگاہ اس کے چہرے پر نہیں پڑی۔ میں نے اسے ایک لمحہ کبھی اپنے سے قریب نہیں کیا۔ چمٹا کر سنانے کی بات تو بالکل مختلف ہے۔“

اور باہر کھڑی شکلیہ نے کہا۔ ”ہاں..... ماں کے نام پر ایک بدنما داغ حقیقت یہ ہے کہ تم نے مجھے اپنی قربت کا ایک لمحہ بھی نہیں دیا کاش میں تمہیں اس کی سزا دے سکتی۔“

شاہینہ نے ہمایوں سے شادی کر لی۔ شکلیہ کو بہت افسوس ہوا تھا ماں اس منزل میں تھی کہ جوان بیٹی کے بارے میں غور کرتی لیکن جوان بیٹی تو پیدائش کے پہلے دن کے بعد سے اس کی نفرت کا شکار تھی۔ شکلیہ کی جذباتی کیفیت بگڑتی چلی گئی۔ ادھر شاہینہ ہمایوں کے درمیان الگ ہی کچھڑی پک رہی تھی۔ ہمایوں نے کہا میرے چار دوست کینیڈا پہنچ چکے ہیں اور زبردست فرمائشیں کر رہے ہیں کہ میں بھی کینیڈا آ جاؤں میرے لئے ایک بہترین زندگی تیار ہے شاہینہ یقین کرو زندگی میں بیشتر دفعہ ملک سے باہر جانے کے بارے میں سوچتا رہا ہوں لیکن بس وقت اور حالات نے اجازت نہیں دی۔

”میں تمہاری یہ خوشی پوری کروں گی۔“ شاہینہ نے کہا۔

ہمایوں چونک کر اسے دیکھنے لگا۔ ”کیسے؟“

”ہم کینیڈا چلیں گے کیا تمہارے دوست تمہیں وہاں بلانے کی تیاریاں کر سکتے ہیں۔“

”سب کچھ کر سکتے ہیں لیکن بس مالی وسائل.....“

”یہ مکان میرے نام ہے۔ قادر بیگ نے یہی ایک کام قاعدے کا کیا تھا؟“

”تو پھر.....؟“

”مکان بیچ دیتے ہیں اور چلتے ہیں۔“

اس بات پر خود ہمایوں بھی حیران رہ گیا تھا کہ شاہینہ نے شکلیہ کے بارے میں کچھ نہیں سوچا تھا اس نے شکلیہ سے کہا۔ ”ہم لوگ کینیڈا جا رہے ہیں۔ دس دن کے اندر یہ مکان ہمیں خالی کرنا ہوگا بہتر ہوگا کہ تم اپنے لئے کوئی بندوبست کر لو۔“

”می آپ مجھے نہیں لے جائیں گی۔“

”زندگی میں پہلی بار تو سکون سے جینے کا موقع مل رہا ہے تمہارا منحوس وجود میری آنکھوں سے اوجھل ہو جائے یہ تو میری کب کی خواہش تھی اور تم کہہ رہی ہو کہ میں تمہیں ساتھ نہیں لے جاؤں گی میرا دماغ خراب ہوا ہے کیا؟“

”تب، تب پھر میں کہاں رہوں گی؟“

”گلیوں میں چھوڑیوں میں جہاں تم جیسی بد صورت لڑکیاں رہتی ہیں۔“ شاہینہ نے ناک سکوڑ کر کہا اور شکیلہ اسے دیکھتی رہ گئی۔

اس نے ایک لفظ نہیں کہا تھا۔ ہمایوں کے دوستوں نے سارے انتظامات کر لئے مکان بک چکا تھا مکان کا قبضہ خریدار کو دے دیا گیا۔

شاہینہ نے واقعی ایک روایت قائم کی تھی نفرت کی۔ اس نے گھر چھوڑتے ہوئے شکیلہ کو گلے تک نہیں لگایا اور شکیلہ اسے ہمایوں کے ساتھ جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ پھر اس نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا۔ وہ لوگ اپنا سامان گھر میں منتقل کر رہے تھے جنہوں نے یہ گھر خریدا تھا۔ بہر حال تھوڑی دیر کے بعد وہ باہر نکل آئی اور اس کے بعد بہت دیر تک بھٹکتی رہی پھر اسے نادیہ کا خیال آیا اور وہ ہسپتال چل پڑی۔ نادیہ کی ڈیوٹی کے اوقات اسے معلوم تھے اس وقت نادیہ اسے گھر پر ہی ملی۔ کھانا پکا رہی تھی اسے دیکھ کر خوش ہو گئی۔

”یقین کرو شکیلہ، ان دنوں میں تمہارے لئے بڑی پریشان تھی۔ مئی کا کیا حال ہے تم نے بتایا تھا کہ وہ کینیڈا جا رہی ہیں۔“

”چلی گئیں۔“ شکیلہ نے ایک پلنگ پر بیٹھ کر گہری سانسیں لیتے ہوئے کہا۔

”چچ..... چلی گئیں..... کینیڈا؟“

”ہاں مکان بیچ دیا دوسرے لوگ وہاں آ گئے اگر وہ کینیڈا نہیں پہنچی ہیں تو یہاں کسی ہوٹل میں مقیم ہوں گی اور ایک آدھ دن کے بعد چلی جائیں گی۔“

”تمہیں انہوں نے بالکل نہیں پوچھا؟“

”یہ باتیں کرید کر کیا تم میرے زخموں پر نمک لگانا چاہتی ہو؟“ شکیلہ نے کہا۔

نادیہ افسوس بھرے انداز میں سر جھکا کر بیٹھ گئی۔ ”یار کمال ہے، کمال ہے واقعی۔“

”کوئی کمال نہیں ہے۔ زمانہ قدیم میں تم نے کبھی سنا کہ کسی ماں نے اپنے بچوں کو نہر

میں پھینک دیا ہو۔ کوئی عمر رسیدہ عورت اپنے آشنا کے ساتھ فرار ہو گئی ہو۔ ماضی میں یہ نہیں ہوتا تھا۔ اب ہونے لگا ہے اس لئے تعجب کی کوئی بات نہیں ہے۔ البتہ تم سے ایک بات پوچھنا چاہتی

ہوں۔“

”ہاں پوچھو؟“

”کچھ وقت کے لیے جب تک میں اپنا کوئی ٹھکانہ نہیں تلاش کر لیتی.....“

نادیہ نے اس کی بات کاٹ دی اور بولی۔ ”میں تمہیں اپنے گھر میں پناہ دے سکتی ہوں یا نہیں؟ یا تم مجھے ایک بات بتاؤ کیا میری محبت میں کہیں کمی رہ گئی ہے جو تم نے یہ بات سوال کے انداز میں مجھ سے پوچھی۔ تمہیں یہیں آنا چاہیے تھا۔“

”صحیح جگہ پہنچی ہو۔ یہ گھر نہ ہوتا اور مجھے تمہارے ساتھ فٹ پاتھ پر بھی زندگی گزارنی پڑتی شکیلہ تو میں بڑی خوشی سے وہ زندگی گزارتی تم یہاں ہو اور میں تمہاری مہمان ہوں سب ٹھیک ہو جائے گا ہم ایک ساتھ رہیں گے اس سے زیادہ خوشی کی بات اور کوئی نہیں ہے کیا سمجھیں؟“

شکیلہ گردن ہلا کر خاموش ہو گئی تھی۔ نادیہ اس مختصر کوارٹر میں تنہا رہتی تھی لیکن بالکل تنہا بھی نہیں تھی کیونکہ اس کے ساتھ ہی اس نے شکیلہ کا تعارف اپنی بلی سے کرایا۔ انتہائی خوبصورت، سفید سیاہ اور براؤن رنگوں سے بچی ہوئی دم پر ایک بالوں کا گچھا، بہت ہی حسین بلی تھی۔

نادیہ نے پیار سے اس پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ”بس پہلے ہم دو تھے اب تین ہو گئے ماؤچی بہت محبت کرنے والی بلی ہے سچ یہ جس قدر خوبصورت ہے اتنا ہی خوبصورت اس کا دل ہے کتنی محبت کرے گی یہ تم سے تم دیکھنا.....“

اور نادیہ کے ان الفاظ پر نجانے کیوں شکیلہ کو ایک عجیب سا احساس ہوا۔ اس نے بلی کو غور سے دیکھا۔ واقعی خوبصورت تھی۔ شکیلہ کے دل میں ایک نفرت کا جذبہ ابھرا اور اس نے بلی کی جانب سے نگاہیں ہٹالیں۔ پھر نادیہ اپنی ڈیوٹی پر چلی گئی۔ شکیلہ نے واقعی اپنے ہی گھر کی طرح یہاں کھانے پینے کی تیاریاں کیں۔ گھر کی صفائی بھی کی اور پھر وہ بستر پر آ کر لیٹ گئی۔ اسی وقت اسے اپنے عقب سے ایک آواز سنائی دی۔ ”میاؤں“

اس نے چونک کر پیچھے دیکھا۔ ماؤچی دم اٹھائے اس کے سرہانے کھڑی تھی جیسے اس کے پاس آنے کی اجازت مانگ رہی ہو۔

شکیلہ نے ہاتھ بڑھایا تو وہ اچھل کر اس کے سینے پر آ بیٹھی شکیلہ اسے دیکھتی رہی اور پھر اس کی آنکھوں میں خون کی سرخی لہرانے لگی۔ اسے ایک دم احساس ہوا کہ بلی اس سے زیادہ

”ارے نہیں بابا! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ اچھا جناب کیا کھلوا رہی ہیں رات کو۔ میں تو عام طور سے کینٹین سے کھانا منگوا لیتی ہوں کبھی دل چاہا تو خود پکا لیا۔ کل دل دیکھیں گے آج تو کینٹین سے ہی کھانا منگوا لیتے ہیں حالانکہ وہ اچھا نہیں ہوتا۔“

شکیلہ نے کوئی مشورہ نہیں دیا تھا۔ رات کا کھانا کھاتے ہوئے بلی کا ذکر نکل آیا تو نادیہ نے کہا۔

”ماؤچی نظر نہیں آ رہی، تلاش عشق میں نکلے ہوگی، ویسے تو گھر سے بہت کم جاتی ہے لیکن جب رومان سوار ہوتا ہے تو محترمہ کئی کئی دن کے لیے غائب ہو جاتی ہیں۔ ان بلیوں کا کردار بہت خراب ہوتا ہے۔“

شکیلہ بمشکل تمام مسکرائی تھی۔ بہر حال نادیہ نے کسی تشویش کا اظہار نہیں کیا۔ اس کے بعد کے پانچ روز پر سکون گزر گئے۔ اس دوران شکیلہ کو ارٹھر سے باہر نہیں نکلی تھی۔ پانچویں دن نادیہ نے کہا۔ ”بور نہیں ہو رہی ہیں؟“

”کیوں؟“

”نہیں میرا مطلب ہے گھر میں بیٹھے بیٹھے.....“

”ابھی تو بور نہیں ہوئی؟“

”مئی کے بارے میں کچھ معلوم ہوا کینیڈا چلی گئیں یا ابھی یہیں ہیں۔“

پہلی بات تو یہ کہ گھر میں بیٹھے بیٹھے کیسے معلوم ہوتا، دوسری بات یہ کہ مئی کا باب ختم ہو چکا ہے۔ ایک رشتہ تھا۔ ضرور بہت سے رشتے ختم ہو جاتے ہیں اور پھر ایسے رشتے جن سے کوئی دلی لگاؤ نہ ہو۔“

نادیہ خاموش ہو گئی اسے گھر میں شکیلہ کے مشاغل کے بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا البتہ وہ اس بات کا اعتراف ضرور کرتی تھی کہ شکیلہ نے گھر کی اس قدر صفائی کی ہے کہ اب تو کیڑے مکوڑے بھی نظر نہیں آتے جبکہ پہلے ان کی تعداد کافی بڑھ گئی تھی نادیہ کو معلوم نہیں تھا کہ کیڑے مکوڑوں کے ساتھ یہاں کیا سلوک ہوا ہے۔ شکیلہ کا دلچسپ مشغلہ تھا کہ انگیٹھی میں کون سے دھکا کر ڈال دیا کرتی تھی اور جہاں بھی اسے کوئی کیڑا مکوڑا چلتا ہوا نظر آیا اس نے چپٹے سے پکڑ کر اسے آگ میں ڈال دیا کیڑا چھوٹا ہوتا تو بس اس کے سلگنے کا ایک منظر ابھرتا اور اس کے بعد مٹے

خوبصورت ہے۔ اس نے ماؤچی کو آہستہ سے گود سے نیچے اتار دیا۔ اس پر ایک عجیب سا سحر طاری تھا۔ وہ باہر نکلی تو بلی اس کے پیچھے پیچھے چلی آئی۔ شکیلہ نے باورچی خانے سے تیز چھری اٹھائی اور ماؤچی کی جانب دیکھنے لگی جو دونوں پاؤں آگے کیے انگڑائی لے رہی تھی۔

پھر شکیلہ اچانک سے اس پر ٹوٹ پڑی۔ اس نے ماؤچی کو گردن سے پکڑا۔ اس کے پچھلے پاؤں پیر کے نیچے دبائے منہ اوپر کیا اور دانت کچکا کر اس کی گردن پر چھری پھیر دی۔

ماؤچی کے حلق سے بھیانک آوازیں نکلیں اور ایک لمحے میں اس نے دم توڑ دیا۔ شکیلہ اسے نفرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہی تھی بلی اس کے سامنے پڑی ہوئی تھی اس نے دانتوں پر دانت جما کر ادھر ادھر دیکھا۔ پھر چھری کو دیکھا اور اس کے بعد آنکھیں بند کر کے ایک جھرجھری سی لی۔

چھری اس نے اندر لے جا کر خوب دھوئی اور صاف کر کے اسے ایک طرف رکھ دیا پھر وہ اندر آ گئی ادھر ادھر کوئی ایسی چیز تلاش کرنے لگی جس میں بلی کی لاش کو چھپا کر پھینکا جاسکے۔ آٹے کے ایک خالی تھیلے پر اس کی نگاہ پڑی۔ یہ پلاسٹک کا بنا ہوا تھا۔ یہ تھیلا اس کے لیے انتہائی کارآمد تھا۔ وہ بلی کے قریب آئی اور اس کا مردہ بدن تھیلے میں ڈال کر اس کا منہ باندھ دیا پھر اسے ایک طرف رکھ کر اس نے اس خون کو صاف کیا جو باورچی خانے کے باہر جمع ہو گیا پھر وہ بلی کی لاش اٹھا کر کوارٹر سے باہر نکل آئی۔

اس نے تھوڑے فاصلے پر کوڑے کا ڈرم دیکھا۔ وہ پُر اطمینان انداز میں چلتی ہوئی آگے بڑھی اور بلی کو کوڑے کے ڈرم میں اچھال دیا۔ پھر وہ واپس آ گئی نجانے کیوں اسے ایک عجیب سے سکون کا احساس ہوا تھا۔ بستر پر لیٹ کر اس کے منہ سے آواز نکلی۔ ”خوبصورت“ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور اسے نیند آ گئی۔

جاگی اس وقت تھی جب نادیہ نے اس کے سینے پر ہاتھ رکھ کر اس کی پیشانی چومی تھی۔ اس نے آنکھیں کھول کر نادیہ کو دیکھا تو نادیہ مسکرا کر بولی۔ ”خوب محنت کی ہے گھر کو چکا کر رکھ دیا نہیں جناب اب اتنا بھی نہیں کہ مجھے شرمندگی ہونے لگے۔“

شکیلہ کو اپنا موڈ بے حد خوشگوار محسوس ہوا اور وہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور بولی۔ ”اس کا مطلب ہے کہ تم نے مجھے میزبان اور اپنے آپ کو مہمان غلط کہا تھا۔“

پھینکا جائے۔ پھر وہ سکون سے سو گئی مزید کچھ دن گزرے ناد یہ بہت باظرف تھی اس نے احساس تک نہ ہونے دیا کہ کسی طرح شکلیہ اس پر بوجھ ہے بلکہ اس دن اس نے بڑے جھجکتے ہوئے کہا۔ ”یار آج ایک ایسی بات ہو گئی ہے جو میرے ذہن میں بُری طرح چبھ رہی ہے مگر تم سے کہتے ہوئے ڈر رہی ہوں۔“

”میرے یہاں رہنے پر کسی نے اعتراض کر دیا ہے؟“ شکلیہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔
”نہیں یار ایسی فضول بات کبھی تصور میں بھی نہ لانا۔“
”تو پھر۔“

”ڈاکٹر فیض ہمارے آفیسر انچارج ہیں۔ بہت ہی اعلیٰ شخصیت کے مالک ہمیں پانچ نرسوں کی ضرورت ہے۔ ڈاکٹر فیض اس کے لیے اشتہار بنا رہے تھے کہ میں پہنچ گئی۔ انہوں نے ڈاکٹر فوزیہ سے مشورہ کرتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر فوزیہ ان پانچ لڑکیوں کو اپائنٹ کر کے مختلف نرسوں کا اسٹنٹ بنادیا جائے اس طرح یہ ہوگا کہ ہم ان کی لمبی ٹریننگ سے بچ جائیں گے ہاں اگر تربیت یافتہ نرسیں مانگیں تو بات دوسری ہے لیکن انہیں بھی بہر حال اپنے طور پر تیار کرنا پڑے گا میں چونکہ یہ بات سن رہی تھی میں نے ڈاکٹر فوزیہ کے جانے کے بعد ڈاکٹر فیض سے کہا کہ سر میری کزن میرے ساتھ رہتی ہے میں چاہتی ہوں کہ آپ اسے نرس بنانے کی اجازت دے دیں اگر آپ مجھے اس قابل سمجھتے ہیں تو اسے میرے ساتھ اسٹنٹ کے طور پر لگا دیجئے ڈاکٹر فیض بہت مخلص انسان ہیں انہوں نے فوراً اشتہار میں سے ایک کا ہندسہ کم کر دیا اور پانچ کے بجائے چار لڑکیوں کے لیے یہ اشتہار بنادیا میں نے یہ بات کہہ تو دی لیکن مجھے یہ خوف ہے کہ تم اسے پسند کرو گی یا نہیں“

شکلیہ اچھل کر بیٹھ گئی پھر بولی ”تم کیسی باتیں کر رہی ہو میں تو خود دن رات یہ سوچ رہی تھی کہ پڑی پڑی موٹی ہو جاؤں گی شکل و صورت تو خراب ہے ہی بدن بھی خوب موٹا ہو جائے گا۔“

نادیہ خوشی سے اچھل پڑی پھر بولی ”تو تم تیار ہو“
”ابھی چلو“
”ابھی نہیں کل صبح آٹھ بجے“

مئے نقوش رہ جاتے جو خود بھی لحوں میں ختم ہو جاتے بڑے سائز کا ہوتا تو تھوڑا سا تڑپنے کی کوشش کرتا اور بس اس کے بعد خاموشی۔ کا کروچوں کو پکڑتی لکڑی کے ایک تختے پر انہیں چھوٹی چھوٹی کیلوں سے ٹھونکتی۔ یہ کیلیں اسے ایک ڈبے میں مل گئی تھیں۔ کبھی ناد یہ نے کسی ضرورت کے تحت خریدی ہوں گی۔ گھر کی صفائی کے دوران اسے وہ زنگ آلود کیلوں کا ڈبہ نظر آ گیا تھا اور یہ بھی اس کے لیے ایک مشغلہ بن گیا تھا۔ کا کروچوں کو ترتیب کے ساتھ کیلوں سے ٹھونکتی اور انہیں دیکھتی رہتی۔ وہ بیچارے اپنے پر ہلانے کے بعد ساکت ہو جاتے اور پھر انہیں بھی آگ کی نذر کر دیا جاتا۔ کوئی پرندہ اگر دیوار پر بیٹھ جائے شکلیہ اس کی تاک میں رہتی۔ کبھی کبھی یہ پرندے شکار بھی ہو جاتے تھے غرض یہ کہ یہ دلچسپ مشغلہ جاری تھا۔ پھر ایک دن ناد یہ دوپہر کو ڈیوٹی سے فارغ ہو گئی اور آ کر کہنے لگی۔ آج ہم لوگ فلم دیکھیں گے، کیا سمجھیں؟“
”دکھا دو ظاہر ہے انکار تو نہیں کر سکتی۔“
شکلیہ نے کہا اور تیار ہو گئی۔

نادیہ نے خود اس کے چہرے پر لپا پوتی کی تھی۔ شکلیہ نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ البتہ سینما ہاؤس میں بیٹھ کر شکلیہ نے مسکراتے ہوئے ایک بات کہی۔ ”ایک بڑی آسانی ہے ہم لوگوں کو۔“

”کیا؟“
”سڑکوں پر کسی مصیبت کا شکار نہیں ہوتے۔ جبکہ خوبصورت لڑکیوں کو خاصی اُلجھنوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ہمیں یہ سکون ہے کہ ہم اوباش نگاہوں سے محفوظ رہتے ہیں۔“
”ایسی بات نہیں ہے شکلیہ! تم ان بد بخت ہوس پرستوں کو نہیں جانتیں اگر ہم ان کے لیے قابل حصول ہو جائیں تو یہ ہماری بد صورتی کو بالکل نظر انداز کر دیں گے۔“

اس رات شکلیہ بڑے عجیب سے انداز میں سوچتی رہی تھی ناد یہ کے جملوں کو نہ جانے کیوں اس کے دماغ میں جگہ مل گئی تھی اور یہ جملے بار بار اس کے ذہن کو مضطرب کر رہے تھے ”اگر ہم ان کے لئے قابل حصول ہو جائیں تو وہ ہماری شکل و صورت کو بالکل نظر انداز کر دیں گے۔“ رات کے آخری پہر میں اس نے ان جملوں میں دوسرا پہلو تلاش کیا اس نے سوچا کہ قابل حصول ہو جانا ایک الگ بات ہے بالکل اس طرح جیسے اپنی پسند کا لباس پہن کر اسے اتار

اور دوسرے دن آٹھ بجے نادیا نے اسے اپنا نرس کا لباس پہنایا، تیار کیا اور ڈاکٹر فیض کے پاس لے گئی۔

ڈاکٹر فیض نے مسکراتے ہوئے اس سے صرف یہ پوچھا ”کیا نام ہے بے بی“
”شکیلہ“

”نادیا تمہاری اسٹنٹ ہمیں پسند آئی، جاؤ اسے اپنے ساتھ مصروف کر لو۔“

اچھا مشغلہ تھا مریضوں کے ساتھ بات چیت، شفقت اور ہمدردی، البتہ ایک نوجوان مریض نے اس وقت جب نادیا اس کے بازو میں انجکشن لگا رہی تھی مسکراتے ہوئے کہا ”آپ دونوں جڑواں ہیں“

نادیا نے خشک انداز میں جواب دیا ”باتیں کم کیجئے کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ آپ کے بولنے پر پابندی لگا دی جائے یہ کہہ کر وہ شکیلہ کو اشارہ کر کے آگے بڑھ گئی تھی۔“

شکیلہ نے ہنستے ہوئے کہا تھا ایک بات ہے نادیا ہم لوگوں کے لیے کافی دلچسپی فراہم کر دیتے ہیں مجھے جو ٹریننگ چارٹ دیا گیا ہے اس میں درج ہے کہ ہمارا کام خوشیاں بانٹنا ہے دکھی انسانیت کی خدمت کرنا ہے اور اسی میں انسانیت کی فلاح ہے نرس کے مقدس پیشے کے لیے صبر و تحمل بھی بڑی ضروری چیز ہوتا ہے

میں بتاؤں شکیلہ، یہ لوگ زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہو کر ہمارے پاس آتے ہیں ہمیں سسٹر کہتے ہیں اصل میں انسانوں کی مختلف اقسام ہوتی ہیں کچھ لوگ لفظوں کو بڑی اہمیت دیتے ہیں اور ان کا احترام کرتے ہیں لیکن میں نے دیکھا ہے کہ بیشتر لوگوں کو اس بات کی کوئی پروا نہیں ہوتی وہ سسٹر کہہ کر اس سے بد مذاق کرتے ہیں ہماری ٹریننگ میں یہ بات بھی شامل ہے کہ ہم لفظوں کی ساخت پر نہ جائیں اور صرف اپنے فرائض پورے کرتے رہیں۔“

”ہاں ہاں سو تو ہے“ شکیلہ نے یہ کہہ کر بات ٹال دی

اصل میں یہ نادیا کا مسئلہ نہیں تھا شکیلہ کی تو پوری زندگی اپنی بد صورتی کا شکار ہو گئی تھی کچھ بھی نہ ملتا کچھ نہ ہوتا ماں کی ممتا ہی مل جاتی تو ہر تشنگی مٹ جاتی لیکن بات وہیں سے بگڑ گئی تھی کائنات کی چھت، محبت کا غیر متنازع سا تان ماں اگر وہیں سے بے اعتمادی ملے تو پھر اعتماد کے لفظ کی لغت میں کیا ضرورت رہ جاتی ہے۔

نرس کا کام اسے بہت اچھا لگا تھا طرح طرح کے لوگ اسے مٹے مٹے حلف بیسیوں کے حامل بعض اسے اپنی درد بھری کہانیاں بھی سنانے بیٹھ جاتے تھے لیکن کچھ انکشافات بھی ہو رہے تھے سچ کہیں کھو گیا ہے جھوٹ کی حکمرانی ہے لوگ جھوٹ بول کر شرمندہ نہیں ہوتے کسی کی دل آزاری کر کے کبھی دکھی نہیں ہوتے شکیلہ اپنی فطرت بدلنے کی کوشش کر رہی تھی۔

انہیں دنوں خیال آیا تھا کہ اب جبکہ بہت کچھ تبدیل ہو گیا ہے کوئی بھی نہیں رہا ہے اس دنیا میں تو اپنے لئے جگہ بنائی جائے اپنے اندر کھولتے ہوئے لاوے کو سرد کیا جائے جو لمحوں میں بھڑک اٹھتا ہے لیکن اپنی شکل و صورت کا کیا کرتی لوگ اس کا مذاق اڑا کر بھولنے کی کوشش ناکام بنا دیتے تھے اور اس کے اندر پھر اذیت پسندی ابھرتی تھی۔

ایک دن جنرل وارڈ میں ڈیوٹی لگی تو ایک چھپھورے سے جوان آدمی نے برابر لیٹے ہوئے ایک معمر آدمی سے کہا۔ ”چچا جی ذرا دیکھئے یہ ہم افریقہ کیسے پہنچ گئے ذرا دیکھو کون آ رہا ہے؟“

بڑے میاں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر شکیلہ کو دیکھا اور بولے ”نہیں پیارے ہم تو اپنے وطن میں ہی ہیں یہ شاید افریقہ سے کچھ مال امپورٹ کیا گیا ہے۔“

قرب و جوار میں موجود دوسرے مریض بھی ہنس پڑے تھے وہ ایک لمحے تک ساکت کھڑی انہیں دیکھتی رہی اور پھر دل پر جبر کر کے اپنے فرائض سرانجام دینے لگی

کئی دن کے بعد آج پھر دل پر چوٹ پڑی تھی باقی وقت اضمحلال میں گزرا اور ڈیوٹی ختم ہونے کے بعد گھر آ کر بس لباس تبدیل کیا اور بستر پر جا پڑی ان لوگوں کی طنز آمیز باتیں اسے یاد آرہی تھیں اس روز نادیا کی رات کی ڈیوٹی تھی چنانچہ وہ کوارٹر میں تنہا تھی۔

مریضوں کے قہقہے اس کے کانوں میں برچھیوں کی طرح لگ رہے تھے بہت دیر تک تلملاتی رہی پھر اپنی جگہ سے اٹھی باورچی خانے میں جا کر وہ تیز چھری اٹھائی اور اسے اپنے لباس میں چھپا کر کوارٹر سے باہر نکل آئی پھر اس کے بعد وہ ہسپتال کے کھلے گوشوں میں کسی آوارہ روح کی مانند دیر تک گھومتی رہی اس کا پیاسا وجود کسی ایسے تنہا انسان کو تلاش کر رہا تھا جس کے ارد گرد کوئی نہ ہو لیکن لوگ بھی خوش قسمت ہی تھے

تقریباً دو گھنٹے تک کی آوارہ گردی کے باوجود اس کی خواہش پوری نہ ہوئی اور وہ ناکام

بھول جاتے ہیں کوئی نہ کوئی فقرہ کوئی نہ کوئی جملہ اس کے کانوں تک پہنچ جاتا تھا اور اس کے بعد اس کا دماغ سن ہونے لگتا تھا پھر ایک دن تو حد ہی ہو گئی کمرہ نمبر سولہ پر اس کی ڈیوٹی لگائی گئی۔ ڈیوٹی انچارج نے کہا۔ ”کمرہ نمبر سولہ میں دے کا ایک مریض ہے بیچارہ جوان آدمی ہے لیکن پھیپھڑے چھلنی ہو گئے ہیں اس کا خیال رکھنا اچھی حیثیت کا مالک ہے ڈاکٹر ریاض اس پر زیادہ توجہ دے رہے ہیں۔“

وہ ڈیوٹی پر پہنچ گئی مریض کی عمر زیادہ سے زیادہ چھتیس سال ہوگی اچھی شکل و صورت کا مالک تھا جب وہ اندر داخل ہوئی تو اس نے اس طرف دیکھا اور پھر اس طرح آنکھیں بھیج لیں جیسے کسی بہت ہی ناگوار شے کو دیکھ لیا ہو یہ کوئی نئی بات نہیں تھی ایسا اکثر ہوتا تھا مریض اسے دیکھ کر خوش ہی کب ہوتے تھے لیکن یہ مریض بہت زیادہ منہ پھٹ تھا اتفاق سے پیچھے سے نو جوان ڈاکٹر حشمت، ایک لیڈی ڈاکٹر اور ایک اسٹنٹ ڈاکٹر کے ساتھ اندر داخل ہو گیا یہ لوگ مریض کے قریب پہنچ گئے۔

”کہئے مسٹر محمود کیسی طبیعت ہے آپ کی؟“

”یار ڈاکٹر طبیعت تو جیسی بھی ہے میں آپ سے ایک سوال کرنا چاہتا ہوں۔“

”جی جی فرمائیے۔“

”دیکھو بھائی پہلی بات تو یہ ہے کہ میں شاعر ہوں اور شاعر حسن پرست ہوتا ہے جہاں تک میرے علم میں ہے اس کمرے کا کرایہ تین ہزار روپے ہے پھر ڈاکٹروں کی فیس اور دوسرے اخراجات آپ مجھے ایک بات بتائیے کیا ایک شاعر فطرت کے مریض کو اس طرح کی نرسوں کے ساتھ وقت گزارنے پر مجبور کرنا شرافت ہے؟“

”کوئی غلطی ہو گئی مس شکیلہ سے؟“

”کیا کیا کیا، کیا نام لیا آپ نے ڈاکٹر؟“

”مسٹر شکیلہ۔“

”یہ نام آپ لوگوں نے رکھا ہے یا خود انہوں نے، شکیلہ کا مطلب معلوم ہے آپ کو، یار کمال کے لوگ ہو یعنی وہ مثال صادق آتی ہے کہ آنکھوں سے اندھے نام نین سکھ، یہ سیاہ و سفید کا امتزاج یہ بھدے نقوش اور نام شکیلہ ارے باپ رے بھائی بڑی مہربانی ہوگی کسی اور

گھر واپس آ گئی چھری باورچی خانے میں رکھی کئی گلاس پانی پیا اور پھر بستر پر آ کر لیٹ گئی ایسی راتوں کو گزارنے کے لیے خواب آور دوائیں استعمال کرنی چاہئیں میں کل یہ انتظام کر لوں گی پھر نہ جانے کب تک وہ جاگتی رہی تھی اور آخر کار سو گئی لیکن دکھے دل اور ناکام حسرتوں کے ساتھ صبح کو اس نے نادیہ کے ساتھ ناشتہ کیا نادیہ اس کا چہرہ دیکھ کر بولی ”طبیعت ٹھیک ہے۔“

”ہاں ٹھیک ہوں۔“

”ڈیوٹی گیارہ بجے سے ہے نا تیاری کر لو مجھے سخت نیند آرہی ہے وہ گردن ہلا کر اپنا لباس وغیرہ استری کرنے لگی۔“

نادیہ کمرے میں جا کر سو گئی تھی استری کرتے کرتے دفعتاً ہی اس کی نگاہ نادیہ پر پڑی اور بدن میں ایک دم سناٹا سا طاری ہو گیا وہ نادیہ کی گردن کو دیکھ رہی تھی اور اس کے ذہن میں بڑے ہولناک خیالات ابھر رہے تھے استری اس نے وہیں چھوڑ دی ادھر ادھر دیکھتی رہی آنکھیں حلقوں سے باہر نکلی پڑ رہی تھیں ان میں خون کی سرخی لہرا رہی تھی اس کے پاؤں آہستہ آہستہ باورچی خانے کی جانب اٹھنے لگے اور باورچی خانے میں جا کر اس نے چھری مٹھی میں دبائی پھر بلی کی طرح آہستہ قدموں سے چلتی ہوئی وہ کمرے کے دروازے پر پہنچ گئی پھر نادیہ کے قریب نادیہ رات بھر کی جاگی ہوئی تھی گھوڑے بچ کر سو رہی تھی۔

اس نے دانت کچکا کر نادیہ کو دیکھا کہیں باہر کوئی گاڑی کسی چیز سے ٹکرائی اچھا خاصا دھماکا ہوا تھا وہ ایک دم چونک پڑی اس نے وحشت زدہ نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھا پھر واپس پلٹ پڑی جس جگہ استری رکھ کر گئی تھی وہ استری سٹینڈ کا ایک ایسا گوشہ تھا جس پر کپڑے تو نہیں پھیلے ہوئے تھے لیکن اس جگہ کپڑا منڈھا ہوا تھا یہ کپڑا سلگ رہا تھا اس نے جلدی سے آگے بڑھ کر استری اٹھائی جلتے ہوئے کپڑے کو اپنے ہاتھوں سے بجھایا ہتھیلیوں پر لگنے والی آگ اور تپش نے اسے بڑا سرور دیا اور وہ ان ہاتھوں کو بڑے لذت آمیز انداز میں مسلنے لگی۔

پھر اس نے آنکھیں بند کر کے زور سے گردن جھٹکی اور استری اٹھا کر کپڑوں پر استری کرنے لگی اس کے بعد باقی تیاریاں کیں چھری اپنی جگہ واپس رکھی اور پھر ڈیوٹی پر پہنچ گئی۔

اس کی فطرت شدید کشمکش کا شکار تھی کبھی ذہن بری طرح بھٹک جاتا اور کبھی وہ اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کرتی قصور اس کا نہیں دنیا کا تھا لوگ صبر نہیں کر پاتے اللہ کی ذات کو

اس نے انہیں آگ میں بھسم کر دیا تھا اور وہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر اس مریض کو دیکھنے لگی
جواب بھی مذاق اڑانے والی نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔
پھر اس نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے انجکشن کو دیکھا اور پھر مریض کی طرف اسے لگا جیسے
اسے شدید پیاس لگ رہی ہو اس کا ہاتھ آگے بڑھا۔

نرس کی ڈیوٹی یہاں لگا دیجئے کوئی خوش تفل نرس ہو۔
ڈاکٹر ذرا تیز مزاج کا مالک تھا اس کے چہرے پر ناخوشگوار کی لکیریں پھیل گئیں۔
”محترم! آپ کسی ایسی جگہ نہیں آئے ہیں جہاں حسن و جمال کی نمائش ہوتی ہے مر رہے
ہیں آپ، موت کو قریب دیکھ کر بھی آپ کے اندر احساس انسانیت نہیں پیدا ہوتا ہم لوگ
خوبصورت نرسیں فراہم نہیں کرتے آپ کے کٹے پھٹے وجود کا علاج کرتے ہیں اور پھر آپ سب
لوگ انہیں سسٹر کہتے ہیں بہنوں کی شکل و صورت نہیں دیکھی جاتی یہ آپ کی بہترین خدمت
کریں گی؟“

”یعنی یہ مجھ پر مسلط رہیں گی؟“
”آئیے ڈاکٹر شازیہ، آئیے“ نو جوان ڈاکٹر اپنے ساتھ لیڈی ڈاکٹر کو لے کر کمرے سے
باہر نکل گیا شکیلہ ساکت و جامد کھڑی ہوئی اس سارے منظر کو دیکھ رہی تھی پھر وہ آگے بڑھی اور
مریض کا چارٹ دیکھنے لگی اسے مریض کو انجکشن دینا تھا مریض نے کہا۔ ”آپ کے آفیسر
انچارج کا کیا نام ہے۔“

”ڈاکٹر فیض، کیا آپ ان سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔“
”مہربانی ہوگی ان سے آپ ہی کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔“
”آپ کا پیغام دے دوں گی۔“
”سنیے۔“ وہ پھر بولا۔
”جی۔“

”دوسرے مریض آپ کے بارے میں احتجاج نہیں کرتے“ شکیلہ نے کوئی جواب نہیں
دیا وہ انجکشن تیار کرنے لگی۔

”خدا را میرے قتل کا سامان نہ کیجئے یہ انجکشن بیشک آپ میرے بازو میں لگائیں گی لیکن
یہ مجھے اپنی شہ رگ پر چھری محسوس ہوگا اف تو بہ کتنی کالی ہیں آپ۔“

وہ ایک دم رکی اس کی آنکھوں میں سرخی لہرائی اور اس کے منہ سے آہستہ سے نکلا۔ ”شہ
رگ پر چھری“ اس کی آنکھوں میں خوبصورت بلی کی موت کا منظر گھوم گیا جس کی گردن پر اس
نے تیز دھار چھری پھیری تھی وہ پرندے اس کی نظروں میں گردش کرنے لگے جن کے پر نوچ کر

فلاسک کی کیپ نکالی اور مریض کے منہ پر لگا دی لیکن اس نے آکسیجن آف رکھی تھی۔

اول تو ویسے ہی مریض کے پورے وجود میں گھٹن پیدا ہو گئی تھی اوپر سے باہر کی ہوا بھی رک گئی اور اس کا چہرہ نیلا پڑنے لگا وہ شدید بے بسی محسوس کر رہا تھا نشہ آور انجکشن نے ہی اس کے پورے وجود میں قیامت دوڑا دی تھی کہ اوپر سے باہر کی آکسیجن بھی اسے ملنا بند ہو گئی نتیجہ یہ ہوا کہ اس کا سارا چہرہ نیلا پڑ گیا ہاتھ پاؤں تشنجی انداز میں پھیلنے سمٹنے لگے۔ آنکھیں پھٹ گئیں اور شکیلہ نفرت بھری نگاہوں سے اسے دیکھتی رہی۔

☆.....☆.....☆

بہت خوبصورت ہے نا تو، اب مر جاکتے کی موت، سمجھا کتے کی موت مر جا وہ دبے قدموں دروازے تک آئی دروازے میں شیشہ لگا ہوا تھا اس نے شیشے سے جھانک کر دیکھا سامنے کوریڈور تھا دور دور تک خاموشی پھیلی ہوئی تھی کبھی کسی مریض کے کمرے سے کسی چیز کے گرنے یا سرکنے کی آواز سنائی دے جاتی تھی وہ واپس آ گئی مریض کے چہرے سے اب کچھ اور ہی اظہار ہو رہا تھا، لگتا تھا وہ زندگی ہار چکا ہے۔

شکیلہ اسے سرورنگا ہوں سے دیکھنے لگی پھر اس کی نگاہیں اس کی شہ رگ پر پڑیں اس نے انگوٹھے سے وہ جگہ ملنا شروع کر دی جہاں سے انجکشن کی باریک سوئی اندر داخل ہوئی تھی اور جس نے مریض کو اس قدر اذیت دی تھی کہ وہ زندگی ہار گیا تھا وہ جگہ ہموار ہو گئی اور اب وہاں کوئی نشان نہ رہا۔ شکیلہ نے اس طرف سے مطمئن ہونے کے بعد مریض کی چادر اٹھا کر اس کی شہ رگ پر انگلی پھیرنا شروع کر دی اور شہ رگ کے اندرونی حصے میں جو کیفیت پیدا ہو گئی تھی وہ بھی ختم ہو گئی۔ پھر اس نے اس کے بازو کی آستین اوپر کر دی اس دوران آکسیجن ماسک اس نے چہرے سے نہیں ہٹایا تھا جب اسے یقین ہو گیا کہ مریض اب زندگی سے دور ہو گیا ہے تو اس نے آکسیجن ماسک چہرے سے ہٹا دی اسے برابر بستر پر رکھا اور آکسیجن آن کر دی تاکہ آکسیجن کے خرچ کا اندازہ ہو جائے حالانکہ اس کی ضرورت نہیں تھی لیکن پھر بھی اس نے ایسا ہی کیا۔ ایک حسین نرس چاہیے تھی اسے، موت سے زیادہ حسین کوئی چیز ہوتی ہے مجھے بتا، وہ دانت پیس کر مسکرائی اور پھر اس نے خونی نگاہوں سے چاروں طرف دیکھا اس کے بعد اچانک اس کے ذہن کو جھٹکا لگا اور وہ آنے والے وقت کے بارے میں سوچنے لگی۔

مزید پانچ سے دس منٹ تک انتظار کرنے کے بعد وہ دروازہ کھول کر باہر نکل آئی اور

انجکشن اسے بازو پر لگانا تھا، مریض مسکراتی نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کے تصور میں بھی نہیں تھا کہ آگے کیا ہونے والا ہے نشہ آور انجکشن تھا جو خاص طور سے دے کے مریضوں کو دیا جاتا ہے وہ پیاسی نگاہوں سے مریض کی شہ رگ کو دیکھنے لگی اس کے کانوں میں مدہم مدہم آوازیں آرہی تھیں۔

یعنی وہ مثال صادق آتی ہے کہ آنکھوں سے اندھے نام نین سکھ، یہ بھدے نقوش اور نام شکیلہ ارے باپ رے کوئی خوش شکل نرس ہو یہ انجکشن میری شہ رگ پر چھری محسوس ہوگا دوسرے لمحے اس کا ہاتھ بڑھا اور انجکشن کی سوئی مریض کی شہ رگ میں پیوست ہو گئی اس نے بڑی بے دردی سے انجکشن شہ رگ میں خالی کر دیا اس کے اثرات اسے معلوم نہیں تھے بس ایک پیاس کا عالم تھا اور وہ مریض کو دیکھ رہی تھی۔

انجکشن کی دوا خاصی تیز تھی اور اس کا طریقہ کار بھی یہ تھا کہ اسے بازو میں لگایا جاتا تھا اور بہت آہستگی کیساتھ لیکن اس وقت کچھ اور ہی ہو گیا تھا ایک لمحے کے اندر اندر مریض کے چہرے کی شگفتگی ختم ہو گئی اس کے انداز سے یوں محسوس ہونے لگا جیسے اس کا دم رُک رہا ہو۔ شکیلہ نے اسی پر بس نہ کیا، انجکشن کی سوئی شہ رگ سے باہر کھینچی اور اسے مریض کے بازو میں پیوست کر دیا۔ خالی انجکشن تھا چند لمحے وہ اسے اسی طرح دبائے رہی اور اس کے بعد اسی بے دردی سے باہر کھینچ لیا۔

مریض پر اب ہیبانی کیفیت نمایاں ہو گئی تھی اس کے زخروں سے تیز تیز آوازیں نکل رہی تھیں۔ شکیلہ نے خونخوار نگاہوں سے اسے دیکھا اور پھر اس کے پیچھے لگے ہوئے آکسیجن

اپنے دوسرے فرائض سرانجام دینے لگی لیکن اس کے دل و دماغ میں ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔ کچھ لمحوں کے بعد وہ دوبارہ اسی کمرے میں جا پہنچی مریض کے چہرے پر اب بالکل مردنی چھائی ہوئی تھی البتہ ایک خوش بختی تھی کہ اس کے چہرے کی نیلاہٹ خود بخود زائل ہو گئی تھی وہ چند لمحات سوچتی رہی پھر اس نے اس کے چہرے پر آکسیجن ماسک لگائی اور آکسیجن آن کرنے کے بعد گھبرائے ہوئے انداز میں دھڑ سے دروازہ کھول کر باہر نکلی اور ڈاکٹر زڈیوٹی روم کی جانب بڑھ گئی یہاں تک دوڑنے سے اس کا سانس پھول گیا تھا دونو جوان ڈاکٹر وہاں موجود تھے یہ ہاؤس جاب پر تھے شکلیہ کو اس طرح بدحواس دیکھ کر وہ اس کی جانب متوجہ ہو گئے ”خیریت سسٹر کیا بات ہے؟“

”چھ نمبر، چھ نمبر، چھ نمبر.....“ وہ ہانپتی ہوئی بولی اور دونوں نو جوان ڈاکٹر روم نمبر چھ کی جانب دوڑے۔ وہ برق رفتاری سے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئے۔ مریض اب پرسکون تھا۔ آکسیجن ماسک اس کے چہرے پر لگی ہوئی تھی لیکن اس کے سینے میں کسی طرح کی جنبش نہیں تھی۔ دونوں ڈاکٹر اسے تشویش بھری نگاہوں سے دیکھنے لگے۔

پھر ان میں سے ایک کے منہ سے نکلا۔

”اومائی گاڈ ہی از ایکسپائر۔“

”مگر سسٹر شکلیہ.....“

”تھوڑی دیر پہلے میں نے اسے ایسک ایز انجکشن دیا تھا۔ ڈاکٹر رفاقت نے یہ چارٹ پر لکھا تھا۔ انجکشن لگنے کے بعد دو تین منٹ تک یہ بالکل پرسکون رہے اور میں باہر نکل گئی۔ ابھی چند منٹ قبل جب میں اس خیال سے اندر آئی کہ انہیں چادر وغیرہ اوڑھا دوں تو ان کی سانس دھونکی بنی ہوئی تھی اور شدید تکلیف میں ہاتھ پاؤں پٹخ رہے تھے میں نے فوراً آکسیجن لگائی اور آپ کی طرف دوڑ گئی۔“

”خدا جانے کوئی زبردست ٹیک ہوا ہے ڈاکٹر رفاقت کو اطلاع کرو۔“

”وہ تو جا چکے ہیں انہیں گھر پر فون کر دو۔“

دوسرے نو جوان ڈاکٹر نے کہا اور اس کا ساتھی ڈاکٹر رفاقت کو فون کرنے کے لئے باہر نکل گیا پھر اس کے بعد کافی لے دے ہوتی رہی۔ ڈاکٹر رفاقت بھی آگئے اور انہوں نے ڈاکٹر

فیض کو فون کیا کیونکہ ڈاکٹر فیض کے پاس کوئی بڑی سفارش آئی تھی اس مریض کے لئے۔ ان ہنگامہ آرائیوں میں وہ سب سے پیچھے رہی۔ ابھی تو وہ اسٹنٹ نرس تھی وہ بیچاری بھلا اس سلسلے میں کیا بتا سکتی تھی، بہر حال ڈاکٹر تھوڑے سے اُلجھے ہوئے ضرور نظر آ رہے تھے لیکن کسی ایسی سازش کی جانب ان کا تصور بھی نہیں گیا تھا۔

اس کے بعد جو کچھ ہوتا رہا اس میں اس کا کوئی حصہ نہیں تھا سوائے اس کے کہ مریض کے ورثا کے سامنے اسے اپنا بیان دہرانا پڑا تھا۔ اسے اب اس لاش سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ ڈیوٹی ختم ہونے کے بعد وہ واپس کوارٹر آ گئی نادیدہ دن کی ڈیوٹی پر تھی اور جانے کے لیے تیاری کر رہی تھی۔

”ناشتہ تیار ہے سرکار عالی.....“

نادیدہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”تم نے کر لیا.....؟“

”..... میری مجال کہ آپ کے بغیر ناشتہ کر لیتی“

”یار پلیز تم ناشتہ کر لو میں سخت تھکی ہوئی ہوں اور بستر پر جانا چاہتی ہوں۔“

”او کے جاؤ آرام کرو۔“ نادیدہ رات کی ڈیوٹی کے بارے میں جانتی تھی۔

شکلیہ نے لباس بھی تبدیل نہیں کیا بس جوتے اور اسکارف اتار اور بستر میں گھس گئی پھر اسے تن بدن کا ہوش نہیں رہا تھا۔ آنکھ کھلی تو ایک بچ رہا تھا۔ بھوک کے مارے برا حال تھا۔ چہرے پر پانی کے چھینٹے مارے اور سیدھی کچن گئی۔ نادیدہ سارا انتظام کر کے گئی تھی۔ بس اسے چائے گرم کرنی پڑی تھی۔

چائے کی دو پیالی پی کر ذہن معتدل ہوا اور وہ ایک کرسی پر جا بیٹھی تب گزرے ہوئے واقعات اس کے ذہن میں گردش کرنے لگے۔ پہلا خیال اس مریض کا آیا تھا اور وہ چونک پڑی تھی۔ ”میں نے اسے قتل کر دیا میں ایک انسان کی قاتل بن گئی ہوں۔ قتل..... پولیس، پھانسی..... اس نے سوچا لیکن اسے خوف کا کوئی احساس نہیں ہوا تھا۔ یہ تو ہونا ہی چاہیے تھا۔ اسے مرنے والے کی آنکھیں یاد آئیں۔ کتنا مضحکہ تھا ان آنکھوں میں..... اس نے کہا تھا..... یہ سیاہ و سفید کا امتزاج..... یہ بھدے نقوش اور نام شکلیہ..... یہ انجکشن مجھے اپنی شہ رگ پر چھری محسوس ہوگا۔“

وہ بے اختیار مسکرا دی۔ آئیڈیا تو مجھے آپ نے ہی دیا تھا جناب کہے مزہ آیا وہ دھیرے سے بولی اور اچانک اسے ایک سرور کا سا احساس ہوا اپنا مذاق اڑانے والے کو میں نے ٹھیک سبق سکھایا۔ ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔ بالکل ٹھیک کیا ہے میں نے۔ آہ کاش! اس طرح پہلے بھی کیا جاسکتا۔ ہائے میری ماں تم میرے ہاتھ سے نکل گئیں۔ ہائے تم وہ پہلی فرد تھیں جنہوں نے مجھے میری بد صورتی کا احساس دلایا تھا۔ کاش میں ماؤچی کی طرح تمہارا بھی گلا کاٹ سکتی۔ تمہاری خوبصورت سفید گردن سے گہرا سرخ خون بہتا..... کتنا اچھا لگتا۔

”ارے تم نے ابھی تک کپڑے نہیں بدلے۔“ اسے دیکھتی ہوئی بولی، ”طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری؟“

”ہاں ٹھیک ہوں۔“

”پروفیسر ممتاز کے کمرے پر تمہاری ہی ڈیوٹی تھی نا۔“

”کون پروفیسر ممتاز.....“

”وہی جو رات کو اچانک مر گئے۔“

”ہاں، مجھے نام نہیں معلوم تھا میں نے نام پر غور ہی نہیں کیا۔“

”یار بڑی لے دے ہو رہی ہے ڈاکٹر شازیہ اور ڈاکٹر منصور کو پولیس نے باقاعدہ اپنی تحویل میں لے لیا ہے۔“

”کیوں؟“

”وہی تفتیش ہو رہی ہے کہ اچانک موت کیسے واقع ہو گئی جبکہ حالت اتنی خراب نہیں تھی۔“

”موت پر کس کا بس ہے“ وہ لاپرواہی سے بولی۔

”پوسٹ مارٹم رپورٹ کا انتظار ہے اس کے بعد دیکھو کیا ہوتا ہے۔ اصل میں پروفیسر ممتاز بڑا صاحب حیثیت آدمی تھا۔ میں ذرا کچن کا چکر لگا لوں اور تم بھوت بنی ہوئی ہو کپڑے تبدیل کر لو۔“

کچھ بھی نہیں ہوا۔ پولیس نے بس اس کا بیان بھی لیا تھا باقی تحقیق بڑوں کی تھی جس کے کیا نتائج نکلے کم از کم ان لوگوں کو نہیں معلوم ہو سکا۔ شکیلہ نے بھی سب کچھ ذہن سے نکال دیا وہ

اپنے کئے پر نادم بالکل نہیں تھی مریض آتے رہتے تھے۔ فقرے چست کرتے رہتے تھے وہ اب انہیں نظر انداز کرنے کی کوشش کرتی تھی۔ کبھی کبھی کچھ خواب اسے پریشان کر دیتے تھے۔ ان خوابوں میں دو آنکھیں، دو ہونٹ اور دو ہاتھ اسے نظر آتے تھے۔ ہاتھ اس طرح آگے بڑھتے تھے جیسے اسے اپنے قریب بلانا چاہتے ہوں۔ آنکھیں اسے اپنائیت سے دیکھتیں ان میں پیار ہوتا۔ ہونٹ مسکراتے اور اس کی آنکھ کھل جاتی۔ اس کے بعد وہ بڑی ویرانی محسوس کرتی تھی۔

یہ خواب اب اسے زیادہ ہی نظر آنے لگا تھا۔ وہ اس سے پریشان ہو گئی تھی۔ جب بھی خواب دیکھتی دوسرے دن اس کا موڈ بے حد بگڑا ہوتا تھا۔ وہ تو شکر ہے کہ اس عالم میں کسی نے اس کی بد صورتی کا مذاق نہیں اڑایا تھا ورنہ کوئی حادثہ ضرور ہو جاتا۔

ایک صبح وہ سوتے سوتے چیخ پڑی..... ”کون ہو تم..... کون ہو.....“ نادیہ جس کی آنکھ کھل گئی تھی اس کے الفاظ سن کر اُچھل پڑی۔ اس نے سہمی ہوئی نظروں سے چاروں طرف دیکھا اور پھر شکیلہ کو دیکھنے لگی۔

”کون ہے شکیلہ کوئی تھا کیا.....؟“ شکیلہ اداس نظروں سے نادیہ کو دیکھتی رہی پھر بولی ”کیا ہوا کوئی بات ہے کیا؟“

”کس سے پوچھ رہی تھیں تم..... کون ہو تم کون ہو؟“

”اوہ کیا میں نے زور سے پوچھا تھا۔“

”کوئی خواب دیکھ رہی تھیں کیا؟“

”ہاں.....!“

”کیا خواب تھا۔“

”اکثر دیکھتی ہوں اس خواب نے مجھے پریشان کر دیا ہے۔“

”مجھے نہیں سناؤ گی، کیا خواب ہے؟“ نادیہ نے پیار سے پوچھا اور وہ تصور میں کھو گئی۔

پھر بولی دو آنکھیں جو مجھے پیار سے دیکھتی ہے۔ دوسری آنکھوں سے بالکل مختلف، دو ہونٹ جو مجھے دیکھ کر مسکراتے ہیں۔ طنزیہ نہیں..... بلکہ..... بلکہ..... اور پھر دو ہاتھ جو مجھے اپنی طرف

بلا تے ہیں۔ ایسا کون ہے نادیہ..... ایسا کون ہے۔“

”کہاں ہے؟“

”یہ حسین ہے اور..... میں.....“ اس نے پرندے کو دیکھا اور اچانک اس کی آنکھوں کا رنگ بدلنے لگا۔ اس نے پرندے کی گردن گرفت میں لی اور پھر اسے دھلے کپڑے کی طرح نچوڑ دیا۔ پرندے کی کوئی آواز نہ نکلی۔ اس کی آنکھیں بے نور ہو گئی تھیں۔ پیچھے سے نادیہ کی سسکی سنائی دی۔ اس نے سسکتے ہوئے کہا۔ ”یہ سب اچھا نہیں ہے شکلیہ..... اپنے آپ کو سنبھالو، زندگی ہر حال میں جینے کے لئے ہوتی ہے۔“

اس نے پلٹ کر نادیہ کو دیکھا اس وقت اس کے چہرے پر ایک خوفناک درندگی نظر آ رہی تھی مگر نادیہ اس درندگی سے خوفزدہ نہ ہوئی اس نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔

”میں تمہارا غم جانتی ہوں میں تمہارے دکھ سے واقف ہوں شکلیہ گھائل کی حالت گھائل ہی جانتا ہے۔ شکل و صورت ہم تو نہیں بناتے پھر نجانے کیوں یہ دنیا والے خدا کو بھول کر ہم پر سنگ زنی کرتے رہتے ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے شکلیہ کہ ہم حسن کو ختم کرنے پر تل جائیں۔ یہ ہمارا کام نہیں ہے۔ مالک کائنات نے اپنی کائنات میں ہر طرف حسن ہی حسن بکھیر دیا ہے۔ کس چیز میں کیا حسن ہے ہماری اندھی آنکھیں کیا جانیں۔ لوگ رنگ اور نقوش تک ہی محدود ہیں۔ انہوں نے روشنی کو حسین اور تاریکی کو بد صورت مان لیا ہے لیکن یہ حقیقت نہیں ہے شکلیہ۔ فیصلہ کرنے کا حق ہمیں نہیں ہے۔ نہیں میری پیاری دوست میں تمہارے اس مرض کو

آگے نہیں بڑھنے دینا چاہتی۔ تم یقین کرو مجھے ماؤچی کی لاش مل گئی تھی اور وہ چھری بھی جس سے تم نے ماؤچی کی گردن کاٹی تھی۔ بہت ہی پیار تھا مجھے اپنی بلی سے مگر اس سے زیادہ پیار مجھے تم سے ہے۔ شکلیہ آج اس معصوم پرندے کے ساتھ تمہارا یہ سلوک دیکھ کر میرے ذہن میں بہت سے خوفزدہ کرنے والے خیالات آرہے ہیں لیکن میں تمہارے ذہن سے یہ نقش مٹانا چاہتی ہوں۔ میں جو ہوں تمہیں پیار کرنے والوں میں۔ مجھے تم دنیا کی حسین ترین لڑکی لگتی ہو۔ اسی ماں کی طرح میری بھی کیفیت ہے جس نے اپنے بد صورت بچے کو بادشاہ کے سامنے دنیا کا سب سے خوبصورت بچہ کہا تھا۔ ہم محروم نہیں ہم ایک دوسرے کو چاہتے ہیں۔“ نادیہ رخ بدلے کہتی رہی۔ پھر اس نے پلٹ کر شکلیہ کو دیکھا تو وہ اپنی جگہ موجود نہیں تھی۔ نادیہ نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور خاموشی سے ایک طرف مڑ گئی۔

لیکن اس کے بعد اس نے شکلیہ کے اندر ایک نمایاں تبدیلی دیکھی اور اس تبدیلی سے

”کہیں نہیں ہے۔“ نادیہ نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا اور وہ سوالیہ نظروں سے نادیہ کو دیکھنے لگی۔ ”بہت عرصہ تک میں بھی ایسے ہی خواب دیکھتی رہی ہوں۔ یہ خواب عمر کی دین ہوتے ہیں آرزوئیں ایسے بت تراشتی رہتی ہیں۔ خواہشیں تو فطرت کا حصہ ہوتی ہیں ہر دل کچھ چاہتا ہے لیکن..... سب کی تقدیر میں سب کچھ تو نہیں ہوتا آخر کار میں نے سچ سے سمجھوتہ کر لیا ہے سچائی کو سمجھ لینا ہی سکون کا باعث بنتا ہے۔ تم ابھی خوابوں میں الجھی ہوئی ہو۔“

”اس میں ہمارا کوئی قصور ہے۔“

”نہیں..... لیکن یہ جواب صرف ہم خود کو دے سکتے ہیں سمجھوتہ..... سچ سے سمجھوتہ کبھی بہت مشکل ہوتا ہے۔ ہسپتال مریض، آنسو کراہیں زندگی کو بہلانا مشکل نہیں ہوتا۔ وہ بھی یہی کر رہی تھی۔ وحشت میں کچھ کی آگئی تھی۔ پرندوں کو، حشرات الارض کو اذیتیں دے کر ہلاک کرنے کا مشغلہ کم ہو گیا تھا، ختم نہیں ہوا تھا۔ اب ہر ایک کی جان لینے کو دل نہیں چاہتا تھا۔ اس کی وجہ صرف مصروفیت تھی۔“

ڈاکٹر فیض اس کی کارکردگی سے بہت خوش تھا اور اکثر اس کی تعریفیں کرتا رہتا تھا۔ اس نے اسے ایک فرض شناس محنتی اور زیرک نرس قرار دیا تھا۔ کبھی کبھی اسے ڈبل ڈیوٹی بھی کرنی پڑتی تھی۔

ایک دن نادیہ اور وہ دونوں گھر میں تھیں۔ نادیہ کچن میں کچھ پکا رہی تھی۔ سامنے دیوار پر ایک انتہائی خوبصورت پرندہ آکر بیٹھ گیا اس کی نگاہ پرندے پر پڑی اور وہ اسے دلچسپی سے دیکھنے لگی۔

”کیا دیکھ رہی ہو شکلیہ؟“ نادیہ کی آواز ابھری۔

”ذرا باہر نکل کر دیوار پر دیکھو۔“ وہ بولی اور نادیہ نے کچن سے باہر جھانکا ”ہائے کیا حسین پرندہ ہے۔“

وہ کچھ نہ بولی، نادیہ دوبارہ اپنے کام سے لگ گئی تھی پرندہ زمین پر اتر کر صحن میں چلنے لگا۔ وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھی اور بلی کی طرح جھپٹ کر غافل پرندے کو دبوچ لیا۔ بہت سے رنگوں سے سجا نازک پرندہ اس کی گرفت میں پھڑ پھڑانے لگا۔ وہ اسے قریب سے دیکھنے لگی۔ اس کے کانوں میں نادیہ کی آواز ابھری۔ ”کیا حسین پرندہ ہے۔“

اسے بے حد خوشی ہوئی۔ نجانے کیوں اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اس دن پرندے کی موت کے بعد جو باتیں ہوئی تھیں انہوں نے شکیلہ کے دل پر اثر کیا ہے۔ اب شکیلہ ہنستی بولتی بھی تھی۔ خوش بھی رہتی تھی۔ لطیفہ گوئی بھی کرتی تھی۔ دونوں کبھی کبھی شاپنگ کے لئے باہر نکل جاتی تھیں۔

نادیہ کی کوشش یہی ہوتی تھی کہ کوئی بد بخت آنکھوں کا اندھا کوئی ایسا جملہ نہ چست کر دے کہ شکیلہ ایک بار پھر اپنے ماضی میں واپس لوٹ جائے۔ بڑی مشکل سے نادیہ نے اس کے ذہن سے یہ سب کچھ نکالا تھا اور اب شکیلہ ایک مثالی نرس بنتی جا رہی تھی۔ وہ اپنا کام اس قدر خوش اسلوبی سے کرتی تھی کہ سارے ڈاکٹر اس کی تعریفیں کیا کرتے تھے۔ وہ نہایت ذہانت سے اپنے ہر کام کو پک کر رہی تھی۔

ایک بار پھر اس کی زندگی میں تبدیلی رونما ہوئی۔ دو مجرم ہسپتال لائے گئے تھے۔ نوجوان اور خوش شکل لڑکے تھے۔ ایک انتہائی سنگین جرم میں ملوث تھے۔ انہوں نے ایک زیر تعمیر عمارت سے ایک سیاستدان پر قاتلانہ حملہ کیا تھا اور سیاستدان ہلاک ہو گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی پانچ اور افراد شدید زخمی ہو گئے تھے۔ چند گھنٹوں کے اندر اندر ان میں سے دو افراد اور ہلاک ہو گئے لیکن پولیس کو موقع پر ہی پتہ چل گیا کہ حملہ کس طرف سے ہوا ہے۔ انہیں زیر تعمیر عمارت سے نکلنے نہ دیا گیا اور ڈیڑھ گھنٹے کے سخت مقابلے کے بعد انہوں نے عمارت کی اوپری منزل سے چھلانگیں لگا دیں۔ نیچے گرے اور گرفتار ہو گئے اور بے ہوشی کے عالم میں انہیں ہسپتال لایا گیا۔ اوپر سے کودنے سے ان کی ٹانگیں متاثر ہوئی تھیں۔ اس کے علاوہ بھرا ہوا مجمع ان پر ٹوٹ پڑا تھا اور انہیں شدید زخمی کر دیا۔ اس عالم میں وہ ہسپتال لائے گئے تھے اور فوراً ہی ان کی دیکھ بھال شروع ہو گئی تھی۔

ڈاکٹر اسد کو ان لوگوں کے علاج پر لگایا گیا تھا اور ڈاکٹر اسد اس ہسپتال کی ایک مایہ ناز شخصیت تھے۔ ان دونوں کا اڑھائی گھنٹے کا آپریشن بھی کیا گیا تھا اور ان کے تمام زخموں کو دیکھ کر کارروائی کی گئی تھی۔

شکیلہ کی مستقل ڈیوٹی ان کے ساتھ تھی۔ وہ دونوں بے ہوش تھے۔ کئی بار شکیلہ کی نگاہ ان پر پڑی ان کے بارے میں جو تفصیلات معلوم ہوئی تھیں۔ وہ بڑی حیران کن تھیں۔ دونوں کو سفاک اور پیشہ ور قاتل قرار دیا گیا تھا اور پولیس کو بہت چوکس رکھا گیا تھا۔ ان کے بارے

میں خیال یہ تھا کہ ان کے ساتھی انہیں چھڑانے کی کوشش کر سکتے ہیں چنانچہ ہسپتال پر کئی پولیس موبائلیں بھی موجود تھیں بہر حال بڑے سنسنی خیز لمحات تھے۔

شکیلہ نے جب ان کے چہرے دیکھے تو اسے بڑا تعجب ہوا۔ اتنے معصوم سے نقش و نگار رکھنے والے بھی اس قدر سفاک قاتل ہو سکتے ہیں۔

بہر حال اسے اپنی ڈیوٹی سرانجام دینا تھی۔ ساری رات مصروف رہی دوسرے دن صبح دوسری نرس متعین کر دی گئی تھی لیکن ڈاکٹر اسد اس سے مطمئن نہیں ہوئے شام کو انہوں نے شکیلہ سے مسکراتے ہوئے کہا تھا سسٹر شکیلہ! میرا خیال ہے آپ کو آپ کے مزاج کی ڈیوٹی مل گئی ہے مجھے علم ہو گیا ہے کہ آپ اپنے فرائض انجام دیتے ہوئے ڈیوٹی کی طوالت کی پروا نہیں کرتیں ہمیں انہیں ہوش میں لانا ہے اور اس سلسلے میں آپ کو بھی میرے ساتھ مستقل شریک رہنا ہوگا۔

”میں حاضر ہوں سر“ شکیلہ نے خود اعتمادی سے کہا تھا۔

بہر حال ان کے علاج کا سلسلہ جاری رہا ان کا کمرہ مسلح پولیس کی نگرانی میں رہتا تھا غالباً انہیں یہاں سے کہیں اور منتقل کرنے کے بارے میں بات چیت ہوئی تھی لیکن ہسپتال کے سربراہوں نے اس سلسلے میں ذمے داری قبول کر لی تھی کہ وہ پوری نگرانی اور ہوشیاری کے ساتھ ان کا علاج کریں گے۔

دونوں نوجوان ہوش میں آ گئے تھے بعد میں شکیلہ کو ان کے نام بھی معلوم ہو گئے ان میں سے ایک کا نام محسن دوسرے کا اقبال تھا شکیلہ جب بھی انہیں دیکھتی اسے ایک بات پر یقین نہیں آتا تھا کہ یہ دونوں اس قدر سفاک قاتل ہو سکتے ہیں۔

وہ دونوں اب شکیلہ سے بات چیت کرنے لگے تھے اور اسے ”سسٹر سسٹر“ کہہ کر مخاطب کرتے تھے کوئی ایسی خاص بات نہیں ہوئی تھی البتہ ان دونوں کے ساتھ ایک خاص بات تھی جس پر ڈاکٹر ذرا الجھے ہوئے تھے ان کی ٹانگوں میں کوئی فریکچر نہیں تھا حالانکہ جتنی بلندی سے وہ کودے تھے اس سے فریکچر ہونا چاہیے تھا لیکن پتہ نہیں کوئی مہارت استعمال کی تھی انہوں نے یا پھر قدرت نے ان کی مدد کی تھی لیکن دونوں کی ٹانگیں مفلوج ہو گئی تھیں وہ اپنے پیروں کو ہلا بھی نہیں سکتے تھے انہوں نے یہی کہا تھا کہ انہیں یوں لگتا ہے جیسے ان کے پاؤں ان کے جسم سے علیحدہ ہو چکے ہیں اور ان میں زندگی کی کوئی علامت نہیں ہے ڈاکٹر اس بات کو تسلیم کرنے پر تیار

نہیں تھے۔

پولیس افسران نے بھی ان کے پیروں کی حرکات کو اسٹڈی کیا تھا اور یہی فیصلہ کیا تھا کہ یہ لوگ مکاری کر رہے ہیں ڈاکٹر اسد نے ان کی کمر اور کولہے کی ہڈیوں کے کچھ خصوصی ٹیسٹ کرائے تھے جو شبہات ڈاکٹر اسد کو تھے کہ ممکن ہے کولہے کی ہڈیاں رُخ تبدیل کر چکی ہوں جس کی وجہ سے یہ کیفیت پیدا ہو گئی ہے وہ ٹیسٹ ٹھیک تھے تمام پلیٹیں اپنی جگہ تھیں۔

سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ڈاکٹروں کے بورڈ نے آخر کار یہ فیصلہ کیا کہ حرام مغز کا ٹیسٹ لیا جائے۔ یہ ٹیسٹ بہت مشکل اور دیر سے نتیجہ پیش کرنے والا تھا۔

پولیس افسران اس دوران کئی بار یہ مطالبہ کر چکے تھے کہ مجرموں کو جلد از جلد ان کے حوالے کیا جائے۔ اس سلسلے میں میڈیکل بورڈ نے معذرت کی تھی اور کہا تھا کہ جب تک وہ انہیں اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کے قابل نہ بنادیں انہیں پولیس کے حوالے نہیں کیا جاسکتا یہ ساری باتیں اعلیٰ پیمانے کی تھیں۔

شکیلیہ کو اس سلسلے میں معلومات تھیں اور نہ اسے کچھ بتایا گیا تھا البتہ اس نے خود کتنی ہی بار ان کے پیروں کا جائزہ لیا تھا وہ بالکل نارمل حالت میں تھے۔ سرخ و سفید رنگت، خون کی بھرپور روانی سے مرصع، البتہ اسے اس وقت بڑا دکھ ہوا تھا جب پولیس والوں نے ایک افسر اعلیٰ کی موجودگی میں ان کے پیروں پر جلتی ہوئی سگریٹ سے نشانات لگائے تھے اور پھر ان پر ڈنڈے مارے تھے انہوں نے اور بھی اذیتوں کے پروگرام بنائے تھے لیکن شکیلیہ نے فوراً جا کر ایم ایس کو رپورٹ کی تھی اور ایم ایس کئی بڑے ڈاکٹروں کے ساتھ اندر آ گیا تھا۔

اس نے شدید برہمی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ پولیس افسران یہاں ایسی کوئی حرکت نہیں کر سکتے انہوں نے اس افسر اعلیٰ سے بھی شدید جھگڑا مول لیا جس کے حکم پر ان لوگوں پر ہسپتال کے کمرے میں تشدد کیا گیا تھا اس نے کہا کہ جب یہ لوگ یہاں سے فارغ ہو کر پولیس کی تحویل میں پہنچ جائیں تو پولیس بے شک انہیں زندہ جلادے لیکن یہ ہسپتال ہے ہم ان کا علاج کر رہے ہیں اس کے بعد اگر پولیس کے کسی فرد نے ان کے ساتھ ایسا وحشیانہ سلوک کیا تو وہ ہائی کورٹ میں چلے جائیں گے بہر حال خوب لے دے ہوئی البتہ اس اذیت رسانی کے نتیجے میں پولیس کو کچھ حاصل نہیں ہوا تھا۔

وہ لوگ خود اپنے جسم کے ان حصوں کے ساتھ ہونے والی وحشیانہ کارروائی کو ہمدردی کی نگاہوں سے دیکھتے رہے تھے اور جب ان سے پوچھا گیا کہ کیا انہیں اذیت کا احساس نہیں ہوا تو ان میں سے ایک نے درد بھرے لہجے میں کہا۔ ”نہیں جناب! ہمیں تو لگتا ہے جیسے یہ اب ہمارے جسم سے منسلک ہی نہیں ہیں۔“

اس رات شکیلیہ کی ڈیوٹی انہی کے ساتھ تھی۔ محسن بغور شکیلیہ کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ رات کے تقریباً تین بجے تھے لیکن شکیلیہ کی آنکھوں میں نیند کا شائبہ بھی نہیں تھا۔ وہ خاموش بیٹھی ہوئی تھی۔

باہر پولیس کے چار پانچ جوان مدہم آواز میں باتیں کر رہے تھے۔ ہسپتال کی عمارت کے باہر بھی باقاعدہ پہرہ تھا۔

محسن نے جب ایک گہری سانس لی تو شکیلیہ نے چونک کر اسے دیکھا وہ کئی بار محسوس کر چکی تھی کہ محسن اکثر اسے دیکھتا رہتا ہے۔ اس وقت محسن سے نگاہیں ملیں تو شکیلیہ مسکرا دی پھر بولی۔ ”کوئی چیز چاہیے؟“

”نہیں سسٹر“

”نیند نہیں آرہی نیند کی دوا دوں؟“

”مت دیجئے گا ورنہ دل کی بات آپ سے نہیں کہہ سکوں گا۔“

اس نے کچھ ایسے لہجے میں کہا کہ شکیلیہ چونک کر اسے دیکھنے لگی پھر بولی۔ ”دل کی بات.....“

”ہاں سسٹر انسان کسی نہ کسی سے تو کچھ کہنا چاہتا ہے بے شک مجھے یہ حق حاصل نہیں ہے کہ میں آپ سے آپ کی مرضی کے خلاف بات کروں لیکن نجانے کیوں دل چاہ رہا ہے کہ آپ سے کچھ کہوں۔“

”کہو“ شکیلیہ نے کہا اور اپنی کرسی لے کر اس کے بالکل قریب آ گئی۔

وہ کچھ لمحے خاموش رہا پھر بولا۔ ”سسٹر انسان کس عالم میں سچ بولتا ہے؟“

”میں نہیں سمجھی؟“ شکیلیہ نے کہا۔

”جب موت نزدیک ہوتی ہے جب اس کی ہر سوچ اس کا ساتھ چھوڑ دیتی ہے اور وہ دنیا

سے اپنا رشتہ ٹوٹے دیکھتا ہے پھر کوئی چیز اس کی اپنی نہیں رہتی۔“

”ہاں ایسا ہے تو سہی۔“ شکیلہ نے کہا۔

”ایسا ہی ہے سسر..... میرے دل پر کچھ سچائیاں بوجھ بنی ہوئی ہیں۔ سسر میں اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتا ہوں۔“

”میں تمہاری کیا مدد کر سکتی ہوں۔“

”بس جو کچھ میں کہنا چاہتا ہوں اسے سن لیں۔“

”ہاں کہو۔“

”سسر آپ بھی جانتی ہیں اور مجھے بھی معلوم ہے کہ ہم دونوں کے لئے اب صرف ایک ہی جگہ ہے یعنی پھانسی کا پھندا، موت ہماری شہ رگ کے قریب ہے لیکن سسر جس الزام میں ہمیں سزائے موت دی جائے گی ہم اس میں ملوث نہیں ہیں۔“

”میں کیا کہہ سکتی ہوں۔“

”آپ کچھ نہ کہیں صرف سن لیں اور ہماری موت کے بعد اگر ایک نیکی کرنا چاہیں تو صرف اتنا کر دیں کہ..... کہ“ محسن نے ایک سسکی سی لی۔

وہ ہمدردی سے بولی۔ ”ہاں آگے کہو؟“

”نوشاد کو میری کہانی سنا دیں۔“

”نوشاد.....؟“

”ہاں جواب بھی میرے خواب دیکھتی ہوگی۔“

”کون ہے وہ.....؟“ شکیلہ نے دلچسپی سے پوچھا۔

”میری منگیت، میری محبت، میرے گاؤں کی لڑکی ہے میری اس سے منگنی ہوئی تھی۔ چچا رحم داد نے مجھ سے کہا تھا کہ بیٹے..... نوشاد تمہاری ہے مگر اتنا تو کر لو کہ وہ تمہارے ساتھ سکون کی زندگی گزار سکے تمہارے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے۔ تب میں شہر، اقبال کے پاس آ گیا کچھ کرنے کے لئے۔ سسر اقبال میرا کزن ہے وہ یہیں شہر میں ٹیکسی چلاتا تھا میں نے اسی سے ڈرائیونگ سیکھنی شروع کر دی۔ میں پوری ایمانداری کے ساتھ محنت مزدوری کر کے کچھ کمانا چاہتا تھا کہ تقدیر نے ہماری موت کا سامان کر دیا۔“

”وہ کیسے؟“ شکیلہ نے پوچھا۔

”اقبال کو کچھ لوگ ملے۔ انہوں نے اسے پچیس ہزار روپے دے کر کہا کہ ہم دونوں کو ایک معمولی سا کام کرنا ہے جس کے بدلے میں ہمیں پچتر ہزار روپے اور ملیں گے۔ ایک لاکھ ہمارے لئے ایک حسین خواب کی مانند تھے۔ ہمیں یقین نہیں آتا تھا مگر پچیس ہزار ہمارے قبضے میں آچکے تھے۔ ہم نے ہزاروں خواب دیکھ ڈالے۔ اگر ہم پچاس پچاس ہزار آپس میں بانٹ لیں تو بہت کچھ ہو سکتا ہے۔ اقبال چاہتا تھا کہ وہ ایک ٹیکسی قسطوں پر لے لے اور اپنی ٹیکسی چلائے۔ پچاس ہزار روپے ادا کر کے وہ یہ کام کر سکتا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ پچاس ہزار میں چا چا رحم داد کو بھجوا دوں اور کہوں کہ میں مزید رقم کما رہا ہوں اور بہت جلد گاؤں واپس آؤں گا۔ اس طرح چا چا رحم داد کو کوئی شک نہ رہتا مگر.....“

”کام کیا تھا؟“

”بظاہر وہ واقعی ایک معمولی کام تھا انہوں نے بتایا کہ ایک بڑے آدمی کا جلوس نکلنے والا ہے۔ ہمیں ہتھیار لے کر اس کی حفاظت کرنی ہے اور بس.....“

”پھر کیا ہوا..... ہم تیار ہو گئے۔ حالانکہ ہمیں کوئی ہتھیار چلانا نہیں آتا تھا لیکن انہوں نے کہا کہ ہمیں ہتھیار چلانے کی ضرورت نہیں ہے بس انہیں پکڑے رکھنا ہے۔ یہ کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ ہمیں ایک عمارت میں پہنچا دیا جو بن رہی تھی ہم جلوس کا انتظار کرنے لگے۔ جلوس آیا اور پھر کہیں سے اس پر فائرنگ ہوئی اور افراتفری مچ گئی۔ ہمیں کچھ معلوم ہی نہ ہوسکا ہم تو اس وقت گھبرائے جب اچانک پولیس اس عمارت کو گھیرے میں لینے لگی جس میں ہم چھپے ہوئے تھے۔ ہم پر فائرنگ بھی ہونے لگی اور گھبراہٹ میں ہم نے عمارت سے چھلانگیں لگا دیں۔ مجمع ہم پر ٹوٹ پڑا..... بس.....“

محسن کی آنکھوں میں آنسو تھے کچھ دیر خاموش رہ کر اس نے کہا۔ ”ہم فریب کا شکار ہو گئے۔ ہمیں چارہ بنا کر اصل کام کیا گیا۔ بھلا ہم کیا ہماری اوقات کیا۔ ہمارے ٹھیک ہونے کا انتظار کیا جا رہا ہے۔ اس کے بعد یہ لوگ ہمیں ٹارچر سیل لے جائیں گے۔ ہم کچھ بھی کہتے رہیں کون سنے گا۔ ہماری اوقات ہی کیا ہے.....؟“

شکیلہ افسردہ ہو گئی تھی دیر تک وہ خاموش رہی پھر بولی۔ ”کاش میں تمہارے لئے کچھ کر

سلی۔“

”آپ کر سکتی ہیں سسٹر.....“ محسن کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

”مم..... میں کیا کر سکتی ہوں۔“ وہ حیرت سے بولی۔

آپ..... کر سکتی ہیں..... سس..... ٹر.....“ محسن رندھے ہوئے لہجے میں بولا۔

وہ حیرت سے اسے دیکھنے لگی پھر پریشانی سے بولی۔ ”میں ایک معمولی سی نرس ہوں سسٹر حسن میں نہیں جانتی کہ میں آپ کے لئے کیا کر سکتی ہوں۔“

”آپ کر سکتی ہیں سسٹر آپ کر سکتی ہیں۔ صرف ایک بار سسٹر صرف ایک بار میری موت کی خبر اخبار میں پڑھ کر آپ سسٹر میرے گاؤں چلی جائیے۔ میں آپ کو تفصیلی پتہ دے دوں گا۔ آپ چا چار جم داد کے گھر جا کر نوشاد سے مل لیجئے۔ اسے صرف اتنا بتادیں کہ میں اب اس دنیا میں نہیں ہوں۔ وہ اپنا گھر بسالے میرا سوگ نہ منائے۔ اسے یہ بھی بتا دیجئے سسٹر کہ..... کہ..... میں بے گناہ تھا۔ میں پورے خلوص سے پیسہ کمانے کی کوشش کر رہا تھا تا کہ اسے اپنی زندگی میں شامل کر لوں مگر..... تقدیر کچھ اور چاہتی تھی۔ بس اسے یہ بتادیں آپ کو تکلیف تو ہوگی مگر میری روح کو سکون مل جائے گا۔“

وہ سسکیاں لینے لگا اور شکلیہ کو اپنے دل کے مقام پر ایک بھیگا بھیگا سا احساس ہوا۔ جب محسن کی سسکیاں کچھ کم ہوئیں تو اس نے کہا۔ ”بس یہی چاہتے ہیں آپ مجھ سے سسٹر محسن؟“

”ہاں سسٹر..... بس یہی چاہتا ہوں۔“

”کاش..... میں تمہارے لئے کچھ اور کر سکتی کاش.....“

”آپ کا یہ احسان بھی کم نہ ہوگا سسٹر نوشاد میرے بارے میں غلط تو نہیں سوچے گی۔“

”بہت چاہتے ہو تم نوشاد کو؟“

”زندگی سے بھی زیادہ۔“

”بہت خوبصورت ہوگی وہ.....“ اس بار شکلیہ کی آواز سسکی میں تبدیل ہو گئی تھی۔

”ہاں بے حد خوبصورت، میرے گاؤں کی لڑکیاں اس کا مذاق اڑاتی ہیں، جلتی ہیں اس سے کیونکہ..... کیونکہ..... مگر میری نگاہ میں وہ دنیا کی سب سے خوبصورت لڑکی ہے۔ اصل بات نگاہ کی ہوتی ہے سسٹر، مجھے معاف کر دیں آپ کا رنگ بھی تو سانولا ہے مگر..... کیا آپ

خوبصورت نہیں ہیں آپ کے نقوش میں جو حسن ہے اندھوں کو کیا نظر آئے گا؟“

شکلیہ کے ذہن میں چھنا کا ہوا تھا۔ یہ اجنبی الفاظ تھے۔ انوکھے ناقابل یقین۔

”کیا کہا تم نے میرے نقوش میں حسن ہے۔“

”ہم دونوں آپ کے بارے میں باتیں کرتے رہتے ہیں۔ سسٹر میں تو کہہ رہا تھا کہ

کاش آپ ہماری سگی بہن ہوتیں ہمیں اتنی ہی پیاری لگتی ہیں آپ۔“ اس بار اقبال نے زبان کھولی تھی۔

وہ چونک کر اسے دیکھنے لگی، پھر بولی ”میرا مذاق اڑا رہے ہو تم دونوں؟“

”نوشاد کی قسم سسٹر ایسی بات نہیں ہے۔“ نوشاد کا رنگ آپ سے زیادہ گہرا ہے۔ اس

کے نقوش بھی آپ سے بہت ہلکے ہیں۔ لیکن بہت پیاری ہے وہ، بہت دلکش، آپ کی طرح..... آپ تحقیق کر لیں کہ وہ بالکل آپ جیسی ہے.....“ محسن والہانہ انداز سے کہہ رہا تھا اور شکلیہ کھو گئی تھی۔

دو دن اور دو راتیں ان الفاظ کے سرور میں ڈوبے گزر گئی تھیں۔ ان احساسات کو اس

نے دل میں چھپائے رکھا تھا لیکن حسن اور اقبال کے ساتھ اس کا رویہ بہت اچھا ہو گیا تھا۔ اس دن اقبال نے کہا۔

”سسٹر..... کیا آپ بتا سکتی ہیں کہ ہمیں یہاں سے جیل کب تک لے جایا جائے گا؟“

”تمہاری کچھ رپورٹوں کا انتظار ہے شاید اس کے بعد۔“

”بڑا اذیت ناک انتظار ہے سسٹر جب انسان کو یقین ہو جائے کہ اسے مرجانا ہے تب

زندگی بہت بُری لگتی ہے۔ پوری زندگی یاد آتی ہے اس کا دل چاہتا ہے کہ وہ زندہ رہے لیکن.....

سسٹر میں بھی مرنا نہیں چاہتا۔“ محسن نے کہا۔

”کاش میں تمہاری زندگی کے لئے کچھ کر سکتی۔“

”کر سکتی ہیں سسٹر مگر ہم آپ سے کیسے کہیں!“

”کوئی کسی کو مشکل میں نہیں ڈال سکتا۔“ محسن بولا۔

”کر سکتی ہوں؟“ شکلیہ نے کہا۔

”ہاں سسٹر..... آپ ہمیں یہاں سے فرار کر سکتی ہیں۔“

”فرار.....؟“

”ہاں آپ ہماری زندگی بچا سکتی ہیں۔“

”کیسے.....؟ تم تو اپنے پیروں سے کھڑے بھی نہیں ہو سکتے۔“

”ایسی بات نہیں ہے سسٹر۔“

”کیا مطلب.....؟“

”ہمارے پاؤں بالکل ٹھیک ہیں۔“

”مم..... مگر.....“ شکلیہ سخت حیران ہو گئی۔

”ان میں تو جنبش بھی نہیں ہے انہیں تو سگریٹ سے داغا گیا، ڈنڈوں سے پیٹا گیا، ساری پریشانی تو اس کی ہے کہ رپورٹیں بھی اسی سلسلے میں طلب کی گئی ہیں ورنہ کبھی کا تمہیں ہسپتال سے ڈسچارج کر دیا جاتا۔“

”ہم نے اپنے لئے بس اتنا ہی کیا ہے سسٹر..... ہم نے اذیتیں صرف اسی لئے برداشت کی ہیں کہ انہیں یقین دلادیں کہ ہم اپنے پیروں سے بھاگ نہیں سکتے۔ صرف اس امید پر ہم نے ایسا کیا ہے کہ شاید ہمیں فرار کا کوئی موقع مل جائے۔“

”آہ..... کیا واقعی.....“ شکلیہ کی آنکھیں حیرت سے پھٹی ہوئی تھیں۔

”جب موت اتنے قریب آ جائے سسٹر تو زندگی کے حصول کے لئے ہر طرح کی جدوجہد کی جاسکتی ہے۔ چاہے وہ جدوجہد ہی موت پر کیوں نہ ختم ہو؟“ محسن نے کہا۔

اس دوران شکلیہ محسن سے بہت زیادہ متاثر ہو گئی تھی۔ اس نے وہ کہہ ڈالا تھا جو کسی نے نہیں کہا تھا اور شکلیہ ان الفاظ کے سحر کو اپنے ذہن سے فراموش نہیں کر سکتی تھی۔ کوئی ایسا ہے جو اسے محبت کی نگاہ سے دیکھ سکتا ہے۔ رشتے تو بعد کی چیز ہوتے ہیں۔ رشتوں کی طلب تو ان تمام بکھیروں سے الگ چیز ہے۔ اس نے کہا تھا کہ شکلیہ بہت پیاری ہے بہت خوبصورت ہے۔ اس کی اپنی محبوبہ سے بھی زیادہ اور ان الفاظ کی ادائیگی میں کہیں کوئی مذاق یا ایسا احساس نہیں جھلکتا تھا جس سے یہ اندازہ ہو کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے اور اب اس کی یہ خواہش کہ اسے فرار کا موقع دلوادیا جائے۔

شکلیہ کے ذہن میں شدید سنسنائٹ ہو رہی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اسے بد صورتی

کا طعنہ دینے والا اس کی نفرت کا شکار بن جاتا ہے۔ کوئی اسے پیار سے سسٹر کہہ رہا ہے تو کیوں نہ اس کی مدد کے لئے اتنی ہی لگن سے کام لیا جائے جتنی لگن سے برا کہنے والے کو موت کے گھاٹ اتار دینے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ سرسراتے لہجے میں بولی، ”مگر میں کیا کر سکتی ہوں؟“

حسن نے ادھر ادھر دیکھا اور پھر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس سے پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ وہ اپنے آپ کو مفلوج ظاہر کرنے کے لیے بستر پر ہی پڑے رہتے تھے اور ان کے جسموں میں کبھی جنبش بھی نہیں دیکھی گئی تھی لیکن اس وقت حسن ایک چست و چالاک اور پھرتیلانو جوان محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ”باہر پہرہ ہوتا ہے سسٹر۔ آپ صرف اتنا کر ڈالیں کہ باہر جو سپاہی موجود ہوں انہیں چائے وغیرہ میں کوئی نشہ آور چیز دے دیجئے تاکہ وہ سب غافل ہو جائیں اور اس کے بعد ہمارے لئے دروازہ کھول دیجئے باقی کام ہم خود کر لیں گے۔“

ایک بار ہسپتال کے احاطے سے نکل جائیں تو سمجھے لیجئے کہ زندگی ہمارے قریب آ جائے گی۔“

شکلیہ پاگلوں کی طرح انہیں دیکھتی رہی اور پھر اس نے آہستہ کہا۔ ”میں تمہارے لئے یہ سب کچھ کروں گی۔ میں تمہیں زندگی کی طرف روانہ کرنے کی کوشش کروں گی مگر سنو! میں صرف باہر موجود پہرے دار سپاہیوں کو بے ہوش کر سکتی ہوں باقی کام تمہیں خود کرنا ہوگا۔“

”باقی کام ہم خود کر لیں گے سسٹر آپ یقین کیجئے آپ صرف اتنا کر دیں گی تو باقی کام ہم خود کر لیں گے۔ ہمیں اپنے اوپر اعتماد ہے۔“

”تو میں تمہیں دن اور وقت بتاؤں گی۔“

”زیادہ دیر نہ لگائیں سسٹر اگر رپورٹیں آ گئیں اور انہیں اس بات کا یقین ہو گیا کہ ہمارے پاؤں درست ہیں اور ہم چل پھر سکتے ہیں تو شاید ہمیں کچھ لمحوں کا موقع بھی نہ دیا جائے۔“

”انتہائی کوشش کروں گی اور تمہیں بتا دوں گی۔“ شکلیہ پر ایک ایک لمحہ عذاب بن کر گزر رہا تھا۔ بہت سی سوچیں دامن گیر تھیں۔ ویسے یہ ایک بہتر بات تھی کہ ان دنوں اس کی ساری رات کی ڈیوٹی ہوا کرتی تھی اور اس کی ذہانت اور فراست کی وجہ سے اسے یہاں ڈیوٹی پر لگایا گیا تھا۔ پولیس کا جو عملہ یہاں تعینات تھا اس کے افسر اعلیٰ نے خصوصی طور پر شکلیہ سے کہا تھا۔

ڈال کر کسی کو پلا دیا جائے تو وہ دو تین گھنٹے کے لئے بے ہوش ہو جاتا تھا بہر حال اس نے یہ دوا اپنی تحویل میں لے لی۔

رات کو اکثر پولیس والے چائے پیا کرتے تھے۔ یہ چائے کینٹین سے آتی تھی اور شکیلہ خود بھی کبھی کبھی اپنے لئے چائے بنا لیتی تھی۔ بہر حال آج رات اس نے اس سلسلے میں عمل کرنے کا فیصلہ کر لیا واقعی اگر رپورٹیں آگئیں تو پھر معاملہ مشکل ہو جائے گا۔ اچھا ہے محسن اور اقبال کی زندگی بچ جائے۔ کم از کم یہ دو افراد تو ایسے ہیں جن کی آنکھوں میں کبھی اس کے لئے کوئی مضحکہ خیز تاثر نہیں پیدا ہوا۔ وہ انہی تمام سوچوں میں ڈوبی ہوئی کسی کام سے اقبال اور محسن کے کمرے پر پہنچی تھی۔ دونوں سنتری سینے پر گردنیں ٹکائے گہری نیند سو رہے تھے۔ کمرے کے اندر گہری تاریکی تھی۔ پتہ نہیں نائٹ بلب فیوز ہو گیا تھا یا ان دونوں میں سے کسی نے اسے بند کر دیا تھا حالانکہ وہ بستر سے اٹھتے نہیں تھے۔ اس نے آہستہ سے دروازے کو تھوڑی سی جنبش دی اور اسی وقت اسے اندر باتیں کرنے کی آواز سنائی دی محسن کی آواز تھی۔

عورت ناقص العقل ہوتی ہے اور دنیا کی ہر عورت کی ایک کمزوری ہوتی ہے وہ یہ کہ اسے حسین کہہ دیا جائے۔ اب اس گدھی کو دیکھ لو چند جملوں نے اس کی کایا پلٹ دی ہے اور وہ ہمارے لئے سب کچھ کرنے پر تیار ہو گئی ہے۔“

”یار خدا کرے وہ کامیاب ہو جائے ہم ایک بار یہاں سے نکل جائیں۔“

”مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے محسن، چلو کمرے سے اس کالی بلانے ہمیں نکال دیا، باہر بھی تو پہرہ ہے ہمارے لئے۔“

”یار زندگی ایک چانس ہی تو ہوتی ہے اور اگر کوشش کر لی جائے تو کوئی حرج نہیں۔ بچ گئے تو ٹھیک ہے نہ بچے تو دیکھا جائے گا۔ ویسے تجھے ایک بات ماننی پڑے گی میری کہانی نے سسر شکیلہ کو بالکل ہی گدھا بنا دیا ہے۔“

”تُو ہے بھی تو فنکار۔ یار تُو نے اسے اپنی محبوبہ سے زیادہ حسین قرار دے دیا ہے۔ اب اس طویل کی بلا کو اگر کوئی حسین کہہ دے تو اس کا دماغ تو آسمان پر پہنچ ہی جائے گا سب کچھ کرنے پر آمادہ ہو جائے گی۔“

”وہ یار سچی بات یہ ہے کہ اسے دیکھ کر کراہت آتی ہے اور میں سوچتا ہوں کہ میں تو کوئی

”سسر آپ کے بارے میں ڈاکٹر فیض نے بڑے اچھے الفاظ میں مجھے بتایا ہے۔ معاشرے کے یہ ناسور قابل رحم نہیں ہوتے۔ ان دونوں نے جو کچھ کیا ہے اس سے حکومت ہل کر رہ گئی ہے۔ بہت بڑی شخصیت کو انہوں نے ختم کیا ہے۔ انہیں موت کے سوا اور کوئی سزا نہیں ملے گی۔ آپ ذرا ان کے سلسلے میں ہوشیار رہے۔ میری خصوصی ڈیوٹی یہاں لگی ہے اور میں چوبیس گھنٹے یہیں پر تعینات ہوں۔ آپ ذرا ان پہ نگاہ رکھیے کہ ان کے پیروں کو جنبش ہوتی ہے یا نہیں۔ مجھے تو اس بات کا شبہ ہے کہ انہوں نے یہ ڈھونگ رچایا ہوا ہے ورنہ کوئی بھی ڈاکٹر اس بات کی تحقیق نہیں کر پایا کہ صرف ان کے پاؤں ہی کیوں مفلوج ہو گئے ہیں باقی ہاتھ وغیرہ اور اوپری جسم تو متحرک ہے۔“

”سر آپ اطمینان رکھیے۔“ شکیلہ نے افسر سے وعدہ کیا تھا لیکن اس وقت اس کی ذہنی کیفیت ڈانواں ڈول ہو گئی تھی۔ اب تک اس نے نادیہ کو کبھی اپنے احساسات کا شریک نہیں کیا تھا حالانکہ نادیہ کے انداز سے یہ پتہ چلتا تھا کہ وہ شکیلہ کی ذہنی کیفیت سے واقف ہے۔ ماؤچی کی موت کو وہ خاموشی سے برداشت کر گئی تھی۔ اس نے صرف ایک بار شکیلہ سے کہا تھا کہ وہ اپنے آپ کو سنبھالے۔

شکیلہ نے خاموشی اختیار کر لی تھی لیکن اسے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ نادیہ اس کے بارے میں تھوڑا بہت جانتی ہے البتہ اس مریض کی موت کا نادیہ کو کوئی شبہ نہیں ہو سکا تھا۔ شکیلہ نے اسے ہوا بھی نہیں لگنے دی تھی اور اب مرحلہ آ گیا تھا شکیلہ کو کسی کا قول یاد آیا کہ راز ہستی راز ہے جب تک کوئی محرم نہ ہو۔ یہ بات بالکل صحیح ہے۔ زندگی کے بعض معاملات کو اپنے آپ تک محدود رکھنا ہی زندگی کی نشانی ہوتی ہے۔ اپنا راز کسی اور کے ہاتھ میں دے دیا تو کہا نہیں جاسکتا کہ آگے کیا ہو۔ رات کی ڈیوٹی پر کئی پولیس والے رہا کرتے تھے اور اب وہ زیادہ مستعد نہیں تھے کیونکہ جب سے یہ پتہ چلا تھا کہ مجرم اپنا جھوٹا گناہ انہوں نے تھوڑی سی غفلت برتنا شروع کر دی تھی۔ شروع میں پانچ چھ پولیس والے ہوا کرتے تھے بعد میں تین رہ گئے اور اب صرف دو ہوتے تھے جو دروازے کے دونوں طرف کرسی ڈالے بیٹھے رہا کرتے تھے۔

یہ لوگ شکیلہ سے بھی واقف تھے اور اکثر اس سے ہنسی مذاق کرتے رہتے تھے۔ شکیلہ نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ ایک ایسی دوا حاصل کی جو بے مزہ ہوتی تھی اور جسے چائے وغیرہ میں

فرضی محبوبہ بھی اس طرح کی قبول نہ کروں۔“

شکیلہ کے ذہن میں انکارے اتر رہے تھے۔ اب تو شبیہ کی بات ہی نہ رہی تھی کہ وہ لوگ اس کے بارے میں باتیں کر رہے ہیں۔ جھوٹی کہانی، کالی بلا، طویلے کی بلا، میری شکل دیکھ کر انہیں کراہت ہوتی ہے۔ آہ! بُرا کیا تم لوگوں نے اپنے ساتھ، بُرا کر ڈالا، بہت ہی بُرا کر ڈالا۔ وہ آہستہ سے وہاں سے ہٹ گئی۔

دونوں کو احساس بھی نہیں ہو سکا تھا کہ انہوں نے اپنے ساتھ کیا کر ڈالا ہے وہ بس اپنے منصوبے کی کامیابی کے منتظر تھے بد شکل نرس کو وہ بے وقوف بنا کر یہاں سے نکل جانا چاہتے تھے لیکن یہ کام اتنی جلدی ممکن ہو جائے گا انہوں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ جس وقت شکیلہ کمرے میں داخل ہوئی وہ نیم غنودگی کی کیفیت میں تھے۔ شکیلہ نے انہیں آہستہ سے جھنجھوڑا تو وہ اٹھ گئے۔

”کک..... کون.....؟“

”یہ اندھیرا تم نے کیا ہے؟“

”نہیں سسٹر، شاید نائٹ بلب فیوز ہو گیا ہے کیا آپ کچھ دیر پہلے بھی آئی تھیں؟“

”نہیں..... اب فضول باتوں سے گریز کرو، اٹھو۔“ شکیلہ نے کہا اور ان دونوں کے جسموں میں جیسے اسپرنگ لگ گئے۔

انہوں نے تاریکی میں شکیلہ کو گھورنے کی کوشش کی پھر محسن کی آواز ابھری۔

”کک..... کیا بات ہے سسٹر۔“

”باہر صرف دو پہرے دار ہیں اور میں نے انہیں بے ہوش کر دیا ہے۔“

”اوہ مائی گاڈ۔“ اقبال نے بستر سے نیچے چھلانگ لگا دی تھی۔ وہ اپنے آپ کو چست کرنے لگے۔

شکیلہ نے آہستہ سے کہا۔ ”میں زیادہ دور تک تمہارا ساتھ نہیں دے سکتی، تمہیں باہر کی لوکیشن معلوم ہے؟“

”آپ ہمیں گائیڈ کر دیں پلیز۔“

”بائیں سمت جاؤ گے یہ راہداری آگے جا کر دائیں سمت گھوم جاتی ہے۔ کمروں کی

قطاریں دور تک چلی گئی ہیں لیکن تم درمیان سے نیچے کود جاؤ گے اور پھر سیدھے دوڑتے چلے جاؤ گے۔ آگے تمہیں گیٹ بھی مل جائے گا اور اگر گیٹ سے باہر نہ جانا چاہو تو دیوار کے ساتھ ساتھ.....“

”باقی کام ہم خود کر لیں گے بہت شکریہ سسٹر بہت شکریہ۔“ محسن نے کہا اور اس کے بعد وہ بلی کی طرح دبے قدموں چلتے ہوئے دروازے تک پہنچے دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔ روشنی کمرے میں آگئی تھی۔

کمرے کے وسط میں شکیلہ پتھر کے مجسمے کی مانند کھڑی ہوئی تھی راہداریاں سنسان پڑی ہوئی تھیں۔ دور دور تک کوئی موجود نہیں تھا۔ وہ دونوں باہر نکل آئے۔ دونوں طرف بیٹھے ہوئے پولیس والوں کے سر سینوں سے نکلے ہوئے تھے۔ وہ سچ مچ بے ہوش نظر آ رہے تھے۔

محسن اور اقبال نے ایک لمحے تک سوچا اور اس کے بعد انہوں نے پولیس والوں کی رائفلیں اپنے قبضے میں کر لیں۔ رائفلیں قبضے میں آ جانے سے ان کی ہمت بڑھ گئی تھی اور اس کے بعد وہ شکیلہ کے بتائے ہوئے راستے پر چل پڑے۔

راہداری خاموشی سے طے کی گئی اور اس کے بعد وہ دائیں جانب مڑ گئے۔ تیز روشنی سے بچنے کے لئے جلد سے جلد وہ راہداری کی دیوار کو دکر نیچے پہنچ جانا چاہتے تھے تاکہ نیم تاریک ماحول میں آجائیں اور پھر انہوں نے نیچے چھلانگیں لگائیں لیکن جیسے ہی انہوں نے نیچے چھلانگیں لگائیں انہیں ایک گرجدار آواز سنائی دی۔

”خبردار! جہاں ہو وہیں ساکن ہو جاؤ ورنہ گولیوں سے چھلنی کر دیے جاؤ گے۔“

وہ ایک دم سنبھلے اور اس کے بعد انہوں نے سپاہیوں کی بندوقوں کا استعمال شروع کر دیا۔ دونوں نے ایک دوسرے سے کمر ملائی اور اس کے بعد فائرنگ کرنے لگے لیکن ان کی نگرانی کرنے والوں کی تعداد شاید کافی زیادہ تھی۔ انہیں دوسری بار وارننگ دی گئی اور تیسری بار ان پر فائر کھول دیا گیا۔ پہلے ہی ہلے میں دونوں کے جسموں میں لاتعداد خون اگلتے ہوئے سوراخ بن گئے تھے۔

رائفلیں ان کے ہاتھ سے گر گئیں اور وہ گھٹنوں کے بل بیٹھتے چلے گئے۔ پھر زندگی نے

انہیں مزید کچھ سوچنے کا موقع نہیں دیا اور انہوں نے وہیں دم توڑ دیا۔

کہیں دور کھڑی ہوئی شکیلہ آسودہ نگاہوں سے اسی طرف دیکھ رہی تھی جہاں چنگاریوں کا رقص جاری تھا۔ کچھ لمحوں کے بعد خاموشی چھا گئی اور شکیلہ کے ہونٹوں پر نفرت بھری مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس کے ہونٹوں سے مدھم آواز ابھری۔

بد بخت انسانو.....! تم نے مجھے آخری سبق بھی دے دیا۔ بھروسے کا لفظ اب متروک ہو گیا ہے۔ اسے لغت سے خارج کر دینا چاہیے۔ اگر تم اپنے عمل میں سچے ہوتے تو تمہاری زندگیاں بھی بچ جاتیں اور شاید کچھ اور لوگوں کی بھی جو مستقبل میں مجھے توہین آمیز نگاہوں سے نہ دیکھتے۔ ممکن ہے میرے دل میں وہ زخم تازہ نہ ہوتے جو خود میری ماں نے لگائے تھے۔ کائنات میں سب سے زیادہ معتبر سمجھی جانے والی ہستی نے لگائے تھے۔ صرف ایک ہستی صرف ایک ہستی مجھے وہ بھرم دے دیتی۔ جو میری زندگی بھر کی محرومیاں ختم کر دیتا۔ میرا مذاق اڑاؤ میں تمہاری زندگی چھین لوں گی۔

ہسپتال کے ماحول میں بڑی سنسنی پھیل گئی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد اس جگہ تیز روشنیوں کا بندوبست کر دیا گیا جہاں اب دونو جوان مجرموں کی لاشیں گولیوں سے چھلنی پڑی تھیں۔ پولیس کی کئی گاڑیاں آگئی تھیں۔ فوٹو گرافر لاشوں کی تصویریں بنا رہے تھے۔ اعلیٰ ترین پولیس افسر بھی وہاں پہنچ گئے تھے۔

تھوڑی سی پیچیدگی بھی پیدا ہو گئی تھی پولیس حکام اس وقت تک ان کی موت نہیں چاہتے تھے جب تک وہ ان سے معلومات نہ حاصل کر لیتے۔ بات ایک اعلیٰ شخصیت کے قتل کی تھی جس کے بہت سے شواہد ان دونوں کی موت سے ختم ہو گئے تھے۔ ہاں اس سے شکیلہ کے عمل میں کوئی فرق نہیں پڑا تھا جس نے پولیس کے اعلیٰ افسر کو حقیقت بتا کر ان دو خطرناک مجرموں کے فرار کی کوشش ناکام بنا دی تھی۔ اگر وہ فرار ہونے میں کامیاب ہو جاتے تو پولیس مصیبت میں گرفتار ہو جاتی۔

ہسپتال کے سب سے بڑے ڈاکٹر، ڈاکٹر فیض نے کہا تھا۔

”مجھے تم پر ناز ہے سسر شکیلہ۔“

☆.....☆.....☆

اس واقعے کے بعد شکیلہ کو مزید عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا ڈاکٹر فیض اسے وارڈن بنانے کے بارے میں سوچ رہا تھا یہ خبر بھی اسے نادیہ ہی نے دی تھی لیکن شکیلہ نے اس خبر پر کسی رد عمل کا اظہار نہیں کیا تو نادیہ بولی کیا تم خوش نہیں ہوئیں؟“

شکیلہ نے عجیب و غریب انداز میں نادیہ کو دیکھا تھا پھر وہ بولی۔ ”وارڈن بننے کے بعد کیا ہوگا نادیہ“

تم نرسوں کی انچارج بن جاؤ گی۔“

”اس کے بعد.....“

”حکمرانی کا اپنا ایک الگ ہی مزہ ہوتا ہے شکیلہ، تمہیں وارڈن بننے کے بعد اس بات کا احساس ہوگا۔“

”میرے احساسات سے واقف ہونے کے بعد بھی تم ایسی بات کر رہی ہو میں ایک کچلا ہوا وجود ہوں نادیہ زندگی گزارنے کے لیے اور کسی نہ کسی مشغلے کو اپنانے کے لیے میں نے یہ سب کچھ قبول کر لیا باقی مجھے نہ ترقی چاہیے اور نہ ہی حکمرانی، ساری فضول باتیں ہیں۔“

”نہیں شکیلہ، یہ باتیں فضول نہیں ہیں ہم اگر اپنی شخصیت کا ایک پہلو کھوئے ہوئے ہیں تو اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ ہم نے زندگی سے بالکل ہی ہار مان لی ہے تم مجھے دیکھو میں نے کس طرح وقت اور حالات سے سمجھوتہ کر لیا ہے شکیلہ یہ دنیا بڑی عجیب ہے اگر آج ہم چاہیں تو بہت سے لوگوں کی توجہ حاصل کر سکتے ہیں تم یقین نہیں کرو گی وہ ہمیں خوبصورت بھی کہیں گے عزت و احترام سے ہمیں بلائیں گے لیکن اس کے درپردہ ان کی ناپاک خواہشیں ہوں گی جو صرف

”وہ موت میری نگاہوں سے پوشیدہ نہیں جو اس شخص کی ہوئی تھی۔ جس کی تم تیمارداری کر رہی تھیں اور یہ دونوں لڑکے جنہیں تم نے مخبری کر کے قتل کرادیا کیا سمجھیں، ماؤ جی کی موت اس کے علاوہ بھی میں نے تمہاری اذیت رسانی کے کچھ مناظر دیکھے ہیں۔ شکلیہ میں تمہاری دوست ہوں۔ میں تمہیں بہت قیمتی سمجھتی ہوں۔ میں تمہیں کھونا نہیں چاہتی۔ اپنے ان احساسات کو ذہن کے سردخانوں میں سلا دو۔ بھول جاؤ کہ ہمارے لئے کسی مرد کی قربت بھی ضروری ہے۔ ہم خدمت گار ہیں۔ دکھی انسانیت کو ہر طرح کا سکون مہیا کرنے کے پابند، کیا سمجھیں۔“

شکلیہ بے اختیار ہنس پڑی پھر بولی۔ ”اور ان دکھی انسانوں میں ہمارا اپنا کوئی شمار نہیں ہے چھوڑو یا رکن چکروں میں پڑ گئیں میں تمہیں بتا دوں میرا دل چاہتا ہے ناد یہ میرا دل چاہتا ہے کبھی کبھی کہ میں ہر خوبصورت چیز کو فنا کر دوں حسین پھولوں کو پٹرول چھڑک کر آگ لگا دوں۔ حسین چہروں کو اس بری طرح مسخ کر دوں کہ ان میں حسن کا کوئی نشان باقی نہ رہے۔“

”آہ یہی تو میں نہیں چاہتی میری بہن یہی تو میں نہیں چاہتی اللہ نہ کرے اگر تمہیں اپنی ان کوششوں میں کوئی نقصان پہنچ گیا تو کیا ہوگا۔“

شکلیہ ہنس کر خاموش ہو گئی تھی وقت گزرتا رہا اور شکلیہ اپنی خدمات سرانجام دیتی رہی ضرورت سے زیادہ انسان دوست ضرورت سے زیادہ مستعد کسی مریض کو تکلیف سے تڑپتے دیکھ کر اس کے لیے پریشان ہو جانے والی عجب دہری شخصیت کی مالک بن چکی تھی اور اس کی ان کوششوں سے اسے جو فائدہ پہنچ رہا تھا یہ تھا کہ ہر ڈاکٹر اس کی تعریف کرتا تھا بڑے بڑے آپریشن میں بڑے بڑے سرجن اس کی معاونت طلب کر لیا کرتے تھے وہ ہسپتال کی مصروف ترین نرس بن گئی تھی اور آخر کار وہی ہوا اسے وارڈن بنا دیا گیا وہ سٹاکس نرسوں کی حکمران بن گئی جن میں ناد یہ بھی شامل تھی۔

ناد یہ نے اس کی برتری سر جھکا کر قبول کر لی تھی اور بے حد خوشی کا اظہار کیا تھا اب اس کی ڈیوٹی بھی تبدیل ہو گئی تھی چوبیس گھنٹے میں کسی بھی وقت وہ ہسپتال میں مصروف ہو سکتی تھی ڈاکٹروں نے اب بھی اس کی معاونت حاصل کر رکھی تھی پھر ایک دن جنرل وارڈ کا دورہ کرتے ہوئے ایک عمر رسیدہ شخص نے اسے پکارا۔ ”بیٹے میری بات سنو گی۔“ اسے یہ جملہ بڑا عجیب لگا تھا وہ اس شخص کے پاس پہنچ گئی جنرل وارڈ کے ایک بستر پر پڑا ہوا وہ شخص دے کا مریض

اور صرف ہمیں دھوکا دینے کے لئے ہو سکتی ہیں آپ چاہیں تو اپنے آپ کو کوڑیوں کے مول بچ سکتے ہیں کم از کم یہ احساس ہمارے دل میں ہے کہ لوگوں کی نگاہیں ہمارے لئے اس قدر پاکیزہ نہیں جس کے ہم خواہش مند ہیں کسی آنکھ میں ہمارے لئے محبت نہیں ہوتی کیونکہ ہماری شکلیں انہیں متاثر نہیں کرتیں شکلیہ میں تمہارے لئے بڑی پریشان ہوں۔ یقین کرو جتنا سوچتی ہوں ابھرتی چلی جاتی ہیں اللہ تمہیں محفوظ رکھے تمہارے یہ شدید احساس کہیں تمہیں کوئی نقصان نہ پہنچائیں۔“

”کیسا نقصان؟“ شکلیہ نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا

ناد یہ خاموش ہو گئی تھی دیر تک وہ خاموش رہی پھر بولی ”رہنے دو جو کچھ میرے دل میں ہے دل ہی میں رہے دو کیا یہ مناسب ہوگا ناد یہ کوئی ایسا خیال ہو تمہارے دل میں اور میرے بارے میں ہو میرے علم میں نہ آئے تو کیا میں مطمئن رہ سکتی ہوں۔“

ناد یہ نے پریشان نگاہوں سے اسے دیکھا پھر بولی ”ماں کا کچھ پتہ چلا، کینیڈا چلی گئیں؟“

”بہلانے کی کوشش کر رہی ہو توجہ ہٹانا چاہتی ہو میری، سوال بھی تم نے بڑی معصومیت کا کیا، مجھے بتاؤ کیا تم سے یا ہسپتال سے کبھی اتنی اوجھل ہوئی ہوں کہ تم یہ سوچو میں نے ماں کا سراغ لگانے کی کوشش کی ہے خیر تمہارے سوال کا جواب بھی دیتی ہوں میں نے یہ چپٹر ہمیشہ کے لیے کلوز کر دیا ہے مجھے یہ کہنے میں عار نہیں ہے کہ اب میں بن ماں باپ کی ہوں ماں کا تصور بھی میرے لئے کچھ نہیں رہا تم نے سوال کر لیا میں نے جواب دے دیا مجھے بتاؤ کہ تمہارے دل میں میرے لئے کیا ہے۔“

”مجھے معاف کرنا شکلیہ مجھے یوں لگتا ہے جیسے تم تنہائیوں میں اپنی شکل و صورت کے عذاب میں گرفتار رہتی ہو چلو مجھے کھلے دل سے بتاؤ کہ تم چاہتی کیا ہو، محبت کوئی ایسی چیز تو نہیں ہے کہ ہم اسے لوگوں سے چھین لیں۔“

”بات پھر موضوع سے ہٹا دی تم نے“ شکلیہ کی آواز میں غراہٹ سی پیدا ہو گئی تھی۔

”بس میں کیا بتاؤں مجھے یوں لگتا ہے جیسے کچھ ہوا تھا۔“

”کیا؟“ شکلیہ نے سوال کیا۔

تھا لھاسی کے دورے پڑتے رہتے تھے ڈاکٹروں نے اس کے چارٹ میں خاصی پیچیدہ صورت حال کی تفصیل لکھی تھی لیکن چونکہ جنرل وارڈ کا مریض تھا اور کسی کی کوئی خاص توجہ اس کی جانب نہیں تھی اس لئے ڈاکٹر بھی بس فرائض کی انجام دہی کر رہے تھے۔

مریض نے اسے بلایا تو وہ اس کے قریب پہنچ گئی اور بولی۔ ”آپ نے مجھے بیٹی کہہ کر بلایا ہے؟“

”ہاں بیٹی میری اور تمہاری عمر میں جتنا فرق ہے اس میں تمہیں سسٹر کہہ کر مخاطب کرنا مجھے عجیب سا لگا تھا اس لئے تمہیں بیٹی کہہ کر بلایا۔“

”فرمائیے، کیا خدمت کر سکتی ہوں میں آپ کی“

”بیٹی تم اس وارڈ کی انچارج ہو میں نہیں جانتا کہ مریضوں کے بارے میں تمہارے نظریات کیا ہیں لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ جو مریضوں کی خدمت کرتے ہیں وہ انہیں انسان ہی سمجھتے ہوں گے۔“

”یہ انسانوں ہی کا ہسپتال ہے جناب۔“

”انکل کہہ سکتی ہو مجھے؟“

”چلے کہہ دیتی ہوں۔“

”بیٹا! بیٹھو گی میرے پاس تھوڑی دیر، میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں یقین کرو میں انتخاب کر رہا تھا کسی ایسے شخص کا جس سے میں اپنے دل کی بات کہہ سکوں۔ کئی بار تمہیں دیکھا۔ دوسری نرسوں کو بھی دیکھا تم ان کے ساتھ میرا مطلب ہے مریضوں کے ساتھ جس اپنائیت کا سلوک کرتی ہو دوسری نرسیں اس طرح سے نہیں کرتیں فرائض تو سبھی انجام دیتے ہیں لیکن ذاتی طور پر بہت کم لوگ ہوتے ہیں جو مریضوں سے اس طرح کا سلوک کرتے ہیں اسی لئے میں نے دل میں تم پر بھروسہ کرنے کا فیصلہ کیا بیٹا کیا تم اس بات پر یقین رکھتی ہو کہ انسان کو اپنی موت کے بارے میں کچھ عرصہ پہلے سے پتہ چل جاتا ہے؟“

”آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟“

”یہی کہ اب میری زندگی مختصر رہ گئی ہے۔“

”آپ کا خیال غلط ہے آپ کا علاج ہو رہا ہے۔ ڈاکٹروں نے کہا ہے کہ آپ جلد صحت

یاب ہو جائیں گے۔“

”ڈاکٹر نے کہا ہے نا بیٹا میرا دل بھی تو مجھ سے بات کرتا ہے اور یہ اطلاع مجھے میرے دل نے دی ہے۔“

شکیلہ ہنس پڑی۔ ”چلئے آپ کا دل سے اتنا گہرا رابطہ ہے مگر میں آپ سے یہی کہوں گی کہ آپ ٹھیک ہو جائیں گے ویسے ایک بات میں کہوں آپ سے آپ کے پاس کوئی اینڈرنٹ کبھی نہیں دیکھا آپ کو کسی سے ملتے ہوئے بھی نہیں دیکھا۔“

بوڑھے نے نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا اور بولا۔ ”ہاں اتنا ہی بدنصیب ہوں میں ایک بیٹی کے سوا اس کائنات میں میرا کوئی نہیں ہے اور بیٹی بھی ملک سے باہر ہے ساؤتھ افریقہ میں ہوتی ہے میں تم سے ایک اہم بات کرنا چاہتا ہوں کچھ وقت دو گی مجھے۔“

اس نے ادھر ادھر دیکھا اور بولی ابھی نہیں، میں نو بجے کے بعد آپ کے پاس آ جاؤں گی۔ پھر تھوڑا سا وقت میں آپ کو دے سکوں گی۔“

”شکر یہ بیٹا میں انتظار کروں گا۔“

نجانے کیوں شکیلہ کے دل میں یہ خیال آیا کہ بوڑھے سے اس کے دل کی بات سن لی جائے زندگی موت کا واقعی کوئی بھروسہ نہیں ہوتا پتہ نہیں کیا کہنا چاہتا ہے۔

بہر حال وہ مقررہ وقت پر اس کے پاس پہنچ گئی جنرل وارڈ میں اس وقت تمام معاملات طے ہو چکے ہوتے تھے اور خاموشی چھا جاتی تھی بوڑھا اس کا انتظار کر رہا تھا وہ اس کے قریب جا کر بیٹھ گئی۔

”کیسی طبیعت ہے آپ کی۔“

”طبیعت تو ٹھیک ہے بیٹا میں تمہیں ایک پتہ نوٹ کرانا چاہتا ہوں یہ کاغذ اور قلم بھی میں نے حاصل کر لیا ہے“ اس نے ایک چھوٹا سا سفید کاغذ اور بال پوائنٹ اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

”یہ دونوں چیزیں آپ کے پاس کہاں سے آئیں؟“ شکیلہ نے سوال کیا۔

”ایک وارڈ بوائے کو بیس روپے دے کر حاصل کی تھیں۔“

”چلئے ٹھیک ہے کیا لکھوانا چاہتے ہیں آپ؟“

میں سے اس کا یہ پتہ بتایا اور اس نے کاغذ پر لکھ لیا۔
”جی اب بتائیے۔“

”ایک چھوٹا سا واقعہ مختصر الفاظ میں تمہیں سنانا چاہتا ہوں بیٹا میں ایک آرکیالوجسٹ ہوں اور آرکیالوجی کے ایک سرکاری محکمے میں ملازمت کرتا تھا مجھے اپنے کام سے خود بھی دلچسپی تھی اور میں اس سلسلے میں پوری محنت اور لگن کے ساتھ کام کرتا تھا جس کے نتیجے میں مجھے تھوڑی سی شہرت بھی حاصل ہو گئی تھی پھر کچھ لوگوں نے مجھ سے رابطہ قائم کیا یہ خطرناک لوگ تھے انہوں نے مجھے بتایا کہ وہ مجھ سے کچھ کام لینا چاہتے ہیں اور اس سلسلے میں مجھے بھرپور معاوضہ دیں گے میں نے ان سے بچنے کی کوشش کی تو انہوں نے مجھے خطرناک نتائج کی دھمکیاں دیں میری بیوی مرچکی تھی ایک نوجوان بیٹی تھی جسے میں نے بیرون ملک تعلیم کے لیے بھیجا ہوا تھا میں دہری کیفیت کا شکار ہو گیا عمر بھی اچھی خاصی تھی میں کسی ایسے الجھے ہوئے کام سے بچنا چاہتا تھا جس میں میری عمر آڑے آتی لیکن ان لوگوں نے میرے بارے میں کافی معلومات حاصل کیں اور مجھے دھمکیاں دینا شروع کر دیں انہوں نے بتایا کہ انہیں میری بیٹی کا پتہ معلوم ہے وہ اسے نقصان پہنچا دیں گے غرض یہ کہ انہوں نے مجھے آمادہ کر لیا اس کے بعد تیاریاں شروع ہو گئیں انہوں نے مجھے مکمل تفصیلات بتائی تھیں کہ مجھے کہاں جانا ہے البتہ اتنا ضرور بتا دیا تھا انہوں نے کہ ان کی منزل ایک عظیم الشان خزانہ ہے جس کی تاریخ بہت پرانی ہے اور انہیں اس خزانے کے بارے میں خاصی تفصیلات حاصل ہیں پھر اس کے بعد انہوں نے مجھے ساتھ لے کر مشرق بعید کا سفر کیا اور مشرق بعید کے ایک ملک میں انہوں نے قیام کیا اور اس جگہ تک جانے کی تیاریاں کرنے لگے جہاں وہ خزانہ موجود تھا چار مزدور ساتھ لے کر ہم نے ایک خاصا مشکل سفر طے کیا اور آخر کار انہوں نے ایک دور دراز علاقے میں کمپ لگا کر پہلی بار مجھے خزانے کے نقشے دکھائے اور اس جگہ سے آگاہ کیا جہاں خزانہ پوشیدہ تھا بہر حال اب میں یہاں تک آ گیا تھا تو ظاہر ہے مجھے کام کرنا ہی تھا میں پوری ذہانت اور تجربے کے ساتھ خزانے کے اس نقشے کے ذریعے وہ جگہ تلاش کرنے لگا اور آخر کار میں نے اس جگہ کو پایا جہاں خزانہ موجود تھا یہ خزانہ کچھ ایسی قدیم مورتیوں اور جوہرات پر مشتمل تھا جو بدھ مذہب کا پرچار کرتی تھیں بہت ہی قیمتی

اور جوہرات جڑی مورتیاں تھیں اس کے علاوہ بھی بہت کچھ تھا جسے ہم نے محفوظ کر لیا اور اس کے بعد واپسی کا سفر شروع ہو گیا یہ سفر ہمیں دریا کے راستے طے کرنا تھا ہم ایک بڑی کشتی لے کر چل پڑے اور اس سفر کی پہلی ہی رات ان چاروں مزدوروں نے ہم پر حملہ کر دیا جنہیں ہم ساتھ لے کر آئے تھے وہ مقامی لوگ تھے بظاہر بے ضرر ہی معلوم ہوتے تھے لیکن حقیقت یہ تھی کہ بہت ہی خطرناک لوگ نکلے اور ان کے درمیان زبردست جنگ ہو گئی اس جنگ کا کیا نتیجہ ہوا کون بچا اور کون نہیں بچا یہ مجھے بالکل نہیں معلوم ہو سکا تھا لیکن لڑتے لڑتے وہ سب کے سب دریا میں ڈوب گئے تھے صرف میں رہ گیا تھا جس نے اس جنگ میں حصہ ہی نہیں لیا تھا اور سچی بات یہ ہے کہ میرے ذہن میں کوئی بددیانتی یا برائی نہیں تھی میں خود اپنے اکیلے پن کو بری طرح محسوس کر رہا تھا کشتی سفر کرتی رہی اور آخر کار میں خشکی تک پہنچ گیا یہاں پہنچنے کے بعد میرے حواس جاگے اور میں نے سوچا کہ جب یہ عظیم الشان خزانہ میری قسمت میں لکھا گیا ہے تو پھر کیوں نہ میں اسے محفوظ کروں اور کسی کو اس کی ہوانہ لگنے دوں بڑے جتن کئے میں نے یہاں تک کہ خزانہ لے کر میں اپنے وطن واپس پہنچ گیا اس عظیم الشان خزانے کے تھوڑے تھوڑے حصوں کو میں نے فروخت کرنا شروع کر دیا اور اس کے مجھے انتہائی زبردست معاوضے موصول ہوئے میں نے وہ شہر چھوڑ دیا جہاں کا میں باشندہ تھا اور یہاں آ گیا یہاں میں نے ایک گھر خریدا اور سب سے پہلے اس میں ایک تہہ خانہ بنوا کر وہ خزانہ محفوظ کر دیا میرے پاس کروڑوں روپے کی رقم موجود ہے جو میں نے ان مجسموں کو بیچ کر حاصل کی لیکن اس کے ساتھ ہی بہت سے جوہرات اور بہت سے مجسمے اب بھی موجود ہیں اگر ان کو فروخت کیا جائے تو اس قدر رقم حاصل ہو سکتی ہے کہ میں دنیا کے امیر ترین لوگوں میں شمار ہونے لگوں لیکن اس سفر کے بعد میری صحت کبھی بہتر نہ رہی میں نے رقم بینکوں میں رکھنے کے بجائے اسی تہہ خانے میں محفوظ کر دی، اپنی حیثیت میں نے بالکل مختلف بنالی تھی۔ پھر میری طبیعت خراب ہوئی اور میں ایک اعلیٰ درجے کے ہسپتال میں داخل ہو گیا ڈاکٹروں نے مجھے انتہائی مہلک امراض بتائے اور میں تھوڑا سا بد دل ہو گیا پھر ایک دن میں نے ایک عجیب و غریب منظر دیکھا تین افراد اس ہسپتال میں داخل ہوئے اور معلومات حاصل کرنے لگے جہاں میں علاج کروا رہا تھا۔ یہ انہی میں سے تین تھے جو مجھے خزانے کے حصول کے لیے لے گئے تھے۔ میرے اوپر لرزہ طاری ہو گیا خزانہ مکمل طور پر میری تحویل میں تھا

بعد وہ بولی تو پھر ”مجھے بتائیے کہ مجھے کیا کرنا ہے؟“

”بیٹا میرے ساتھ جو کچھ بھی ہوا وہ ایک الگ بات ہے میں نے تمہیں اپنی بیٹی کا پتہ بتا دیا ہے اس پتے پر جس قدر جلد ہو سکے اس سے رابطہ قائم کرو اس کے ساتھ ساتھ میں تمہیں اپنے گھر کا پتہ بھی بتائے دیتا ہوں اسے بھی لکھ لو اس گھر کی حفاظت کرو تہہ خانے کا راستہ بھی میں تمہیں بتائے دیتا ہوں میری بیٹی اگر میری زندگی میں یہاں پہنچ گئی تو اس سے بڑی خوش بختی میرے لئے اور کوئی نہیں ہوگی لیکن اگر وہ میری موت کے بعد ہی آئے تو یہ تمہارا فرض ہے بیٹا کہ اسے میرے بارے میں تفصیل بتا دو اور پھر یہ خزانہ اس کے حوالے کر دو اس کا پچیس فیصد حصہ میں تمہیں دیتا ہوں۔ وہ پچیس فیصد حصہ تم استعمال کرو۔ میں سمجھتا ہوں کہ تم ایسے چھ ہسپتال کھول سکتی ہو اس رقم سے ان کی مالک بن سکتی ہو میری طرف سے یہ تمہاری خدمت ہوگی کیا سمجھیں اور اب مجھے یہ بتاؤ کہ کیا تم میرا یہ کام کر دو گی؟“

اگر آپ اس خزانے کی پیشکش مجھے نہ بھی کرتے تب بھی میں آپ کا یہ کام ضرور کر دیتی۔“

شکیلہ نے نرم لہجے میں کہا اور بوڑھے نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا لیکن شکیلہ نے نفرت سے اپنا ہاتھ پیچھے ہٹا لیا اور دل میں بولی کہ تم لوگ بدنصیب ہوتے ہو جو سوچ سمجھ کر بات نہیں کرتے زخمی دل پر کتنی آسانی سے تم نے نیا گھاؤ لگا دیا بھگتو گے خود ہی بھگتو گے اور واقعی بوڑھے کو بھگتنا پڑا۔ شکیلہ وہ طریقہ کار دریافت کرنے لگی جس سے بوڑھے کی زندگی ختم کی جاسکتی ہو اور اس نے آخر کار طریقہ کار دریافت کر ہی لیا۔ چھوٹی سے ننھی سی ٹیوب جس میں ایک ایسا لیکویڈ موجود تھا جو اشیاء کو جوڑنے کے کام آتا ہے اور اس کی طاقت بے پناہ ہوتی ہے۔ لیکویڈ کا تھوڑا سا حصہ اس نے بوڑھے کے ہونٹوں کی اندرونی سطح پر لگایا جب وہ گہری نیند سو رہا تھا اور پھر اس کے دونوں ہونٹ آپس میں چپکا دیئے۔ یہی لیکویڈ اس نے بوڑھے کے نتھنوں میں ڈالا اور ذرا سی ہوا لگنے کے بعد چٹکی سے ان کی ناک کے دونوں نتھنیں دبا دیئے یہ کام اس نے نہایت مہارت سے کیا تھا۔ ڈیوٹی پر اور بھی بہت ساری نرسیں تھیں کیونکہ جنرل وارڈ میں صرف ایک نرس کی ڈیوٹی نہیں ہوتی وہ یہ سارا کام انجام دے کر دوسرے کاموں میں مصروف ہو گئی البتہ دور سے اس نے دیکھا تھا کہ دم رک جانے کی وجہ سے بوڑھا ہاتھ پاؤں مار رہا ہے۔ اس کے

اگر میں ان سے رجوع بھی کرتا تو کیا کہا جاسکتا تھا کہ وہ لوگ مجھے زندہ چھوڑتے چنانچہ میں ہسپتال سے فرار ہو گیا اور اس کے بعد ایک گھنٹہ درجے کے ہوٹل میں جا چھا لیکن میں نے جگہ جگہ ان لوگوں کو دیکھا ہے اور میں یہاں ایک معمولی آدمی کی حیثیت سے جنرل وارڈ میں موجود ہوں یہاں میرا علاج بس اسی طرح ہو رہا ہے جس طرح جنرل وارڈ کے ایک مریض کا ہوتا ہے اور تمہیں یہ سن کر تعجب ہوگا بیٹی کہ وہ لوگ یہاں بھی پہنچ گئے ہیں میں نے ان میں سے ایک کو دیکھا ہے وہ کم بخت نجانے کس طرح میری خوشبو سونگھتے پھر رہے ہیں اور جہاں میں پہنچتا ہوں وہاں آ جاتے ہیں بیٹی مجھے نہ شہ ہے کہ وہ آخر کار مجھ تک پہنچ جائیں گے اور اس کے بعد میرے ساتھ جو کچھ ہوگا میں اچھی طرح جانتا ہوں اس لئے میں نے تم سے کہا کہ ڈاکٹر اگر میری صحت یابی کے بارے میں کچھ پر امید بھی ہیں تو یقیناً ہوں گے لیکن میں جن حالات کا شکار ہوں ان میں موت کو اپنے زیادہ قریب محسوس کرتا ہوں۔“

شکیلہ حیرت اور دلچسپی سے یہ ساری باتیں سن رہی تھی کچھ لمحے خاموش رہنے کے بعد اس نے کہا آپ اس قدر دولت مند آدمی ہیں۔“

”کیا بیٹا بس دولت ہے میرے پاس لیکن کتنا بد نصیب ہوں میں کہ کوشش کے باوجود اپنی بیٹی تک بھی نہیں جاسکتا بیٹا میں نے بہت سوچ سمجھ کر تمہارے بارے میں ایک فیصلہ کیا ہے۔“

”میرے بارے میں؟“

”ہاں مجھے معاف کرنا جن کے چہرے بد نما ہوتے ہیں جن کا رنگ کالا ہوتا ہے جو رو سیاہ ہوتے ہیں ان کا دل سنہرے رنگ کا ہوتا ہے ان کا دل بہت پر نور ہوتا ہے میں نے تمہاری بدنمائی کا تذکرہ بے دھڑک کر دیا ہے کیونکہ میں جانتا ہوں کہ تم ایک پر نور دل کی مالک ہو گی۔“

اچانک ہی شکیلہ کے اعصاب سخت ہونے لگے اس کے جبرڑوں کے مسلز ابھر آئے دانت بھیج گئے بوڑھے نے نادانستگی میں وہ وار کر دیا تھا جو شکیلہ کے لئے سب سے زیادہ تباہ کن تھا اب تک بوڑھے کی باتیں وہ دلچسپی سے سن رہی تھی۔

اب اچانک ہی اس میں نفرت کا عنصر ابھر آیا تھا اس کے ہونٹ آہستہ آہستہ کھلے لیکن پھر اچانک بند ہو گئے اور اچانک ہی اس کے اندر سکون اترنے لگا خاصی دیر خاموش رہنے کے

سائس کے دونوں راستے بند ہو گئے تھے اور محوں کے اندر اندر اس نے دم توڑ دیا تھا۔
پھر کوئی ڈیوٹی نرس اس کی نبض دیکھنے لگی لیکن اس کی نبض ڈوب چکی تھی ڈاکٹروں کو اطلاع دی گئی جنرل وارڈ کے کسی لاوارث مریض کے سلسلے میں بھلا کسی بڑی تحقیقات کی کیا گنجائش تھی کسی نے غور بھی نہیں کیا کہ اچانک اس کی ناک پتلی کیسے ہو گئی ہے بس بوڑھے کی لاش سرد خانے میں پہنچا دی گئی تھی۔

پورا ایک ہفتہ اس نے نہایت پرسکون رہ کر گزارا تھا وہ کسی کوشش کا موقع نہیں دینا چاہتی تھی البتہ اس ایک ہفتے کی سوچوں نے اسے بہت سی نئی جہتوں سے آگاہ کیا تھا۔
بوڑھے نے اگر واقعی سچ کہا ہے اور کوئی اتنا بڑا خزانہ محفوظ ہے تو پھر مستقبل کے راستے ہی بدل جائیں گے اس نے راتوں کو بہت سے انوکھے خواب دیکھے تھے لیکن حالات نے اس قدر پختہ کار بنا دیا تھا کہ کسی بھی چیز کو حتمی درجہ نہیں دیتی تھی ہاں جو ہو جائے وہ اپنا اور جو نہ ہو سکے اس کے بارے میں سوچنا بیکار تھا پھر اس نے ایک دن نادیہ سے کہا کہ اس کی طبیعت خراب ہے وہ کچھ دن کی چھٹی لے گی۔

نادیہ نے اس کی درخواست ڈاکٹر فیض تک پہنچا دی تھی کوئی انوکھی بات نہیں تھی اس نے تین چار دن خاموشی سے گھر کے کوارٹر میں گزارے اور پھر ایک دن گھر سے نکل آئی وہ پتہ اس کے پاس محفوظ تھا جو بوڑھے نے لکھوایا تھا ایسا گھر اسے نظر آ گیا جس میں تالا پڑا ہوا تھا ایک دور دراز کی آبادی میں یہ گھر تھا مکانات بھی خال خال بنے ہوئے تھے یہ علاقہ نیا نیا آباد ہو رہا تھا مکان البتہ بہت اچھا تھا لیکن بوڑھے نے اسے اس طرح ویران رکھا تھا کہ کسی کی خصوصی توجہ اس کی جانب نہ جائے۔

وہ تھوڑی دیر تک سوچتی رہی اور اس کے بعد اس نے مکان کا تالا توڑا اور اندر داخل ہو گئی سب سے پہلے اس نے گیٹ بند کیا اور اس ویران مکان میں جہاں صحن میں جگہ جگہ جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں اندر کی طرف قدم بڑھانے لگی مین دروازے پر بھی تالا پڑا ہوا تھا اس تالے کو توڑنے میں بھی اسے کوئی خاص دقت پیش نہیں آئی اور وہ اندر پہنچ گئی۔

تہہ خانے کا جو راستہ بوڑھے نے اسے بتایا تھا وہ اسے تلاش کرنے لگی تہہ خانہ واقعی بڑی خوبصورتی اور مہارت سے بنایا گیا تھا بوڑھے نے غالباً اس سلسلے میں اپنے تجربے سے کام لیا

تھا کچھ دیر کے بعد اسے تہہ خانے میں جانے کا راستہ مل گیا اور دھڑکتے دل کے ساتھ وہ نیچے سیڑھیاں طے کرنے لگی ہر قدم دماغ میں دھک رہا تھا بہت سے خوفزدہ کر دینے والے خیالات دل میں آرہے تھے خوف کا اس کی زندگی میں کم ہی گزر رہا تھا ایک احساس ہی اسے ختم کئے ہوئے تھا لیکن آج بہت عرصے کے بعد اسے اپنے قرب و جوار سے خوف محسوس ہو رہا تھا نیم تاریک تہہ خانے میں اسے آخر کار وہ سب کچھ نظر آ گیا جس کی بوڑھے نے نشاندہی کی تھی۔

خزانوں سے متعلق کچھ کہانیاں اس نے ضرور پڑی تھی لیکن آج ایک کہانی حقیقت کا روپ دھار کر سامنے آ گئی تھی اس نے دل کڑا کیا اور اس جگہ پہنچ گئی پہلے بیگ کو کھول کر دیکھا تو آنکھیں چندھیا گئیں اس میں کچھ مجسمے تھے سونے کی دمک جڑے ہوئے جواہرات میں عجیب بہار دکھا رہی تھی اسے اپنا ذہن ان روشنیوں کی گرفت میں آتا ہوا محسوس ہوا کچھ دیر تک وہ چکرائی ہوئی کھڑی رہی۔

پھر اس نے ایک مجسمے کی طرف ہاتھ بڑھایا اور اسے اٹھالیا وزنی مجسمہ جو خالص سونے کا بنا ہوا تھا اور اس میں جواہرات جڑے ہوئے تھے اس کے ہاتھ سے گرتے گرتے بچا اسے اتنے وزن کا احساس نہیں تھا ٹھوس سونے کا وزن ویسے بھی کافی ہوتا ہے وہ اسے دیکھتی رہی اور پھر اس نے اس مجسمے کو رکھ کر دوسرا مجسمہ اٹھایا۔

آہ یہ تو کروڑوں روپے کا ہے اسے تو سنبھالنا بھی دنیا کا سب سے مشکل کام ہے یہ بیگ بند کر کے اس نے دوسرے بیگ دیکھے قدیم زمانے کے زیورات اور اس کے بعد نئے دور کی چیزیں، نوٹوں کے انبار یہ نوٹ یقیناً بوڑھے نے خزانے کا کچھ حصہ بیچ کر حاصل کئے ہوں گے خود ان نوٹوں کی تعداد اتنی تھی کہ شکلیہ انہیں خرچ کرنے کا تصور بھی نہیں رکھتی تھی وہ تمام چیزیں سحر کے عالم میں دیکھتی رہی۔

اب اس کا خوف بالکل دور ہو چکا تھا تہہ خانے میں ہی مناسب جگہ تلاش کر کے وہ بیٹھ گئی اور بہت دیر تک سوچوں میں ڈوبی رہی اب کیا کرنا چاہیے۔

بہت دیر تک یہاں بیٹھنے کے بعد شکلیہ نے فیصلہ کیا کہ خزانے کو اسی طرح رہنے دیا جائے اور ذرا قرب و جوار کے ماحول کا جائزہ لے لیا جائے اس نے سارے بیگ بند کر دیئے اور اس کے بعد تہہ خانے سے باہر جانے والے راستے کی جانب چل پڑی بوڑھے نے تو خیر جس طرح

بھی یہ تہہ خانہ بنایا ہوگا وہ ایک الگ بات تھی لیکن وہ یہ سوچنے لگی کہ اس تہہ خانے کو محفوظ ترین بنانے کے لیے کیا طریقہ کار اختیار کیا جائے بیرونی راستے تک آتے ہوئے اس نے تہہ خانے کا بغور جائزہ لے لیا تھا پھر باہر آنے کے بعد وہ مکان کے چپے چپے کا جائزہ لینے لگی اور اس کے بعد اس نے ایک ہی فیصلہ کیا مکان میں بہت سا ٹونا پھوٹا فرنیچر بھی پڑا ہوا تھا اس کے جسم میں نئی قوتیں دوڑ گئیں ٹوٹی ہوئی کرسیاں پر انائیڈ کا گدا اور ایسی ہی کئی چیزیں اسے دستیاب ہوئیں جنہیں وہ گھیٹ گھیٹ کر اس کمرے میں لانے لگی جس میں تہہ خانے کا دروازہ تھا کئی گھنٹوں کی کاوشوں کے بعد اس نے اس کمرے کو خصوصی طور پر کباڑ خانہ بنا دیا لیکن اس مہارت کے ساتھ کہ جب وہ تہہ خانے میں داخل ہونا چاہے تو تھوڑی سی چیزیں ہٹا کر اندر چلی جائے۔

اگر کوئی اجنبی شخص اس گھر میں داخل بھی ہوتا ہے تو پورے گھر کا وہ بے شک جائزہ لے لے گا، لیکن اس کمرے کو ایک کباڑ خانہ سمجھ کر فوراً نظر انداز کر دے گا اس کی پہلی ذہانت آمیز کارروائی تھی اس کے بعد ہی اس نے بقیہ گھر کا جائزہ لیا پھر گھر کے دروازے پر آگئی اور یہ دیکھنے لگی کہ کتنے لوگ اس گھر کے دروازے کے سامنے سے گزرتے ہیں کوئی آدھے گھنٹے تک وہ دروازے کے پاس رکی اور دور دور تک کا جائزہ لیتی رہی لیکن مکان سے کوئی دو سو اور تین سو گز کے فاصلے پر اسے کوئی نظر نہیں آیا جہاں خال خال مکانات بنے ہوئے تھے وہاں اکا دکا افراد نظر آ جاتے تھے لیکن کوئی کسی کی جانب متوجہ نہیں محسوس ہوتا تھا اسے خاصا اطمینان ہوا ٹوٹے ہوئے تالے میں گرد کی تہیں جمی ہوئی تھیں اس نے اسی تالے کو دروازے میں لٹکا کر دبایا تو تالا بند تو نہیں ہوا تھا کیونکہ اس کے لیور ٹوٹ چکے تھے لیکن وہ اس طرح چپک گیا تھا کہ ایک نگاہ دیکھنے سے بند ہی محسوس ہوتا تھا پھر وہ چل پڑی ذہن نجانے کیسی کیسی سوچوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا بدن میں ایک سنسنی سی پھیلی ہوئی تھی اب اسے سکون چاہیے تھا جب وہ کوارٹر واپس پہنچی تو نادیدہ ڈیوٹی پر تھی اس نے دل میں شکر ادا کیا کہ نادیدہ اس وقت موجود نہیں ہے کوارٹر کے دروازے کو بند کر کے وہ فریج کے پاس پہنچی پانی کی ٹھنڈی بوتل نکالی اس سے بہت سا پانی پیا اور جب بوتل آدھی رہ گئی تو اسے سر پر انڈیلنے لگی پانی کافی سرد اور تیز تھا بظاہر تو اسے سکون محسوس ہوا لیکن کپڑے بھیگ جانے کی وجہ سے بدن میں ٹھنڈی ٹھنڈی لہریں بھی محسوس ہونے لگی تھیں تاہم یہ سردی اس وقت اسے خاصی خوشگوار محسوس ہوئی اور وہ سیدھی پلنگ پر لیٹ گئی جو کچھ وہ دیکھ کر آئی تھی اسے

دیکھ کر کسی کا بھی یہی حال ہو سکتا تھا۔

خزانے کی صحیح مالیت کا وہ کوئی اندازہ نہیں لگا سکی تھی لیکن اب اس کے سوچنے کے انداز میں تبدیلی آتی جا رہی تھی بوڑھا مرچکا ہے اس کی بیٹی ان تمام معاملات سے اتنی دور ہے کہ اس کی آمد کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا اس کے علاوہ بوڑھے نے جو تفصیلات بتائی تھیں ان سے بھی یہ اندازہ ہوتا تھا کہ بیٹی کو کسی خزانے کے بارے میں معلومات حاصل نہیں ہیں اب اس کے بعد وہی نامعلوم لوگ رہ جاتے تھے جو بوڑھے کی تاک میں تھے بقول اس بوڑھے شخص کے لیکن ان کے فرشتوں کو بھی شکیلہ نام کی کسی ایسی لڑکی کا علم نہیں ہوگا جو خزانے کی تیسری راز دار بن گئی تھی نہ صرف راز دار بن گئی تھی بلکہ خزانہ اب اس کی تحویل میں تھا وہ لوگ کبھی اس کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکیں گے۔

اگر انہوں نے بہت زیادہ بھی چھان بین کی اور کسی طرح سے انہیں بوڑھے کے بارے میں علم ہو گیا تب بھی وہ اس سے آگے کچھ نہیں کر سکیں گے چنانچہ یہ ایک پہلو اطمینان بخش ہے کہ خزانے کے بارے میں صرف اسے معلوم ہے اب اس کے بعد یہاں اس ہسپتال کی نوکری سے چھٹکارہ حاصل کرنے کی بات ہے اس نے پہلی بار زبردست ذہانت کے ساتھ سوچا کہ ہسپتال اور نادیدہ کو اچانک چھوڑ دینا ایک غیر مناسب عمل ہوگا کوئی شبہ والی بات نہیں ہونی چاہیے اس کے لیے کوئی ایسا حقیقی لائحہ عمل ہو جس سے کسی کو کسی انوکھے پن کا احساس نہ ہونے پائے اور پھر اس نے اپنے کام کا آغاز کر دیا اس دن جب اس کی ڈیوٹی کا وقت آیا تو وہ بستر پر پڑی سو تی رہی نادیدہ نے اسے جگایا تو اس نے کابلی سے کہا۔ نہیں نادیدہ میں آج ڈیوٹی نہیں کروں گی تم اگر چاہو تو انچارج کو میرے بارے میں اطلاع دے دو۔

”کیوں نادیدہ کیا بات ہے؟“

”ڈسپینری دیتی ہوں تمہیں۔“

”نہیں پلیز! میں صرف سونا چاہتی ہوں۔“

نادیدہ اس سے حسب معمول ہمدردی کرتی رہی اس نے اس کی تیار داری بھی کی اور پھر دوپہر کو اپنی ڈیوٹی پر چلی گئی۔

اس دوران شکیلہ کسلمندی سے لیٹی رہی تھی نادیدہ کے جانے کے بعد وہ اٹھی اپنے لئے کچھ

نادیہ جب ڈیوٹی سے واپس آئی تو بولی یہ تم نے کیا کر ڈالا شکلیہ تمہیں اس بات کا بھی احساس نہیں ہوا کہ تمہاری وجہ سے میری پوزیشن بھی کتنی خراب ہو گئی میں نے ہی تمہاری سفارش کی تھی ڈاکٹر فیض ایک عظیم انسان ہیں تم نے ان سے بھی بدتمیزی کی۔“

”ہاں تم کہنا کیا چاہتی ہوں؟“

”شکلیہ تمہیں میرا تو خیال کرنا چاہیے تھا۔“

”میں نے نہیں کیا تمہارا خیال، ٹھیک ہے کوئی بات نہیں ہے میں تمہارا یہ کوارٹر چھوڑ دیتی ہوں۔“

”پتہ نہیں کیا ہو گیا ہے تمہیں، بیمار بیمار کہہ رہی ہو خود کو۔ بظاہر تو کوئی بیماری نہیں ہے اتنا خراب مزاج تو تمہارا کبھی نہیں تھا۔“

”بابا اب ہو گیا ہے، پاگل ہو گئی ہوں میں مگر بے فکر رہا اپنے پاگل پن سے تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گی۔“

نادیہ کو کچھ سخت دست سننا پڑی تھیں اتنے عرصے میں پہلی بار وہ شکلیہ سے نہ بولی رات کو وہ اپنے بستر پر آرام سے لیٹ گئی کھانے وغیرہ تک کے لیے شکلیہ سے نہیں پوچھا تھا۔

شکلیہ دل ہی دل میں مسکرا رہی تھی اور کہہ رہی تھی کہ مجھے معاف کرنا میری پیاری دوست میں ابھی جو حیثیت اختیار کرنے والی ہوں اس میں تمہاری گنجائش بالکل نہیں تھی تم سارا کھیل میری مرضی کے مطابق ہی کھیل رہی ہو۔ دوسرے دن وہ باقاعدہ اپنی ڈیوٹی پر گئی حالانکہ اسے معطل کر دیا گیا تھا اس کی جگہ جو قائم مقام وارڈن رکھی گئی تھی وہ ویسے بھی شکلیہ کی مخالف تھی۔

اس نے کہا۔ ”آپ کیسے آگئیں سسٹر شکلیہ، آپ کو تو سسپنڈ کر دیا گیا ہے۔“

”بکو اس کی تو ایک تھپڑ رسید کروں گی گال پر۔ اپنے کام سے کام رکھو، سمجھیں۔“

شکلیہ غرائے ہوئے لہجے میں بولی۔

کئی نرسوں نے اس کے یہ الفاظ سنے تھے وہ بولیں تو کچھ نہیں لیکن حیرانی سے شکلیہ کو دیکھتی رہیں اور پھر شکلیہ نے متعلقہ شخص کو ہاتھ سے لکھا ہوا استعفیٰ پیش کر دیا استعفیٰ دیکھ کر ابراہیم نامی وہ شخص بولا یہ کیا کر رہی ہیں سسٹر شکلیہ آپ حد سے زیادہ جذباتی ہو گئی ہیں۔“

”تمہاری ڈیوٹی کیا ہے اپنا کام اسی طرح انجام دو جو تمہاری حیثیت ہے بہت زیادہ

چیزیں تلاش کیں اور کھاپی کر گہری سوچوں میں ڈوب گئی وہ اپنے عمل میں ایک ایک قدم آگے بڑھ رہی تھی دل تو یہ چاہتا تھا کہ اڑ کر اس مکان میں پہنچ جائے جہاں خزانہ محفوظ ہے لیکن عقل و دانش کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہتی تھی مکان کے گرد چکر لگانے کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں کو شہسے کی دعوت دے دی جائے ایک ایسے مکان میں جو عرصے سے خالی پڑا ہوا ہے اچانک ہی کسی کو دیکھ کر کوئی بھی متوجہ ہو سکتا ہے اس کے لیے اپنے آپ کو تیار کرنا ضروری تھا وہ دیکھتی اور سوچتی رہی ادھر دوسرے دن وہ ہسپتال پہنچی تھی لیکن آج اس نے کمال کر دیا تھا وارڈن کی اپنی ذمے داریاں ہوتی ہیں لیکن اس نے سارے کام غلط کئے تھے یہاں تک کہ ایک نرس کو اس کی وجہ سے بہت سخت ست سننا پڑا تھا دوسرا اور تیسرا دن بھی اسی طرح کیا گیا سب لوگ حیران تھے کہ اچانک اسے کیا ہو گیا ہے پھر پانچویں دن ڈاکٹر فیض نے اسے اپنے پاس طلب کر لیا۔

”یہ تم کیا کرتی پھر رہی ہو شکلیہ کیا ہو گیا ہے تمہیں۔ کیا کچھ نہیں کر ڈالا تم نے ان چار پانچ دنوں میں مجھے یوں لگتا ہے جیسے تم کسی مشکل کا شکار ہو گئی ہو۔“

”سر میں بیمار ہوں۔“

”تو کچھ دن کی چھٹی لے لو آرام کر لو جو کچھ تم کر رہی ہو وہ تو بہت غلط ہے ہر طرف سے ایک ہی بات کہی جا رہی ہے کہ اچانک ہی شکلیہ کا ذہنی توازن بگڑ گیا ہے۔“

”سر ذہنی توازن تو آپ لوگوں کا بگڑ گیا ہے میں نے آپ سے کہا ہے کہ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے اور آپ میرے ساتھ یہ سختی کا سلوک کر رہے ہیں۔“

ڈاکٹر فیض بہت اچھے آدمی تھے لیکن شکلیہ نے خاصے شاف کے سامنے ان کی جس طرح بے عزتی کی تھی اس سے وہ بری طرح برگشتہ ہو گئے۔

”تم مجھ سے بدتمیزی کر رہی ہو شکلیہ؟“

”آپ بھی تو مجھ سے بدتمیزی کر رہے ہیں انسان ہوں جانور نہیں ہوں میں نے

چھتیس بار آپ سے یہ بات کہہ دی کہ میں بیمار ہوں۔“

”میں میں تمہیں معطل کرتا ہوں۔“

”کردیتے آپ کیا سمجھتے ہیں صرف آپ ہی کے ہاں رزق مل سکتا ہے۔“

ڈاکٹر فیض بہت زیادہ ناراض ہو گئے تھے۔ شکلیہ وہاں سے چلی آئی تو وہ مطمئن تھی البتہ

آ کے بڑھنے کی کوسٹ مت کرو۔ مجھے؟“

”آپ اپنی مرضی کی مالک ہیں سسر شکیلہ بے شک آپ مجھے برا بھلا کہہ لیں لیکن ہم سب آپ کے ہی خواہ ہیں آپ استغنیٰ نہ دیں تو بہتر ہے۔“

”یہ استغنیٰ تم ڈاکٹر فیض کو پیش کر دو جو اپنے آپ کو شاید رازق سمجھتے ہیں، کیا سمجھے۔“

دوسرا پرچہ اس نے نادیہ کے لیے لکھا تھا اور ایسی نمایاں جگہ رکھ دیا تھا جہاں سے نادیہ کی نگاہ فوراً ہی اس پر پڑ جائے اس نے لکھا تھا مائی ڈیر نادیہ انسان زندگی میں بہت کم لوگوں سے متاثر ہوتا ہے یا تو متاثر ہونے کی اداکاری کرتا ہے اور فریب دیتا ہے یا اگر متاثر ہوتا ہے تو پھر اس میں مکمل خلوص بھی شامل ہوتا ہے تم یقین کرو تم نے جس طرح اتنے عرصے میرا ساتھ دیا میں اس کے لیے تمہاری دلی شکر گزار ہوں تم سے میری تلخ کلامی ہوئی جس کا مجھے شدید افسوس ہے تم جیسی اچھی دوست کو مجھے یہ سب کچھ نہیں کہنا چاہیے تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ میں ان دنوں ذہنی طور پر منتشر ہوں میری یہ ذہنی بیماری میرے پورے جسم کو متاثر کیے ہوئے ہے میں سکون چاہتی ہوں اور اس کے لیے میں نے فیصلہ کیا کہ کسی ایسی جگہ چلی جاؤں جہاں میرا کوئی شناسا نہ ہو وہاں اپنے لئے کوئی جگہ تلاش کروں اور پھر زندگی کا اتنا حصہ وہاں بسر کروں کہ میرے دل کا سکون مجھے واپس مل جائے یا پھر زندگی مجھ سے چھین جائے سوری نادیہ تمہارے احسانات کا میں صحیح بدلہ نہیں دے رہی جس کے لیے میں افسردہ ہوں۔ یقین کرو تمہیں کوئی نقصان پہنچا کر نہیں جا رہی جو کچھ یہاں چھوڑے جا رہی ہوں وہ تمہارے تو خیر کس کام کا لیکن میں اسے اپنے لئے بھی بے مقصد ہی سمجھتی ہوں۔

شکیلہ نے اس دوران اپنے لئے کافی چیزیں جمع کر لی تھیں تنخواہ ملتی تھی اس کا مصرف ہی کچھ نہیں تھا بہر حال تھوڑی سی رقم لینے کے بعد وہ کوارٹر سے باہر نکل گئی اور اس کے بعد ہسپتال کے گیٹ سے بھی باہر آ گئی پھر ایک آٹو رکشہ کر کے چل پڑی کئی جگہیں تبدیل کرنے کے بعد آخر کار وہ دوبارہ اس گھر تک پہنچی تھی بظاہر اب یہ سب کچھ اسی کی ملکیت تھا تالا اسی طرح گرد مٹی اور میل میں چپکا ہوا تھا اس نے یہ تالا کھولا اور اندر داخل ہو گئی۔

یہاں آنے کے بعد اس نے ایک نئی نگاہ سے اس گھر کو دیکھا یہ گھراب اس کا اپنا ہے بلا شرکت غیر۔

ایک بار پھر اس نے گھر کے گوشے گوشے کی تلاقی لی پورا گھر برے حال میں تھا اس نے سب سے پہلے اس گھر کی صفائی کا فیصلہ کیا زندگی کا ایک نیا رخ شروع ہو چکا تھا وہ تن من دھن سے گھر کے گوشے گوشے کی صفائی میں مصروف ہو گئی شام کے چھ بجے کا وقت تھا سورج ابھی پوری طرح نہیں چھپا تھا گھر سے کچھ فاصلے پر کوڑے دان بنا ہوا تھا گھر سے کوڑے کے انبار اٹھا اٹھا کر وہ اسی کوڑے دان میں ڈال رہی تھی اور اس وقت بھی وہ کافی کوڑا سمیٹے ہوئے کوڑے دان کے پاس آئی تھی اور کوڑا پھینکنے کے بعد گہری گہری سانسیں لے رہی تھی پورا بدن تھک کر چور ہو گیا تھا چہرہ بے شک بھدے نقوش پر مشتمل تھا لیکن عمر کی جس منزل میں تھی وہ پورے بدن پر چھائی ہوئی تھی ایک جوڑے کو اس نے دیکھا دراز قامت عورت جو دور سے کافی خوبصورت لگ رہی تھی اور اس کے ساتھ ہی ایک انتہائی دلکش اور موزوں بدن کا مالک مرد دونوں جاگر پہنے ہوئے جاگنگ کرتے ہوئے اسی طرف آرہے تھے یقیناً کسی آس پاس کے گھر کے رہنے والے تھے وہ انہیں دیکھتی رہی دونوں ہی اس کے قریب سے گزرے تھے اور پھر اس سے کوئی تین چار گز کے فاصلے پر رک گئے عورت نے مسکرا کر اسے دیکھا اور بولی ”ادھر آؤ، انداز میں نرمی ہی تھی وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اس کے قریب پہنچ گئی۔

”کیا اس سامنے والے گھر میں کوئی آ گیا ہے۔ میں نے تمہیں دو تین بار اس گھر سے نکلتے ہوئے دیکھا ہے کام کرتی ہو۔“ یہاں ایک لمحے کے اندر اندر شکیلہ نے فیصلہ کر لیا کہ اسے کیا کہنا ہے اور کیا کرنا ہے۔

وہ نیاز مندی سے بولی۔ ”جی بی بی صاحبہ نوکرانی ہوں اس گھر کی۔“

”مالکان کہاں ہیں یہ گھر تو کافی دن سے خالی پڑا ہے وہ دیکھو۔ وہ سامنے تمہیں جو گھر نظر آ رہا ہے نا وہ کافی فاصلے پر سفید رنگ کے گیٹ والا۔“

”جی بیگم صاحب۔“

”ہم لوگ وہیں رہتے ہیں میرا بیڈروم اوپر کی منزل پر ہے جہاں سے مجھے دور دور تک نظر آتا ہے آج ہی میں نے دیکھا ہے تم صبح سے اس گھر کی صفائی کر رہی ہو کیا مالکان آ رہے ہیں“

”نہیں بیگم جی مجھے تھوڑے ہی دن پہلے اس گھر میں نوکر رکھا گیا ہے۔ مالکان تو ملک

سے باہر ہیں جی اب میں ہی یہاں رہوں گی مجھ سے کہا گیا ہے کہ گھر کی صفائی ستھرائی کر کے تم یہاں اس گھر میں رہو۔

”اچھا چھاتو ان کے آنے کا ابھی کوئی ارادہ نہیں ہے؟“

”پتہ نہیں بیگم جی مجھ سے اس بارے میں کچھ نہیں کہا گیا۔“

”ہوں..... ٹھیک ہے تم نے وہ گھر دیکھ تو لیا ہے میرا دور تو کافی ہے لیکن کسی چیز کی ضرورت ہو تو وہاں چلی آیا کرو۔“

اسی وقت نو جوان مرد کی آواز سنائی دی چلو بھئی دھوپ ہو رہی ہے تم جہاں دیکھو وہاں باتیں کرنے پر تل جاتی ہو تم جانتی ہو میں بدنما چہرے برداشت نہیں کر سکتا چلو یہاں سے۔

”رک تو جاؤ ایاز نو جوان ہے اب چہرہ کالا اور بھدا ہے تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟“

”بابا تمہیں فرق نہیں پڑتا میں دوسرے قسم کا آدمی ہوں، بدنما چہرے مجھ سے برداشت نہیں ہو سکتے میں چلتا ہوں تم آ جاؤ میں اس بدنما عورت کو زیادہ دیر تک نہیں دیکھ سکتا تمہیں تو ہر جگہ کچھ نہ کچھ نظر آ جاتا ہے۔

”اچھا بابا اچھا، کیا نام ہے تیرا؟“ عورت نے اس بار شکلیہ سے پوچھا۔

”رشیدہ۔“ شکلیہ نے اپنے نام کا مذاق اڑانا مناسب نہیں سمجھا اور ویسے بھی نام بدلنا ضروری تھا۔

”ٹھیک ہے رشیدہ، تمہیں کسی چیز کی ضرورت ہو تو میرے پاس آ جانا اکیلی رہو گی اس گھر میں میں بھی سامنے والے گھر میں اکیلی ہی رہتی ہوں بس یہ میرے شوہر ہیں اور میں ہوں کیا سمجھیں کبھی فرصت ہو تو آ جایا کرو۔“

”ضرور آ جاؤں گی بیگم صاب۔“

”پانچ بجے سے پہلے پہلے۔ پانچ بجے میں آ جاتا ہوں۔“ ایاز نے کہا اور پھر بیوی کی طرف رخ کر کے بولا، شاز یہ چلو بھئی، اور اس کے بعد دونوں جاگنگ کرتے ہوئے آگے بڑھ گئے لیکن شکلیہ کی آنکھوں میں وہی خوفناک سرخی لہرانے لگی تھی جو کسی کے چھیڑ دینے سے پیدا ہو جاتی ہے اور پھر چھیڑنے والا اس کی تمام تر نفرتوں کا مرکز بن جاتا تھا اس کے منہ سے سرسراتی ہوئی آواز نکلی ”ایاز“ اور پھر ایک خونی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر رنگ گئی۔

وہ دور تک انہیں جاتے ہوئے دیکھتی رہی اور اس کے بعد مڑ کر گھر واپس چل پڑی یہ سب کچھ ہو گیا تھا وہ زندگی کے ایک دوسرے رخ سے دو چار ہو چکی تھی اس دوران بالکل اتفاقیہ طور پر اسے ایسا کوئی نہیں ملا تھا جو اسے بد شکل کہہ کر اس کے ان خونی جذبات کو ابھارتا آج ایک بدنصیب پھر منظر عام پر آ گیا تھا رات کو بستر پر لیٹ کر وہ اسی کے بارے میں سوچتی رہی دماغ کو لاکھ طریقے سے بانٹنے کی کوشش کر رہی تھی اب میری زندگی کا دوسرا دور شروع ہو گیا ہے مجھے آئندہ کیا لائحہ عمل اختیار کرنا چاہیے کیا میں اپنی اسی کیفیت کا شکار ہو کہ کوئی مجھے بد شکل کہہ دے بلاوجہ مجھ پر طنز کرے تو میں اس کی جان کی دشمن بن جاؤں یا زندگی کو کسی اور رخ پر لگایا جائے مگر وہ رخ کیا ہو سکتا ہے۔

آج رات وہ بہت دیر تک جاگتی اور سوچتی رہی تھی اس کا ذہن بے شمار فیصلے کر رہا تھا ماں نے اسے جس راستے پر ڈالا تھا وہ راستہ اب آگ کی ایک لکیر بن چکا تھا جس سے ادھر ادھر ہٹنا شکلیہ کے بس کی بات نہیں تھی جو آخری فیصلہ اس نے کیا وہ بے حد بھیانک تھا اس نے سوچا کہ جو اپنے آپ کو بے انتہا خوبصورت سمجھتے ہیں اور کسی معمولی شکل و صورت والے کو اپنے طنز و نفرت کا شکار بناتے ہیں انہیں سزا ملنی ہی چاہیے یہ دولت جو اسے حاصل ہو گئی ہے یقیناً اس کے لیے ایک آسودہ زندگی مہیا کر سکتی ہے لیکن اس کی آسودگی اسی میں ہے کہ وہ جو اپنے آپ کو بہت خوبصورت سمجھتے ہیں انہیں زندگی سے دور ہو جانا چاہیے تاکہ وہ کسی ہلکی شکل والے کا مذاق نہ اڑا سکیں۔

یہ خیال اس کے ذہن کو سکون دینے کا باعث بنا تھا اور وہ گہری نیند سو گئی تھی۔

دوسری صبح معمول کے مطابق اس نے اپنی اس نئی زندگی کا آغاز کیا کچن میں جا کر دیکھا ظاہر ہے وہاں کھانے پینے کی اشیاء نہیں تھیں یہ اشیاء اسے بازار سے لانی پڑیں گی بہر حال محتاط رویہ ضروری تھا چنانچہ ایک نوکرانی کے روپ میں وہ بازار گئی جو کچھ اس کے اپنے پاس تھا اس سے اس نے پوری سمجھ داری کے ساتھ ایسی اشیاء خریدیں جو وہ کافی دن استعمال کر سکتی تھی اور سامان سے لدی پھندی واپس اپنے گھر میں آ گئی یہاں آنے کے بعد اس نے اپنے لئے ناشتہ وغیرہ تیار کیا۔

تہا لیکن آسودہ زندگی کس قدر دلکش ہوتی ہے نادیہ کے کوارٹر میں کبھی اسے اتنا سکون

نہیں حاصل ہوا تھا طبیعت میں ایک عجیب سی فرحت ابھر رہی تھی جو فیصلہ اس نے کیا تھا وہ اس کے لئے باعث تسلی تھا اب وہ ایک خونی عورت کی طرح اپنے فرائض سرانجام دے گی اور دنیا کو مزہ چکھائے گی اس بات کا کہ وہ انسانوں پر کس طرح طنز کرتے ہیں۔

دو پہر تک وہ ایک بار پھر گھر کے بارے میں دیکھتی اور سوچتی رہی بہت سے کام کرنے تھے بے شک نیچے تہہ خانے میں بہت سارے کرنسی نوٹ موجود تھے لیکن زندگی گزارنے کے لیے مزید بہت کچھ درکار ہوتا ہے اور جو کچھ وہ آگے کی زندگی میں کرنا چاہتی تھی اس کے لیے تو اسے کافی رقم درکار تھی۔ سونے کے وہ حسین مجسمے فروخت کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا لیکن اس سے پہلے اس شخص کو دنیا سے دور ہو جانا چاہیے جس نے ایک بار پھر اس کے خفتہ جذبات کو چھیڑ دیا تھا اور یہ شخص تھا ایاز۔

جو خریداری اس نے اپنے لئے کی تھی دوسرے دن اس نے اس میں کچھ اور اضافے کئے کچھ ایسے لباس بھی خریدے اس نے جو نوکرانی کی حیثیت سے زیادہ اچھے تھے اور پھر تیسرے دن وہ اس سامنے والے گھر میں جا پہنچی جہاں شازیہ نامی عورت رہتی تھی۔

”بہت بڑی عمر ہے تیری رشیدہ میں اس وقت تیرے ہی بارے میں سوچ رہی تھی میں نے سوچا تھا کہ آج جاگنگ پر نکلیں گے ہم لوگ تو میں تیرے دروازے پر جا کر تجھ سے بات کروں گی اور کہوں گی کہ تو میرے بلانے پر بھی میرے پاس کیوں نہیں آئی۔“

”جی بیگم صاب، مالکوں نے مجھے حکم دیا تھا کہ گھر کو بالکل چٹا کر دوں میں گھر ہی میں کام کرتی رہی ہوں اپنے کھانے پینے کے لیے بھی مجھے خریداری کرنی پڑی۔“

”ہاں وہ تو ہے تو یہاں آ جاتی۔ تجھے جو چاہیے تھا میں تیرے لئے منگوا دیتی۔“

”بہت مہربانی بیگم صاحب آپ بہت اچھی ہیں۔“

”تیرا جب بھی دل چاہے یہاں آ جایا کر اور سن برا تو نہیں مانے گی میری بات کا؟“

”نہیں بیگم صاب، آپ حکم کریں۔“

”میں نے تیرے لئے کچھ کپڑے نکالے ہیں جو میرے ہیں اگر تو پہننا چاہے تو وہ کپڑے لے جانا۔“

”مالکوں نے مجھے اچھے خاصے پیسے دیئے تھے بیگم صاب میں نے ان اس سے اپنے

لئے کپڑے بھی خریدے ہیں آپ کے کپڑے قیمتی ہیں بیگم صاب ہم جیسے لوگ یہ کپڑے پہن تو لیتے ہیں پر ہمیں خود بھی شرم آتی ہے مالک نے ہماری جوشکل بنائی ہے بیگم صاب اس میں ہمارا قصور نہیں ہے پر آپ خود کچھ لیجئے دنیا کس طرح ہمارا مذاق اڑاتی ہے۔“

”ایاز کی بات کا برا مان گئی تو۔ ایاز عجیب و غریب فطرت کے مالک ہیں۔ کبھی کبھی تو دوسرے کا دل رکھنے کے لیے ایسی ایسی حرکتیں کرنے لگتے ہیں کہ بس ہنسی ہی آتی ہے اور کبھی سوچے سمجھے بغیر بول جاتے ہیں۔ تو ان کی بات دل سے نکال دے بہت اچھے آدمی ہیں تو کہے گی تو میں ان سے بات کروں گی۔“

”ارے نہیں بیگم صاب جی! آپ نے اتنی بات کہی تو ہم نے بھی منہ کھول دیا۔“

”ٹھیک ہے تو آ جایا کر کبھی کبھی۔“

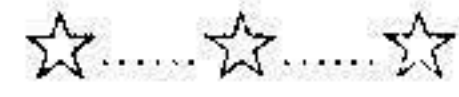
”میں ضرور آؤں گی۔“ تھوڑی دیر بیٹھنے کے بعد وہ شازیہ کے پاس سے اٹھ گئی تھی۔

شازیہ اچھی عورت ہے اسے غم دیتے ہوئے دکھ ہوگا لیکن ایاز کی زندگی اس سے زیادہ دکھ کی بات ہے زندگی اتنے تجربے دے چکی تھی کہ اب وہ انتہائی پختہ کار بن گئی تھی اس دولت مند شخص کی موت اس کے بعد اس شخص کے حاصل کئے ہوئے خزانے پر قبضہ اس سلسلے میں سارے صحیح فیصلے اس کی ذہنی قوتوں کا پتہ دیتے تھے۔

یہ گھر جیسے اس کی شخصیت سے ہم آہنگ تھا تنہا، ویران، بے غور، چند ہی دنوں میں اسے اس گھر سے بڑی انسیت ہو گئی تھی یہ اسے بہت اپنا اپنا لگتا تھا اس نے یہاں اپنی جو حیثیت بنا کر رکھی تھی وہ اس سے بھی مطمئن تھی نئے نئے خیالات اس کے ذہن میں آتے رہتے تھے آئندہ زندگی کیسے گزاری جائے ماں اب اس کے ذہن سے نکل چکی تھی ہاں جب کسی بد نما چیز کا خیال دل میں آتا تو بدلے کے لیے ماں کا تصور ابھرتا تھا اس نے سوچا زندگی ایسے تو نہیں گزر سکتی۔

اس تنہا ویران مکان میں ایک نوکرانی کی حیثیت سے کیسے وقت گزارا جاسکتا ہے پھر کیا کرنا چاہیے کوئی ایسا عمل جس سے زندگی میں کوئی جولانی پیدا ہو مگر کیا اس کے ذہن میں بے شمار خیالات آتے رہتے تھے جب تک کہ اس نے اپنی دہری شخصیت کے بارے میں سوچا ایک زندگی یہ ہے کہ وہ یہاں ایک بد شکل ملازمہ کی حیثیت سے ملتی ہے اور کیسے وہ ایک دولت مند عورت کی حیثیت سے منظر عام پر آئے، ان لوگوں سے انتقام لے لے جا۔

اس کا مذاق اڑاتے ہیں انہیں فنا کر دے صفحہ ہستی سے مٹا دے انہیں، ہاں جلتے ہوئے وجود کو اسی طرح سکون مل سکتا ہے اسی طرح..... یہ ہونا چاہیے کس طرح اس کا ذہن سوچتا رہا۔
ان دنوں کسی سے ملنا جلنا بھی نہیں تھا دو تین بار شاز یہ سے ملنے چلی گئی تھی شاز یہ بہت اچھی عورت تھی شکیلہ نے حالانکہ خود کو ایک ملازمہ کی حیثیت سے اسے متعارف کرایا تھا لیکن وہ اس سے دوستوں کی طرح پیش آتی تھی البتہ ایاز جب بھی کبھی نظر آتا اس پر طنز کئے بغیر نہ رہتا ایسے لمحات میں شکیلہ اسے سفاک نظروں سے دیکھتی اور دل ہی دل میں کہتی کہ تو اپنی زندگی کو جتنا مختصر کر سکتا ہے کر لے۔



کچھ لمحوں کے لئے اس کے بدن میں سنسنی کی ایک لہر اٹھی۔ پھر اس نے فوراً ہی خود کو سنبھال لیا۔ کوئی بھی ہے نمٹنا تو پڑے گا۔ خاموش تو نہیں بیٹھا جاسکتا۔ آہستہ قدموں سے چلتی ہوئی وہ دروازے پر پہنچی۔ پھر اس نے اپنی آواز پر قابو پایا اور بولی۔
”کون ہے؟“

”دروازہ کھولو رشیدہ میں ایاز ہوں۔“ باہر سے آواز آئی۔ اس نے ایاز کی آواز پہچان لی اور پھر دروازہ کھول دیا۔

ایاز جاگنگ کے لباس میں دروازے پر کھڑا تھا۔ شکیلہ کو دیکھ کر مسکرایا اور بولا۔ ”نیل نہیں بجتی تمہارے گھر کی۔“

”نہیں جی، خراب ہے اور پھر یہاں کوئی آتا بھی نہیں ہے، بجے چاہے نہ بجے۔“
”یہ بھی اچھی منطق ہے، اب میں تو آیا ہوں مجھے اندر آنے کو نہیں کہو گی۔“ اس نے پاؤں اچکا کر ایاز کے عقب میں دیکھا تو ایاز جلدی سے بولا۔
”شاز یہ کو تلاش کر رہی ہو؟“

”جی ہاں، بیگم جی آپ کے ساتھ نہیں ہیں۔“
”میکے گئی ہوئی ہیں دو دن سے، بری حالت ہے میری، اکیلا وقت گزار رہا ہوں۔ اکیلے جاگنگ کے لئے بھی جاتا ہوں۔ آج ادھر سے گزرا تو نگاہ تمہارے دروازے کی طرف اٹھ گئی۔ ویسے رشیدہ! بد اخلاقی بری چیز ہوتی ہے۔ تم دروازے سے ہٹ بھی نہیں رہیں تاکہ میں اندر آ جاؤں۔“

”نہیں جی، آئیے جی، صاحب جی، مالک ہیں آپ۔“
 ”کیا فضول باتیں کرتی رہتی ہو مالک ہیں آپ بھلا تم جیسی دلکش لڑکی کا کوئی مالک ہو سکتا ہے۔“ ایاز بے تکلفی سے آگے بڑھتا ہوا بولا اور گھر کے اندرونی حصے میں آ گیا۔ شکلیہ معنی خیز انداز میں مسکراتی ہوئی اس کے پیچھے پیچھے چل رہی تھی، وہ بھی اندر آ گئی۔
 ”اب مجھے بیٹھنے کے لئے کہو۔“
 ”بیٹھ جائیے صاحب جی۔“

”رشیدہ ایک بات کہوں، میری بات کا برا تو نہیں مانو گی۔“
 ”کہہ دیجئے صاحب جی، ہم لوگ ہر اچھی بری بات سننے کی ہمت رکھتے ہیں۔“
 ”ایک تو تم نے نجانے کیوں ہم لوگ ہم لوگ لگا رکھی ہے پہلی بات میں تمہیں یہ بتاؤں رشیدہ کہ میں نے جب بھی تمہیں بد صورت کہا یا تمہارا مذاق اڑایا ہے مجھے بعد میں بہت افسوس ہوا ہے۔ ظاہر ہے تمہیں میری باتیں اچھی نہیں لگی ہوں گی لیکن جو بات میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ بیوی کے سامنے اگر کسی لڑکی کی تعریف کر دی جائے تو سمجھ لو گھر جہنم بن گیا۔ شوہر کی بھی شامت آئی اور اس لڑکی کی بھی جس کی تعریف کی گئی ہے۔ تم ایک نگاہ میں ہی مجھے اچھی لگی تھیں اگر میں تمہاری تعریف کر دیتا تو شاز یہ کبھی تم سے دوستی نہ کرتی۔ یہ ہم مردوں کی چال ہوتی ہے۔ اگر کسی کو بیوی کی نگاہ میں چڑھانا ہو تو بس اسے بد صورت کہہ دیا جائے۔“
 ”صاحب جی میں تو ہوں ہی بد صورت۔“

”وہ اندھے ہیں جو تمہیں بد صورت کہیں گے سمجھیں۔ سانولے رنگ کا اپنا ایک حسن ہوتا ہے اگر تم افریقہ کی عورتوں کو دیکھتیں تو کانوں کو ہاتھ لگا کر توبہ توبہ کرتیں لیکن یقین کرو وہ بھی مقابلہ حسن میں شریک ہوتی ہیں۔ عورت کا اصل حسن اس کی جسمانی دلکشی میں چھپا ہوتا ہے اور تم رشیدہ اپنی مثال آپ ہو۔“

”آپ کیا کہہ رہے ہیں صاب جی، ہماری سمجھ میں بالکل نہیں آ رہا ہمیں تو آج تک لوگ کالی کلوٹی بد شکل اور نجانے کیا کیا نام دیتے رہے ہیں۔ آپ نے بھی اس دن ایسا ہی کہا تھا۔“

”وجہ بتادی تمہیں رشیدہ آج بس ایسے ہی دل چاہا کہ معافی مانگ لوں تم سے اور تمہیں

سمجھا دوں کہ اصل بات وہ نہیں ہے جو میں تم سے کہتا رہا ہوں اصل بات یہ ہے کہ تم بہت ہی دلکش ہو کیا سمجھیں۔“
 شکلیہ کے حلق سے قہقہہ پھوٹتے پھوٹتے رہ گیا۔ اسے نادیدہ کے الفاظ یاد آنے لگے تھے نادیدہ نے اسے ہوشیار کیا تھا اور کہا تھا کہ اگر کبھی کوئی تمہیں یا ہمیں خوب صورت کہتا ہے تو اس کا مقصد ہمیں کچھ لمحوں کے لئے بے وقوف بنانا ہوتا ہے، ایسے لوگوں سے ہمیشہ ہوشیار رہنا شکلیہ، نادیدہ کے یہ الفاظ اس وقت اس کے کانوں میں گونجنے اور اس نے انتہائی نفرت سے سوچا کہ کینے شخص تجھے تو میں ابھی چند لمحوں کے اندر اندر ایسا مزہ چکھا دوں گی کہ تو زندگی بھر یاد رکھے گا۔

”چائے نہیں پلاؤ گی رشیدہ؟“

”کیوں نہیں صاب بنا کر لاتی ہوں۔“ اس نے کہا اور کچن کی جانب چل پڑی۔ کچن میں وہ چائے بنا رہی تھی کہ ایاز کچن میں داخل ہو گیا اور وہ مسکرا کر اسے دیکھنے لگی۔ چائے بنانے کا برتن اس طرح کا تھا کہ اس میں ہینڈل لگا ہوا تھا چائے کا پانی کھول رہا تھا۔ ایاز ایک قدم آگے بڑھتا تو یہ کھولتا پانی اس کے چہرے کو ہمیشہ کے لئے مسخ کر سکتا تھا لیکن نہیں چہرے کے جل جانے سے کیا فرق پڑے گا۔ دل جلے، بات تب مزے کی ہوتی ہے۔ اس کا وجود اس طرح چرما کر رہ جائے کہ جلا ہوا خون قطروں کی شکل میں ٹپکنے لگے۔ پھر اس نے دل میں سوچا کہ ایاز صاحب اس گھر میں آپ کو ہلاک کر کے میں اس گھر کو ناپاک نہیں کروں گی۔ یہ صاف ستھرا اور شفاف رہنا چاہئے۔ وہ ایاز کو دیکھ کر مسکرائی اور بولی۔ ”ارے آپ یہاں کیسے آ گئے صاحب؟“
 ”پھر وہی صاحب، ایاز ہے میرا نام، ایاز کہونا مجھے۔“
 ”نہیں صاحب جی توبہ توبہ ہم یہ گناہ نہیں کر سکتے۔“

”یہ گناہ نہیں ہے رشیدہ، جب کوئی کسی سے پیار کرتا ہے تو وہ چاہتا ہے کہ بے تکلفی بھی ہو۔“

”مگر صاب جی۔“

”ہاں رشیدہ میں اسی دن سے تم سے محبت کرنے لگا ہوں جس دن میں نے تمہیں پہلی بار دیکھا تھا بس تمہاری قربت اختیار کرنے کے لئے میں نے اپنی بیوی کے سامنے تمہیں برا بھلا

کہا تھا۔“

”صاب جی، ہم غریب لوگ ہیں، ہم کیا جانیں محبت و محبت کسے کہتے ہیں اور اور.....“
”میں تمہیں یہی سب کچھ بتانا چاہتا ہوں۔“

”آپ اندر چل کر بیٹھے صاب، ہم چائے لارہے ہیں آپ کے لئے، جائیے اندر جائیے آپ۔“ اس نے کسی قدر سخت لہجے میں کہا۔

ایاز نے ایک نگاہ چاروں طرف ڈالی اور پھر بولا ”ٹھیک ہے میں انتظار کر رہا ہوں۔“
جب وہ چائے لے کر پہنچی تو ایاز خاموش بیٹھا ہوا کچھ سوچ رہا تھا اس نے کہا۔ ”رشیدہ! میں ہمت تو نہیں کر سکتا تم سے کچھ کہنے کی، شازیہ دودن سے گئی ہوئی ہے۔ گھر کی حالت کافی خراب ہے اور کوئی بھی نہیں ہے گھر میں۔ کیا تم تھوڑا سا وقت مجھے دے سکتی ہو۔ میرے گھر آؤ تمہارے لئے کچھ تحفے بھی خرید کر رکھے ہوئے ہیں میں نے۔ وہ بھی تمہیں دینا چاہتا ہوں اور رشیدہ تم آؤ تو سہی.....“

رشیدہ مسکرا دی پھر بولی۔ ”چائے پیجئے صاب جی، آپ حکم دیتے ہیں تو آ جاؤں گی۔ صفائی بھی کر دوں گی۔ تحفوں کی مجھے ضرورت نہیں ہے، بس آپ نے یہی تحفہ کیا کم دے دیا ہے کہ مجھے دلکش کہہ دیا، حالانکہ سچی بات یہ ہے کہ دلکش کے صحیح معنی بھی مجھے معلوم نہیں۔“
”خوبصورت، پرکشش، شازیہ سے کہیں اچھی، رنگ سانولا ہے تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔“

”بہت بہت شکریہ صاب جی۔“ وہ چائے پینے لگا پھر بولا۔ ”کس وقت آؤ گی؟“

”جب آپ حکم کرو جی۔“

”ایسا کرو شازیہ تو ابھی ایک دودن کے بعد آئے گی، جب تک وہ نہیں آتی تم رات میں آ جایا کرو، گھر میں تالا لگا رہنے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ یہاں اس علاقے میں آج تک کبھی چوری نہیں ہوئی۔ چور سمجھتے ہیں کہ ابھی یہاں کیا ہوگا، حالانکہ یہاں اس علاقے میں رشیدہ جیسی پرکشش لڑکی رہتی ہے جس سے ہر شخص محبت کرنا چاہتا ہے تو پھر کب آؤ گی، کھانا میرے ساتھ ہی کھا لینا۔“

”ارے نہیں صاب جی اتنی عزت نہ دو ہمیں ہم رات کو آ جائیں گے آٹھ بجے، پر صاب

جی کون کون ہوگا آپ کے گھر میں۔“

”کوئی نہیں رشیدہ کوئی نہیں، بس میں ہوں گا۔ میں تمہارا انتظار کروں گا کیا سمجھیں۔“

”ٹھیک ہے صاب جی، ہم آ کر صفائی ستھرائی کر دیں گے۔“ اس نے کہا۔

ایاز تھوڑی دیر وہاں بیٹھا اور اس کے بعد چلا گیا، شکیلہ ساکت و جامد ایک ستون سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی۔ ذلیل، کمینہ مجھ سے کھیلنا چاہتا ہے مجھے ایک بے وقوف نوکرانی سمجھتا ہے۔ ٹھیک ہے بد بخت شخص تو نے خود ہی اپنے لئے صحیح راستے کا انتخاب کر لیا ہے۔ اس کے بعد وہ انتظام کرنے لگی۔ ایک ایسا لباس جو آسانی سے ضائع کیا جاسکے ایک ایسی جگہ منتخب کی اس نے جہاں اپنے ارادوں کی تکمیل کے بعد وہ اس لباس کو جلا کر خاکستر کر سکے اور اس کی راکھ اس طرح ضائع کرے کہ اس کا کوئی نام و نشان نہ ملے۔ گھر کے نیچے سے گٹر لائن بہتی تھی۔ اس گٹر لائن کے مین ہول کا ڈھکن ہٹا کر جلی ہوئی راکھ اس میں ڈال کر ضائع کی جاسکتی تھی اور پھر مزید کچھ ضرورتیں بھی پوری کرنے کے لئے اس نے صحیح جگہ منتخب کر لی۔ اس کے بعد وہ چھری نکالی جو بظاہر باورچی خانے کے استعمال کی تھی لیکن اس قدر شاندار کہ کسی کے بدن سے گزر جائے اور اسے کئی لمحوں تک پتہ بھی نہ لگنے دے کہ کیا ہو گیا۔ یہ محفوظ چھری اس نے اپنے لباس میں اس طرح رکھی کہ خود اس کے جسم کو متاثر نہ کر سکے اور اس کے بعد وہ وقت کا انتظار کرنے لگی۔

ایک پیشہ ور اور کرائے کا قاتل بھی اپنے آپ کو اس قدر محتاط نہیں رکھتا ہوگا جس طرح اس نے اپنے آپ کو محتاط رکھا تھا۔ اس چھری کے علاوہ اس کے لباس میں اور کوئی ایسی چیز نہیں تھی جو بعد میں اس کی نشاندہی کر سکے۔ انتہائی ذہانت کے ساتھ اس نے اس لباس کا بھی انتخاب کیا تھا اور ایسا لباس پہنا تھا جس میں بٹن تک نہیں تھے۔ مبادہ کوئی چھینا جھپٹی ہو اور اس کے علم میں آئے بغیر کوئی بٹن ٹوٹ کر گر پڑے یا ایاز کی مٹھی میں رہ جائے اس طرح کے سارے انتظامات اس نے کر لئے تھے اپنے بالوں کو بھی اس نے اس طرح خوبصورتی اور مضبوطی سے باندھا تھا کہ اس کے بال کسی کی گرفت میں نہ آسکیں۔ اپنے طور پر اس نے ان لمحات کو اچھی طرح دیکھا تھا جو آنے والے تھے۔

پھر مقررہ وقت پر وہ گھر سے باہر نکلی۔ گھر کے دروازے کو تالا لگایا وہی تالا جو چپک جاتا تھا اور بغیر چابی کے یوں لگتا تھا جیسے بند ہو اس کے بعد وہ گھر کے پچھلے حصے کی طرف گئی دوز دور

تک دیکھا۔ یہ اس علاقے کی خوبی تھی کہ یہاں مکانات بہت دور دور تھے۔ بے شک ان میں رات کے وقت روشنیاں جل اٹھتی تھیں اور صبح بات یہ ہے کہ اسی وقت اس علاقے میں زندگی کا احساس بھی ہوتا تھا ورنہ سارا دن بے رونق چھائی رہتی تھی۔

ایک محتاط انداز اختیار کرتے ہوئے وہ کافی دور تک پیچھے گئی۔ پھر لمبا چکر کاٹ کر ایاز کے مکان کی جانب بڑھنے لگی۔ ایک طویل فاصلہ اختیار کر لیا تھا اس نے اور اس کے بعد وہ ایاز کے گھر کے قریب پہنچی۔ محتاط نگاہوں سے چاروں طرف دیکھا کہ آس پاس کہیں کوئی اتفاقیہ طور پر موجود تو نہیں ہے۔ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔

اس نے ایاز کے دروازے کی بیل بھی اس طرح بجائی کہ انگلی پر دوپٹہ لپیٹ لیا تھا۔ تب اس نے بیل پر انگلی رکھی۔ ایاز جیسے اس کا منتظر ہی تھا۔ ایک لمحے کے اندر اندر دروازہ کھل گیا اور ایاز نے اسے کلائی سے پکڑ کر اندر کھینچ لیا۔

”ارے ارے صاب جی، آ تو رہی ہوں۔“

”کتنی بے چینی سے میں تمہارا انتظار کر رہا تھا۔ سمجھیں، تمہیں کیا معلوم؟“ ایاز جذباتی لہجے میں بولا۔

”ارے صاب جی، ایسی بھی کیا پریشانی، آنا تو تھا مجھے، چلے آپ مجھے سمجھا دیجئے، کہاں کہاں جھاڑو لگانی ہے۔“

”تم آؤ تو سہی، آج تم میری معزز مہمان ہو، جھاڑو لگانے صفائی کرنے کا کام کل کر دینا، پرسوں کر دینا، جہاں دو دن سے کمروں کی صفائی نہیں ہوئی وہیں تیسرا دن بھی لگ جائے گا۔ میں نے تو تمہیں کھانے کی دعوت دی تھی نا۔“

”نہیں صاب جی، آپ ہمیں معاف کر دینا، ہم کھانا پینا کہیں نہیں کھاتے۔“

”کیسی باتیں کر رہی ہو، تم اس وقت کسی گھر کی نوکرائی نہیں ہو، دوست ہو میری آؤ تو سہی۔“

وہ ایک لمحے تک سوچتی رہی اور اس کے بعد ایاز کے بیڈروم کی جانب چل پڑی۔

”یہ ہوئی نابات دوستوں کو دوست رہنا ہی چاہئے آؤ بیٹھو۔“ ایاز خود مسہری پر بیٹھ گیا۔

”آؤ ادھر ہی آ جاؤ۔“

”نہیں صاحب جی ہم زمین پر بیٹھنے والوں میں سے ہیں۔“

”آج تم میرے دل میں بیٹھو گی سمجھیں۔“

”صاب جی آپ کی باتیں بڑی عجیب ہوتی ہیں۔ ہمیں ہماری اوقات بھلائے دیتی ہیں۔“

”یہی تو میں تم سے کہتا ہوں، تمہاری اوقات جو کچھ ہے میں جانتا ہوں، دوسرے لوگ تمہیں کچھ بھی کہیں مگر رشیدہ میں..... میں تو تمہیں.....“

”جی صاحب جی آپ کی آنکھیں بہت خوبصورت ہیں، آپ بہت پیارے لگ رہے ہیں۔“

”واقعی.....“

”لیٹ جائیے آپ، آنکھیں بند کر لیجئے۔“

”ارے ارے کیوں.....“

”اب جب آپ نے ہمیں عزت دی ہے تو ہماری بھی تھوڑی سی بات مان لیجئے۔ ہم آپ کو دیکھنا چاہتے ہیں آپ کی آنکھیں کھلی ہوں گی تو ہم آپ کو دیکھ نہیں سکیں گے۔“

”واہ کمال کی ہو بھئی، اپنے جذبوں کا اظہار معصومیت ہی سے سہی لیکن کر خوب لیتی ہو، چلو ٹھیک ہے تمہارے حکم کی تعمیل کی جاتی ہے۔“ ایاز نے کہا اور مسہری پر سیدھا سیدھا لیٹ گیا۔ وہ اس کے قریب آ کھڑی ہوئی، چھری کے نزدیک اس کا ہاتھ موجود تھا۔ چند لمحے وہ ایاز کو دیکھتی رہی پھر بولی ”صاب جی، آپ نے تو ہمیں شروع میں بد صورت کہا تھا۔“

”بتاؤ دیا تھا رشیدہ کہ اس کی وجہ شاز یہ تھی۔“

”صاب جی، آنکھیں بند کرئیے۔“

”لو بند کر لیں، عجیب خواہش ہے تمہاری۔“

”چھپ کر دیکھ لیں آپ کو.....؟“

”بیٹھونا، جیسے دل چاہے دیکھو، کون منع کرتا ہے۔“ ایاز نے یہ کہہ کر آنکھیں بند کر لیں۔

پلک جھپکتے میں تیز دھار چھری باہر نکل آئی، ایاز کی آنکھیں بند تھیں اور شکیلہ کا چہرہ خوفناک سے خوفناک تر ہوتا جا رہا تھا اور اس کے بعد چھری ایک لمحے کے لئے روشنی میں چمکی اور

اس کے بعد اس طرح ایاز کے زخروں پر پھر گئی کہ واقعی ایک لمحے کو اسے احساس بھی نہ ہو سکا کہ کیا ہوا ہے لیکن پھر خون بھل بھل کر کے بہنے لگا اور ایاز کی آنکھیں دہشت سے کھل گئیں۔

شکیلہ اچھل کر پیچھے ہٹ گئی تھی۔ پھر بھی اچھلتے ہوئے خون کی کچھ دھاریں اس کے لباس پر پڑ گئی تھیں۔ خون آلود چہری سے ابھی خون ٹپک رہا تھا، ایاز کا پورا بدن پھڑپھڑانے لگا۔ وہ جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا لیکن گردن ایک دم پیچھے لٹک گئی، وہ صرف پچھلے حصے سے کھال سے جڑی ہوئی تھی ورنہ زرخہ اس طرح کٹ گیا تھا جیسے بکری ذبح ہوتی ہے وہ بری طرح کپکپا رہا تھا اور خون اسی تیزی سے اس کے بدن سے بہتا جا رہا تھا حلق سے زرخہاٹ کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں، اچانک ہی وہ مسہری سے نیچے اتر آیا اور دونوں ہاتھ سیدھے کر کے آگے بڑھنے لگا۔

پورے بدن پر تشنہ طاری تھا۔ طاقتور جسم کا مالک تھا، آگے بڑھا تو ایک دیوار سے ٹکرایا وہاں سے پیچھے ہٹا تو مسہری سے ٹکرا کر اوندھے منہ مسہری پر گر پڑا۔ گردن بالکل پیچھے لٹکی ہوئی تھی بس تھوڑی سی کھال باقی رہ گئی تھی۔ ان جنبشوں سے خون نکلنے کی رفتار بہت تیز ہو گئی تھی۔ پورا کمرہ جیسے خون کا دریا بن گیا تھا، شکیلہ ہر اس جگہ سے بچ رہی تھی جہاں اس کے لباس یا چہرے پر خون آنے کی توقع ہو۔ ایاز کا جسم اب آخری جھٹکے لے رہا تھا۔ ایاز کٹی ہوئی گردن کے ساتھ ادھر ادھر بھاگا تھا آخر کار اس نے دم توڑ دیا۔

”اگر میں بد صورت ہوں تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔ دل تو میرے سینے میں بھی ہے۔ جب تم لوگ میرا مذاق اڑاتے ہو تو وہ بھی اسی طرح دکھتا ہے جس طرح تمہیں کسی بات پر تکلیف ہوتی ہے۔ بالکل ٹھیک کرتی ہوں میں تمہارے ساتھ۔“ اس نے ایک جھرجھری لی اور سنبھل گئی۔

سب سے پہلے اس نے یہ جائزہ لیا کہ کہیں کسی جگہ اس کا پاؤں ایاز کے جسم سے نکلنے والے خون پر تو نہیں پڑ گیا۔ اس کے جوتے کا کوئی نشان تو فرش پر نہیں بن گیا۔ جوتوں کے تلے بالکل صاف تھے۔ ایک بار پھر اس نے کمرے پر نگاہ ڈالی۔ کوئی کمزور دل والا اگر اس وقت کمرے کا منظر اور ایاز کی بھیاں لاش دیکھ لیتا تو دہشت سے حواس ہی کھو بیٹھتا لیکن شکیلہ بالکل نارمل تھی۔ اس کی آنکھیں شیشے کی گولیوں کی طرح چمک رہی تھیں اور ان میں بھوکی بلیوں جیسی کیفیت تھی۔

پھر وہ کمرے سے باہر نکل آئی۔ ایک ایک قدم احتیاط سے اٹھاتی ہوئی آخر کار گھر کے

دروازے سے باہر آ گئی اور پھر خوب لمبا چکر کاٹ کر آخر کار اپنے گھر میں داخل ہو گئی۔ سارے انتظامات کر کے گئی تھی۔ خون آلود لباس اتار کر دوسرے کپڑے پہنے پھر بڑی احتیاط سے یہ لباس نذر آتش کیا جب وہ پوری طرح راکھ بن گیا تو اخبار پر یہ راکھ اٹھائی اور گٹر کا ڈھکن کھول کر اس میں ڈال دی۔ جس جگہ آگ جلی تھی وہاں نشان پڑ گیا تھا چالیس منٹ تک وہ اس جگہ کو صاف کرتی رہی۔ یہاں اس نے کوئی نشان نہیں چھوڑا تھا۔ اس کے بعد اسی مکمل احتیاط کے ساتھ اس نے چہری کو ٹھکانے لگایا۔

ان تمام کاموں سے فراغت حاصل کر کے وہ بستر پر پہنچی تھی بستر پر لیٹ کر وہ اپنی کیفیت کا جائزہ لینے لگی۔ اسے احساس ہوا کہ اس کے سارے وجود میں ایک تازگی پیدا ہو گئی ہے جیسے کوئی بہت ہی خوشی والا کام ہوا ہو۔ یہ کیفیت اس نے اس وقت بھی محسوس کی تھی جب پہلی بار ہسپتال میں اس شخص کو دم گھونٹ کر مارا تھا جس نے اس کا مذاق اڑایا تھا تب اسے اپنی ماں یاد آئی اور اس کے منہ سے نکلا۔

”ہائے..... تو میرے ہاتھ سے نکل گئی ماں۔ تو خوش نصیب تھی کہ پوری زندگی مجھ سے نفرت کرتی رہی اور میرے ہاتھوں سے زندہ بچ گئی۔ آہ کاش اس وقت میں اس حد تک پختہ کار ہو گئی ہوتی۔ اگر یہ سب میں تیرے ساتھ کر لیتی تو شاید آسودہ ہو جاتی اور پھر دوسروں سے مجھے یہ سلوک نہ کرنا پڑتا۔ لوگ کہتے ہیں دنیا گول ہے۔ کاش اس گول لٹو پر گھومتی ہوئی تو میری نگاہوں کے سامنے آ جائے۔ کاش..... خیر کوئی بات نہیں ہے۔ ابھی بہت سے ایسے ہوں گے جو مجھے ذہنی آسودگی دیں گے..... بہت سے..... وہ سونے کی کوشش کرنے لگی اور اسے آسانی سے نیند آ گئی۔

آنکھ اس وقت کھلی جب کوئی زور زور سے دروازہ پیٹ رہا تھا۔ اس نے چندھیائی ہوئی آنکھوں سے ماحول کا جائزہ لیا۔ رات کو کام کرتے ہوئے خاصی دیر ہو گئی تھی۔ اس وقت دن کے پونے گیارہ بج رہے تھے۔ کچھ لمحے تو اسے ماحول کا اندازہ نہ ہو سکا پھر گزرے واقعات یاد کر کے وہ فوراً اٹھ کر بیٹھ گئی۔

کون ہو سکتا ہے۔ اس نے سوچا اور پوری طرح سنبھل کر دروازے پر پہنچ گئی۔ ”کون ہے؟“ اس نے کہا۔

”پولیس..... دروازہ کھولو۔“ اسے ایک کرخت آواز سنائی دی اور وہ مزید ہنسل گئی۔
رات ہی کو بہت دیر تک سوچا تھا اور ایسے لمحے کے لئے خود کو تیار کر لیا تھا۔ اس نے چہرے پر
خوف کے آثار پیدا کر لئے۔
”اندر کون کون ہے۔“

”پپ پتہ نہیں صاب جی۔ کیا بات ہے کوئی ہے کیا۔“ اس نے خوفزدہ انداز میں پیچھے
ہٹ کر کہا۔ ایک ایس آئی کچھ کانٹیلوں کے ساتھ اندر آ گیا۔ پھر اس نے کانٹیلوں سے کہا
”تلاشی لو“

کانٹیل گھر میں گھس گئے۔ ایس آئی نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔
”کیا نام ہے تمہارا؟“

”رشیدہ جی، کیا بات ہے۔“ اس نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔

”تمہارے ساتھ اور کون رہتا ہے۔“

”کوئی بھی نہیں صاب جی۔“

”اکیلی رہتی ہو یہاں۔“

”ہاں جی۔“

”یہ تمہارا گھر ہے؟“ ایس آئی نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

”ہاں جی، نہیں جی۔“

”کیا ہاں جی اور نہیں جی۔“

”گھر تو مالکوں کا ہے مائی باپ ہم نوکر ہیں۔“

”مالک کہاں ہیں۔“

”پردیس میں سرکار۔“

پولیس والے تلاشی لے کر آ گئے۔ ”نہیں سر جی کوئی نہیں ہے یہاں کچھ ملا بھی نہیں

ہے۔“

”کیا نام ہے تمہارا لڑکی۔“ ایس آئی نے پوچھا۔

”رشیدہ مائی باپ۔“

”بے وقوف کی بیٹی، یہاں کون تیری مائی اور کون تیرا باپ ہے۔ بکے جا رہی ہے مائی
باپ، مائی باپ، میں تجھے اپنا باپ لگ رہا ہوں۔“

”نن..... نہیں مائی باپ۔ مم..... مم..... صاحب جی سرکار جی۔“

”رشیدہ کب سے یہاں رہتی ہو۔“

”بہت دن سے صاب جی۔“

”پڑوسیوں سے میل ملاقات ہے۔“

”نہیں سر جی، یہاں پڑوسی ہے ہی کہاں۔“

”جتنے بھی گھر ہیں یہاں لوگ ایک دوسرے سے ملتے تو ہوں گے۔“

مالک مالکوں سے ملتے ہوں گے صاب جی، نوکروں سے کون ملتا ہے۔ وہ سامنے والے

گھر میں ایک بی بی جی رہتی ہیں۔ شام کو وہ صاب جی کے ساتھ بھاگتی ہیں تو ہم سلام کر لیتے
ہیں۔“

”اوہو، کیا نام ہے ان صاحب جی کا؟“ ایس آئی اس سے تفتیش کرتا رہا۔

اس نے اپنے آپ کو ایک بے وقوف نوکرانی ثابت کر کے ان لوگوں کو ذرا بھی شبہ نہ
ہونے دیا اور پولیس چلی گئی۔ پھر دوبارہ اس سلسلے میں اس سے کوئی رابطہ نہیں کیا گیا۔ شاز یہ بھی
دوبارہ اس گھر میں واپس نہیں آئی تھی۔ دل میں اس نے سوچا تھا کہ شاز یہ مجھے تمہارے تنہا رہ
جانے پر افسوس ہے لیکن ایاز جیسے بوالہوسوں کو کیفر کردار تک پہنچانا ضروری ہے جو انسانیت کے
نام پر دھبہ ہوتے ہیں۔ یہ کسی کی دل آزاری کرنے میں کوئی مشکل نہیں محسوس کرتے اور اپنی
مذموم خواہشوں کی تکمیل کے لئے سب کچھ کرنے پر تیار ہوتے ہیں۔ کاش میں اس طرح کے
کچھ اور لوگوں کو فنا کے گھاٹ اتار سکوں۔

بہت دن اسی بیزاری کے عالم میں گزر گئے۔ وہ سوچتی رہی۔ کبھی کبھی وہ تہہ خانے میں
بھی اتر جاتی اور گھنٹوں ہیرے جواہرات کے اس انبار کو دیکھتی رہتی جو تقدیر گر تھا لیکن بیکار پڑا
ہوا تھا۔

کیا اسے یونہی ضائع ہونے دیا جائے۔ کیا میں اس خزانے کے ساتھ اسی طرح اپنی
زندگی ختم کر لوں۔ کچھ دن پہلے اس نے کچھ منصوبے بنائے تھے لیکن پھر سہولت کا شکار ہو گئی تھی۔

”ام تمہارے مالک کو بات کرنا مانگتا۔“

”آپ کون ہیں میڈم؟“

”بے وقوف کا بچہ میڈم کس کو بولتا ہے، ہم مین ہے۔“

”سس..... سوری سوری سر، آپ کی آواز.....“

”تم آواز دیکھتا ہے کہ ہمارا کام کرتا ہے، تمہارا صاب کو بولو تھائی لینڈ سے مسٹر ڈو آیا ہے

براڈ ڈو۔“

”آپ ایک منٹ ہولڈ کیجئے مسٹر ڈو، میں اپنی فرم کے مالک سے بات کراتا ہوں۔“

دوسری طرف سے کہا گیا پھر اس کے بعد ایک آواز سنائی دی۔ ”ہیلو، مسٹر ڈو میں بول رہا ہوں،

میرا نام زیارت شاہ ہے۔“

”مسٹر شاہ، موبائل پر ایسا بات کرنا زیادہ اچھا نہیں ہے، پر آپ بے فکر رہو، میں نے

موبائل ادھر خریدا اور اس کا بارے میں کسی کو کچھ معلوم نہیں ہوئیں گا، میں آپ سے شارٹ بات

کرتا ہے، میں تھائی لینڈ سے آیا ہے اور ایک سر پرانز لایا ہے، مہاتما بدھ کا مجسمہ جس کا ویٹ

سولہ پونڈ ہے اور جس میں ہنڈ ریڈ اینڈ فنی کیرٹس کا جیول لگا ہوا ہے، ایک مجسمے میں تیرہ جیول

ہے، میں اس کو سیل کرنا مانگتا، میں اس مجسمے کا پولور اینڈ پکچر آپ کو سینڈ کر سکتا ہے، ابھی اس کا پکچر

دیکھو اور پھر اگر مناسب سمجھو تو میرے کو بات کرو۔“

”مسٹر ڈو! یہ کوئی فراڈ تو نہیں ہے؟“

”ابھی دیکھو، ہم برا اس لئے نہیں مانے گا کہ ایسا کام میں ایسا بات سوچنے کو مانگتا ہے،

یہ فراڈ نہیں ہے، ہم آپ سے کیش ڈیل کرے گا، آپ اس بات کو لائیک نہیں کرے گا تو ہم

کدھر اور ٹرائی کریں گا۔“

”تصویر مجھے کب بھیج رہے ہیں آپ؟“

”کل مل جائیں گا آپ کو۔“

”اور اس کے بعد میرا آپ سے رابطہ کیسے ہوگا؟“

”کل رات کو نو بجے ہم آپ کو پھر ٹرائی کرے گا اوکے۔“

”اوکے۔“ شکلیہ نے فون بند کر دیا اور پھر بہت دیر تک ہنستی رہی۔ اب اسے ان حرکتوں

وہ خود کو ان منصوبوں کی تکمیل کے لئے تیار کرنے لگی۔ کتنی ہی بار اس کے دل میں خیال آیا کہ نادیدہ کو اپنے پاس بلا لے۔ کم از کم یہ خوفناک تنہائی تو دور ہوگی لیکن نہ جانے کیوں یہ بات اس کے ذہن میں جم کر رہ گئی تھی کہ راز اسی وقت تک راز ہے جب تک اپنے سینے میں ہے۔ باہر کی ضمانت کون لے سکتا ہے۔

اپنی دہری شخصیت کی تکمیل کے لئے آخر کار اس نے عمل کا آغاز کر دیا۔ کرنسی کے انبار اس کے پاس تھے لیکن جو سونا اور جواہرات اس کے پاس پڑے تھے ان کو بھی آہستہ آہستہ کرنسی میں تبدیل کرنا ضروری تھا۔ چنانچہ بہت غور و خوض کر کے اس نے گھر سے باہر قدم نکال دیا۔ سب سے پہلے کچھ خریداری کی اس کے بعد کچھ سامان سمیت ایک ہوٹل پہنچ گئی اور اسے آسانی سے ایک کمرہ حاصل ہو گیا۔ حالانکہ اس طرح کے اقدامات کبھی نہیں کئے تھے لیکن ہمت سے کام لے رہی تھی۔ ہوٹل میں اس نے اپنے لائے ہوئے لباس استعمال کئے جو بوڑھی عورتوں جیسے تھے۔ اس سے اس کی شخصیت کافی تبدیل ہو گئی تھی۔ پھر تقریباً ایک ماہ تک وہ ہوٹل نشیمن میں رہی۔ بہت کم باہر نکلتی تھی اور جب باہر نکلتی تو چال ڈھال بھی تبدیل کر لیتی اس طرح اس نے کبھی کسی کو اپنی طرف متوجہ نہیں پایا تھا۔

اس ایک ماہ کے دوران اس نے صرف ایک ہی کام کیا تھا وہ یہ کہ مختلف کتابیں پڑھتی رہی تھی۔ یہ کتابیں جرائم پر مبنی تھیں اور ان میں بڑے گر کی باتیں اسے حاصل ہوئی تھیں۔ طبیعت میں سفاکی تو تھی ہی جرم کرنے کے بے شمار طریقے اسے آگئے تھے اور وہ مزید پختہ کار ہو گئی تھی پھر اس نے اپنے مقصد کی تکمیل کے لئے مطلوبہ افراد تلاش کرنے شروع کر دیئے۔ کئی موبائل فون خریدے جن میں ایک بھی ایسا نہیں تھا جو اس کی نشاندہی کر سکے۔ کیمرے اور ایسی ہی کچھ چیزیں جو اس کے مقصد میں معاون ہوں۔

پھر کافی دن کے بعد وہ ایک رات دوبارہ اسی گھر میں داخل ہوئی۔ تہہ خانے میں جا کر اس نے خزانوں کے صندوق کھولے بدھ کے مجسموں کی کئی تصویریں بنائیں۔ یہ تصویریں اس نے پولور اینڈ کیمرے سے بنائی تھیں۔ تصویروں سے مطمئن ہو کر وہ باہر نکل آئی۔ ہوٹل اس کے لئے بہترین پناہ گاہ تھا۔ دوسرے دن سے اس نے اپنی معلومات کے مطابق کام شروع کر دیا۔ پہلی ہی کوشش بڑی کارآمد محسوس ہوئی تھی۔ اس نے ایک بہت بڑے جیولرز کو فون کیا تھا۔

میں لطف ا رہا تھا، نقدیر ہی شاید اس بارے میں اس کا ساتھ دے رہی تھی۔

پہلی ہی کوشش میں اسے کامیابی حاصل ہوگئی۔ تصویر بھیجی گئی۔ زیارت شاہ نے بہت زیادہ دلچسپی کا اظہار کیا اور ڈیل ہوگئی۔ بڑی چالاکی سے مجسمہ زیارت شاہ کے حوالے کیا گیا اور کیش شکیلہ نے حاصل کیا۔ یہ بہت بڑی رقم اس نے اسی تہہ خانے میں منتقل کردی۔ زیارت شاہ سے یہ بھی کہا گیا تھا کہ مزید اسی طرح کے مجسمے اگر وہ چاہے تو اسے دیئے جاسکتے ہیں۔ اس نے کچھ عرصے کی مہلت مانگ لی تھی اور کہا تھا کہ اتنی بڑی خریداری کے لئے اسے رقم کا بندوبست کرنا ہوگا، البتہ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ مسٹر ڈاس وقت تک کسی اور سے ان مجسموں کی ڈیل نہ کریں جب تک کہ وہ خود یہ نہ کہہ دے کہ اب وہ مجسمے نہیں خرید سکتا۔

نجانے کہاں سے ایک معمولی سی لڑکی کے ذہن میں اس قدر ذہانتیں بھر گئی تھیں۔

شکیلہ کو ایک اور کردار مسٹر ڈاس کا مل گیا تھا اور اس طرح سے اس نے اپنی شخصیت کو بھی چھپا لیا تھا اور اپنا کام بھی کرتی جا رہی تھی۔ حاصل شدہ رقومات سے اسے بڑی آسانی ہوگئی تھی اور اس کے بعد اس نے شہر کے ایک پوش علاقے میں ایک خوبصورت گھر خریدا تھا اور اسے بہت عمدگی کے ساتھ ڈیکوریٹ کر لیا تھا۔ یہاں اس نے کچھ ملازم بھی رکھے تھے اور اس کے بعد وہ ان ملازموں کے درمیان آگئی تھی اور اس نئے گھر میں اس کا نیا نام مسز عالیہ شاہ تھا۔

چہرہ مہرہ تو نہیں بدل سکتی تھی لیکن حلیہ اپنی بساط بھر بدلا تھا۔ قیمتی ساڑھیاں، بہت ہی سادگی کا انداز، اس نے اپنے آپ کو آئینے میں دیکھا تو خود بھی کافی حد تک مطمئن ہوگئی۔ بہت مشکل سے لوگ اسے ان دونوں حیثیتوں میں پہچان سکتے تھے۔ نادیہ اسے ضرور پہچان لیتی بس اور ایسا کوئی نہیں تھا جو اس پر یہ شک کر سکتا کہ وہ شکیلہ یا رشیدہ ہے۔

بہر حال گھر کے ملازموں کی تعداد بھی مختصر ہی تھی اور ان کے ساتھ وہ بہت ہی محتاط رویہ اختیار کئے ہوئے تھی۔ کسی کی مجال نہیں تھی کہ اس کے آگے اس کی مرضی کے خلاف ایک لفظ بھی بول جائے۔ دیکھنے کے انداز ہی سے وہ ملازموں کو مرعوب کر لیا کرتی تھی۔ اس کے باوجود اس کا رویہ ان کے ساتھ نرم رہتا تھا۔

پھر کافی سوچ بچار کے بعد اس نے اخبار میں ایک ہاؤس کیپر کے لئے اشتہار دیا اور بہت سی خواتین انٹرویو کے لئے آگئیں۔ ان میں نوخیز اور نوجوان لڑکیاں بھی تھیں اور پینتیس اور

چالیس کے درمیان کی عورتیں بھی۔ انہی میں سے اس نے ایک خاتون کا انتخاب کیا جس کی عمر چھتیس سینتیس سال کے قریب تھی۔ وہ نہایت زیرک اور معاملہ فہم تھی۔ شکل و صورت درمیانہ، تعلیم اچھی خاصی تھی اور نام شیدا تھا۔ شیدا مسیح کو اس نے ملازمت دے دی، اس کا اپنا چھوٹا سا خاندان تھا لیکن وہ اس خاندان سے بالکل الگ تھلگ رہنے لگی۔ شکیلہ نے اس پر اپنا مافی الضمیر ظاہر کیا۔

”عدنان شاہ ساؤتھ افریقہ میں اپنا کاروبار کرتے تھے، ان کا انتقال ہو گیا۔ میرے لئے وہاں کچھ نہیں تھا میں نے زندگی کا ایک حصہ یہاں اپنے وطن میں گزارا تھا اور یہاں کی زندگی مجھے بہت پسند تھی لیکن دوسروں کے لئے ملک سے باہر جانا پڑ گیا اور وہ بھی زیادہ عرصے میرے ساتھ نہ رہ سکے، چنانچہ میں سب کچھ چھوڑ کر اپنے اثاثے فرخت کر کے یہاں آ گئی۔ بہت عرصے ملک سے باہر رہی ہوں شیدا، یہاں کی بہت سی روایات بھول گئی ہوں۔ ساؤتھ افریقہ میں میرے مشاغل وہاں جیسے تھے، میں یہاں وہ مشاغل اختیار نہیں کرنا چاہتی لیکن پھر بھی میری خواہش ہے کہ اعلیٰ طبقے سے روشناس ہوں اور ان کے درمیان زندگی گزاروں۔“

”میڈم! اس سلسلے میں آپ مجھے جو حکم دیں گی میں آپ کی مدد کروں گی۔“

”یقیناً تم یہاں کے کلبوں وغیرہ سے واقف ہوگی۔“

”بہت اچھی طرح، گو براہ راست میرا ان سے کوئی تعلق نہیں ہے لیکن چونکہ میں آپ جیسے کرم فرماؤں کے ساتھ وقت گزارتی رہی ہوں، اس لئے معاشرے کے ہر پہلو سے روشناس ہوں۔“

”ٹھیک ہے، اب تم میری مدد کروگی۔ میں سادگی سے زندگی بسر کرنے کی عادی ہوں، لیکن پھر بھی میری خواہش ہے کہ تم مقامی ماحول میں میرا پورا پورا ساتھ دو۔“

”ایسا ہی ہوگا میڈم۔“ اور واقعی شیدا اس کی بہترین معاون ثابت ہوئی۔ اس نے ایک بالکل ہی اجنبی رخ اختیار کیا اور مقامی ماحول میں اپنے آپ کو ضم کرنے لگی۔ یہ ایک بہترین مشغلہ تھا لیکن اس کی فطرت میں جو سفاکی پیدا ہوگئی تھی وہ اسے بے چین رکھتی تھی۔ نجانے کیوں، فطرت میں اب یہ بات رچ بس گئی تھی کہ ان لوگوں کی زندگیوں سے کھیلنا ہی اپنی زندگی کی ضمانت ہے جو اپنے آپ کو حسین سمجھتے ہیں اور جنہوں نے اس سے اس کا مقام چھین لیا ہے۔

کئی کلبوں میں اب اس کا آنا جانا ہو گیا تھا اور کچھ شناسائیاں بھی ہونے لگی تھیں۔
مسز عالیہ شاہ اب لوگوں میں مقبولیت حاصل کرنے لگی تھی۔ خاص طور سے این ایم کلب
میں اسے کافی وقعت حاصل ہو گئی تھی اور کسی جگہ کوئی حیثیت حاصل کرنے کے لئے دولت
کے سوا اور کوئی چیز کارآمد نہیں ہوتی ایک شام کلب کے کچھ معززین نے کلب کے ایک بڑے
پروگرام کے انعقاد کے لئے فنڈز کی ضرورت کا اعلان کیا۔ ان میں سے ایک نے کہا۔ ”این ایم
کلب کی بہت سی خصوصیات ہیں لیکن اس کی روایات میں ایک بات بڑی اہمیت کی حامل ہے کہ
اس کے تمام ممبر ایک دوسرے سے الگ نہیں رہتے بلکہ ایک خاندان کی حیثیت سے رہتے ہیں،
کوئی نیا ممبر آئے تو وہ بھی بہت مختصر وقت میں اپنے آپ کو اپنے عزیزوں جیسے لوگوں کے
درمیان محسوس کرتا ہے۔ بہر حال کلب کے ایک پروگرام کے سلسلے میں ہمیں ایک بڑا فنڈ درکار
ہے۔ میں چاہتا ہوں اس سلسلے میں ہم آپس میں طے کر لیں کہ کس کس کو کیا کرنا ہے۔“
”کتنا فنڈ درکار ہوگا؟“ کسی نے سوال کیا۔

”جو اسٹیٹ کیا گیا ہے وہ بیس لاکھ بنتا ہے۔“ جواب دیا گیا اور چاروں طرف سے
احتجاجی بڑبڑاہٹیں بلند ہو گئیں۔ اناؤنس کرنے والے نے کہا ”جو کچھ ہوگا آپ کے مشوروں
سے ہی ہوگا اگر ہم یہ فنڈ مہیا نہ کر پائے تو پروگرام ملتوی کر دیا جائے گا یا اسے مختصر کر دیا جائے
گا۔“

اسی وقت شکیلہ نے شیلہ کے کان میں کچھ کہا اور شیلہ کھڑی ہو کر بولی۔ ”میں کچھ کہنا چاہتی
ہوں۔“

لوگ اس کی طرف متوجہ ہوئے تو شیلہ بولی۔

”آپ کے کلب کی نئی ممبر مسز عالیہ شاہ، میری مالکہ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں ان کی
طرف سے کلب کے لئے بیس لاکھ روپے پیش کرنے کا اعلان کر دوں۔ یہ رقم کلب کی انتظامیہ
کل دن میں ان سے حاصل کر سکتی ہے۔“

ایک بار پھر بڑبڑاہٹیں ابھریں لوگ گردنیں اونچی کر کے مسز عالیہ شاہ کو دیکھنے لگے۔
کلب کے وہ ممبر اپنی جگہ سے اٹھ کر شکیلہ کے پاس آ گئے۔

”آپ نے بہت بڑی ذمہ داری اپنے شانوں پر لے لی میڈم، آپ پسند کریں تو ہم

لوگ بھی آپ کے ساتھ شیر کر سکتے ہیں۔“
”اگر کبھی کوئی بڑا کام ہو تو آپ لوگ ضرور اس میں شیر کر لیجئے گا، بیس لاکھ روپے کی
معمولی سی رقم کے لئے ہم کلب کے ممبران سے بھیک نہیں مانگنا چاہتے۔“ شکیلہ نے بڑے
پروکار لہجے میں کہا۔

اس بات کی جس قدر اہمیت ہو سکتی تھی ہوئی شکیلہ نے دوسرے ہی دن بیس لاکھ روپے
نقد انتظامیہ کے حوالے کر دیئے۔ یہ رقم واقعی اس کے لئے کوئی حیثیت نہیں رکھتی تھی لیکن اس سے
اسے جو پذیرائی حاصل ہوئی وہ بے مثال تھی۔ اس کا کلب آنا جاری رہا، صرف این ایم ہی نہیں
بلکہ دوسرے کئی کلبوں میں بھی اس نے ممبر شپ لے لی تھی۔ تھوڑے ہی عرصے میں اسے بڑی
شہرت حاصل ہو گئی، این ایم کلب کا جو پروگرام ہوا اس میں اسے مہمان خصوصی کے طور پر بلایا
گیا لیکن اس نے معذرت کر لی اور کہا کہ اس کا ظرف اسے اجازت نہیں دیتا کہ ایک چھوٹے
سے کام کے بدلے میں اسے اس قدر پذیرائی دی جائے۔ کلب کی کسی اور معزز شخصیت کو مہمان
خصوصی بنایا جائے۔

دوسری درخواست اس نے یہ کی کہ اس کی کوئی تصویر نہ بنائی جائے اور اس کے لئے اس
نے بڑے واضح الفاظ میں کہا۔ ”ابتداء ہی سے مجھے اپنی تصویر بنوانے سے نفرت رہی ہے اور اس
کی بنیادی وجہ میرا خیال ہے آپ کو بتانا ضروری نہیں ہے کیونکہ آپ سب یہ بات جانتے ہیں
پھر بھی میں آپ سے کھلے دل سے کہوں گی کہ میں ایک بد شکل عورت ہوں، بچپن ہی سے مجھے
اپنی بد صورتی کا احساس ہے، میں نے ہر جگہ اپنی بد صورتی کی وجہ سے اپنے آپ کو احساس کمتری
کا شکار محسوس کیا ہے اور میں کبھی اپنی تصویر نہیں بنواتی۔ آپ لوگوں کو شاید یہ سن کر ہنسی آئے کہ
میں کبھی آئینہ نہیں دیکھتی۔ میری یہ گورنس مس شیلہ جو میرے بال وغیرہ سنوار لیا کرتی ہے یا
میرے اس بد شکل چہرے پہ کچھ لیپ پوت دیتی ہے۔ آپ اس سے پوچھ سکتے ہیں کہ میں
آئینے کے سامنے نہیں بیٹھتی۔“

کلب کے ممبر بہت زیادہ متاثر ہوئے تھے۔

ان میں سے بہت سے ممبروں نے شکیلہ سے کہا۔

”مسز عالیہ شاہ! آپ ایسی بات کہہ کر ہمیں دکھی نہ کریں، اصل چیز تو دل کا نور ہوتا ہے،

آپ جس قدر مہربان اور حقیقت پسند خاتون ہیں ہم اس کی دل سے عزت کرتے ہیں۔“
”آپ کا شکریہ ادا کرتی ہوں میں۔ میری آرزو ہے کہ جب بھی میرے لائق کوئی خدمت ہو آپ مجھے ضرور بتا دیا کریں۔ مجھے نام و نمود سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔“

بہر حال ایسی کسی شخصیت کو جو مقام مل سکتا تھا کلب نے اسے وہ مقام دیا لیکن ایک بدنصیب کی بد نصیبی رنگ لائی۔ اس کا نام اشعر اقبال تھا۔ وہ ایک صنعت کار تھا۔ بڑی بات یہ تھی کہ انتہائی سمارٹ اور خوبصورت تھا۔ شکیلہ نے کئی بار اسے لڑکیوں کے درمیان گھرے ہوئے دیکھا تھا جب بھی وہ کلب میں داخل ہوتا ہر طرف سے اس کے لئے آوازیں بلند ہونے لگتیں۔ پھر وہ جس میز پر بھی بیٹھتا لڑکیوں کا حلقہ اس کے گرد رہتا۔ اس وقت بھی دو تین لڑکیاں اس کے آس پاس موجود تھیں اور اتفاق سے مرکز نگاہ شکیلہ بن گئی تھی۔ وہ اس کی طرف اشارے کر کر کے کچھ کہہ رہی تھیں، ہنس رہی تھیں، مسکرا رہی تھیں اور پھر شکیلہ نے اشعر اقبال کو بھی مسکراتے ہوئے دیکھا۔ جرأت کر کے وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور اس کے قریب پہنچ گئی۔

”معافی چاہتی ہوں لگ رہا ہے آپ لوگ میرے بارے میں کچھ باتیں کر رہے ہیں۔“
ایک لڑکی نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”ہاں میڈم، ہم آپ کی عمر کا تذکرہ کر رہے تھے، آپ نے اپنے آپ کو جو بھی رنگ دیا ہے وہ اس لئے مناسب ہے کہ اگر آپ کوئی نوخیز حسینہ بننے کی کوشش کرتیں تب بھی اس میں آپ کو کوئی کامیابی حاصل نہ ہو پاتی کیونکہ آپ کی شکل و صورت آپ کا راستہ روک دیتی۔ ہم تبصرے کر رہے تھے آپ کی عمر پر ویسے تو خواتین اپنی عمر کبھی نہیں بتاتیں لیکن کیا آپ اپنی عمر بتانا پسند کریں گی۔“

”میں حیران اس بات پر ہوں کہ میں تم لوگوں کے لئے دلچسپی کا باعث کیسے بن گئی؟“
”نہیں ایسی بات نہیں ہے۔ یہ اشعر اقبال ہیں شاید آپ انہیں جانتی ہیں۔ بہت ہی منفرد طبیعت اور مزاج کے مالک ہیں۔ آپ کبھی ان کا گھر دیکھیں، خوبصورت چیزوں سے بھرا ہوا ہے، کوئی ایک بدنما چیز آپ کو ان کے ہاں نظر نہیں آئے گی اور یہی کیفیت یہاں پر ہے۔ اشعر کہہ رہے تھے کہ کلب کا ایک قانون ہونا چاہئے۔ کم از کم یہاں داخلہ محفوظ کر دیا جائے۔ اچھی شکلوں کا ہونا ضروری ہے، بعض شکلیں ایسی ہوتی ہیں جنہیں دیکھ کر خواہ مخواہ طبیعت پر تکدر طاری ہو جاتا ہے۔“

”ہاں یہ بات تو ہے، کیوں اشعر صاحب؟“
”بس یہ بے وقوف لڑکیاں، فضول بول جاتی ہیں، بہت سی باتیں انسان کے اندر ہوتی ہیں اور اندر ہی رہنی چاہئیں، سوری میڈم! آپ پلیز آرام سے بیٹھئے، اپنی جگہ، ہاں ہو سکے تو رخ بدل لیجئے گا، یہ مجھ پر احسان ہوگا۔“

شکیلہ خوشدلی سے مسکرائی اور بولی ”میں رخ بدل لوں گی آپ بے فکر رہیں۔“ وہ وہاں سے واپس چلی آئی۔ کرسی پر بیٹھ کر اس نے مسکراتے ہوئے سوچا کہ واقعی مسٹر اشعر اقبال میں خود بھی بڑی پیاس محسوس کر رہی تھی۔ ایک شکار درکار تھا مجھے، آپ کی مہربانی کہ آپ نے میری یہ مشکل حل کر دی اور پھر اس کے بعد تو مشغلہ حاصل ہو گیا تھا۔ موقع کا انتظار ضرور تھا اور اسے موقع مل گیا۔

اشعر اقبال تین چار دن تک کلب نہیں آیا کئی لڑکیاں اس کے لئے اداس تھیں۔ اس دن جن لڑکیوں سے ملاقات ہوئی ان میں سے ایک لڑکی ملی تو اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔
”آپ کے دوست آج کل کلب نہیں آ رہے خیریت سے تو ہیں۔“

”اشعر بہت بڑی مصیبت میں گرفتار ہو گیا ہے۔“ لڑکی نے اداس لہجے میں کہا۔
”ارے کیا ہوا خیریت؟“

”وہ ایک تاجر ہے، کوئی بڑا کام کیا تھا اس نے، اس میں اسے ڈیڑھ کروڑ روپے کا نقصان ہو گیا۔ اس وقت وہ یہ رقم ادا کرنے کے قابل نہیں ہے، جس کمپنی کا نقصان ہوا ہے اس نے نوٹس دے دیا ہے کہ ایک ہفتے کے اندر اندر رقم کا بندوبست نہ ہوا تو قانونی کارروائی کی جائے گی۔ اشعر کی ایک گڈول ہے، ایک ساکھ ہے۔ اگر اس کے خلاف کوئی ایسی قانونی کارروائی ہوگئی تو ڈوب جائے گا بے چارہ۔“

وہ یہ سن کر سوچ میں ڈوب گئی، ایسے کسی شکار کو ختم کرنے کے لئے کیا اتنی بڑی رقم کا نقصان برداشت کیا جاسکتا ہے، تب اس نے سوچا کہ اس کی زندگی کا مقصد ہی کیا ہے سب لوگ اس کی بد صورتی سے متاثر ہو کر اس سے نفرت کرنے لگتے ہیں۔ اس کے پاس دولت تو بے پناہ ہے کہاں لے جائے گی۔ چنانچہ اس نے کلب کے دوسرے ذرائع سے اشعر کے گھر کے بارے میں معلومات حاصل کیں اور آخر کار ایک دن وہ تنہا اس کی کونٹھی جا پہنچی۔

اس کے ملازموں نے اسے اشعراقبال کے کمرے میں پہنچا دیا اور اشعراقبال اسے دیکھ کر ایک عجیب سی کیفیت کا شکار ہو گیا۔

”گھر آئے ہوئے مہمان کو نکالا نہیں جاسکتا لیکن احتجاج ضرور کیا جاسکتا ہے کہ بن بلائے مہمان یہاں تک کیسے پہنچ گئے۔“

”بس مسٹر اشعراقبال مجبوری تھی، بات اصل میں یہ ہے کہ کچھ لوگ کسی سے کسی وجہ سے نفرت کرنے لگتے ہیں لیکن جن سے نفرت کی جاتی ہے ان کے سینے میں بھی دل ہوتا ہے وہ کسی نفرت کرنے والے سے محبت بھی تو کر سکتے ہیں، میں اس بات کو بہت مختصر کروں گی۔ اتفاق کی بات یہ ہے کہ آپ کئی دن سے کلب نہیں آرہے تھے۔ مجھے معلوم ہوا تو میں نے معلومات حاصل کیں اور پتہ چلا کہ آپ اس وقت کسی مالی پریشانی کا شکار ہیں، آپ صرف ڈیڑھ کروڑ روپے کی وجہ سے مشکل میں پڑے ہوئے ہیں۔“

”محترمہ! آپ کا روبرو یہ نہیں ہیں، ڈیڑھ کروڑ کو صرف کہنا ایک نا تجربہ کار خاتون کے لئے تو بڑی بات ہے لیکن ہم جیسے صنعتکاروں سے پوچھئے کہ کبھی کبھی بہت چھوٹی سی رقم کس قدر اہمیت کی حامل بن جاتی ہے۔“

”میں نے کہا نا کہ آپ میری یہاں آمد کو سخت ناگوار محسوس کر رہے ہیں مسٹر اشعرا اس لئے بات مختصر کر رہی ہوں، اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ گھر کے دروازے سے یہاں تک میں نے جو کچھ دیکھا ہے اس سے آپ کے اعلیٰ ذوق کا پتہ چلتا ہے لیکن خیر کبھی کبھی گلاب کے پھولوں میں لگے ہوئے بد نما کانٹوں کو بھی قبول کرنا پڑ جاتا ہے، یہ ایک چیک ہے ڈیڑھ کروڑ روپے کا، میں یہ حقیر سا نذرانہ انسان دوستی کے نام لے کر حاضر ہوئی ہوں، آپ بہر حال کلب کی ایک معزز شخصیت ہیں۔ آپ اس کا تذکرہ کسی سے نہ کیجئے گا۔ میں بھی نہیں کروں گی۔ یہ رقم بینک سے ڈرا کر کے آپ اپنی مشکل حل کر لیجئے اور اگر مزید ضرورت پڑے تو براہ کرم مجھے ٹیلی فون پر بتا دیجئے۔ یہ میرا فون نمبر ہے۔ کلب میں آپ اس کا تذکرہ کسی سے نہ کریں، چلتی ہوں۔“

وہ اشعراقبال کو دنگ چھوڑ کر آگئی، دانہ ڈال دیا گیا تھا دوسرے دن اشعراقبال خود اس کی میز پر پہنچ گیا۔ لوگوں نے حیرت سے ان دونوں کو دیکھا تھا، اشعراقبال نے تمام نگاہوں کو

نظر انداز کر دیا تھا۔

”مجھے یقین نہیں تھا کہ آپ کا وہ چیک کیش ہو جائے گا۔“

”خدا کے لئے اشعرا صاحب یہاں کلب میں آ کر اس کا بالکل تذکرہ نہ کریں۔“

”میں اپنی بہت سی باتوں پر بے حد شرمندہ ہوں۔“

”کوئی بات نہیں ہے، میں نے آپ کی کسی بات کو محسوس نہیں کیا۔“

”مجھے یہ بتائیے کہ میں اپنی غلطیوں کا ازالہ کیسے کروں؟“

”بالکل نہیں، اس کی ضرورت نہیں ہے۔“

”کیا آپ کل دوپہر کو میرے ساتھ لنچ کر سکتی ہیں؟“

”اشعرا صاحب عجیب سا لگتا ہے۔ آپ نے مجھے کرسی کا رخ بدل کر بیٹھنے کی ہدایت کی

تھی۔ کیا آپ میرے ساتھ ڈاننگ ٹیبل پر بیٹھ سکیں گے۔“

”میں چاہتا ہوں کہ آپ اس قدر سخت الفاظ استعمال کریں میرے لئے کہ مجھے اپنی

نادانی پر سکون مل جائے۔ آپ پلیز کل دوپہر کو میرے ساتھ کھانا کھائیے۔“

”کہاں؟“

”میرے گھر پر۔“

”میں ایک بجے پہنچ جاؤں گی۔“

دوسرے دن ایک بجے اشعراقبال نے اپنے خوبصورت بنگے کے گیٹ پر اس کا استقبال

کیا اور وہ مسکراتی ہوئی اس کے ساتھ اندر چلی گئی تھی۔

”واقعی آپ نے اپنے گھر کو حسن کی مورت بنا رکھا ہے۔“

”اب ایک بات کہوں، میں ان ساری کیاریوں کو اکھاڑ پھینکوں گا، یہاں خوشنما پھولوں

کی جگہ تھوہر کے درخت اگاؤں گا تاکہ اپنی اس غلطی کا ازالہ کر سکوں۔“

جواب میں وہ ہنس پڑی پھر بولی۔ ”اشعرا صاحب برا نہ مانئے گا۔ یہ تبدیلی آپ میں

صرف اس لئے رونما ہوئی ہے کہ میں نے ایک چھوٹی سی رقم آپ کے سامنے پیش کر دی تھی۔“

”یہ بات نہیں ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ اس وقت آپ نے میری عزت بچالی ہے

لیکن اچانک ہی مجھے یہ احساس ہوا ہے کہ بعض اوقات ہم جن چیزوں کو بد نما سمجھتے ہیں وہ اندر

”تانیہ کون؟“

”اس کی نئی دوست جس کا آپ کو بھی علم نہیں ہے۔ اس نے تانیہ سے شادی کا وعدہ کیا ہے۔“

”تمہیں کیسے معلوم؟“

”وہی میں آپ کو بتانا چاہتی ہوں۔“ لڑکی نے ایک جدید ساخت کا موبائل فون نکال لیا اور بولی۔ ”میں نے ان دونوں کی مووی بنالی ہے۔“ اس نے کہا اور موبائل فون آن کر کے اس کے سامنے رکھ دیا۔

شکیلہ نے ایک خوبصورت لڑکی کو اشعر کے ساتھ دیکھا۔ دونوں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ موبائل فون پر بہترین ساؤنڈ کے ساتھ اشعر کی آواز ابھری۔

سے خوشنما ہوتے ہیں صرف دیکھنے والی نگاہ کا فرق ہوتا ہے۔“

”جو صرف ایک چھوٹی سی رقم کے عوض دور ہو جاتا ہے۔“

”میں یہی چاہتا ہوں کہ آپ مجھے اسی طرح برا بھلا کہیں۔“

”ارے نہیں سوری، بس کہہ دیا۔۔۔۔۔“

اشعر نے بہترین انتظامات کئے تھے وہ اس کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھا رہا تھا۔

شکیلہ اب اکثر اشعر کے گھر چلی جاتی تھی۔

بات ذرا سی الجھ گئی تھی وہ اس سے دور رہ کر اس سے اپنی توہین کا انتقام لینا چاہتی تھی لیکن اشعر زیادہ ہی جذباتی ہو گیا تھا۔ کلب میں وہ سیدھا اسی کے پاس آتا تھا اور اسی کے ساتھ بیٹھا رہتا تھا۔

پھر ایک دن اس نے کلب ہی میں کہا۔ ”مسز عالیہ شاہ! مجھے علم ہے کہ آپ کے شوہر کا انتقال ہو گیا ہے اور اس کو کافی عرصہ بھی گزر گیا کیا میں آپ سے شادی کی درخواست کر سکتا ہوں۔“

عالیہ کے پورے بدن میں سنسناء ہٹ ہونے لگی، اندر سے ایک ایسا طوفان اٹھا کہ اس کا دل و دماغ تہہ و بالا ہو گیا۔

یہ الفاظ کتنے عجیب لگتے ہیں کسی کے منہ سے سن کر لیکن اس نے اپنے آپ کو سنبھالا ذرا سی دیر میں جذبات کے دھارے رخ بدل لیں گے یہ شخص صرف ممنون کرم ہے اور کوئی بات نہیں ہے، بہر حال اس نے کوئی جواب نہیں دیا لیکن اس کی کئی راتیں بے سکون ہو گئی تھیں۔ ہاں ان راتوں کو سکون اس وقت ملا جب نیلم نامی لڑکی نے جو اشعر اقبال کے ساتھ ہمیشہ چسکی رہا کرتی تھی۔ ایک دن اس سے کہا ”اشعر اقبال نے آپ کو شادی کی آفر کی ہے نا۔“

وہ سنجیدہ نگاہوں سے اس لڑکی کو دیکھنے لگی، پھر بولی ”ہاں۔۔۔۔۔ لیکن تم کیا کہنا چاہتی ہو؟“

”آپ اس سے شادی کریں گی؟“

”میں کیا کروں گی، یہ تمہیں کیوں بتاؤں؟“

”اس لئے کہ وہ آپ سے مخلص نہیں ہے۔ وہ کسی سے بھی مخلص نہیں ہے۔ وہ تانیہ سے

بھی شادی نہیں کرے گا۔“

باوجود میری مدد کی اس بات کا تم یقین کر لو کہ اس نے مجھ سے اپنی عنایت کا کوئی صلہ نہیں مانگا تھا، بے لوث بے غرض اتنی بڑی رقم مجھے دے دی اور بڑی لاپرواہی سے کہا کہ اسے اس رقم کی واپسی کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ براست ماننا میری جگہ کوئی بھی ہوتا تو اس سے متاثر ہو جاتا، اس کے حسن سے نہیں اس کے عمل سے، میں نے دل میں سوچا کہ یہ تو بہت زبردست کام ہو رہا ہے۔ اگر یہ عورت میرے چنگل میں پھنس جائے تو میں ایک بہت بڑا آدمی بن سکتا ہوں۔ سچ جانو میں اس سے شادی صرف اس لئے کر رہا ہوں کہ اس کی دولت میرے قبضے میں آ جائے، میں فطرتاً مجرم نہیں ہوں لیکن یہ مجرمانہ خیال میرے ذہن میں جڑ پکڑ چکا ہے کہ اس سے شادی کرنے کے بعد کچھ وقت میں اس کے ساتھ گزاروں پھر اسے ملک سے باہر لے جاؤں اور کسی مناسب جگہ اسے لے جا کر قتل کر دوں، لیکن کیا تم یقین کر دو گی کہ میں نے یہ بھی سوچا تھا کہ ملک سے باہر جاتے ہوئے تم بھی میرے ساتھ جاؤ گی، کیونکہ میں تمہارے بغیر بھی نہیں رہ سکتا۔ تم میری اس بات پر یقین کر لو کہ اس وقت میری آنکھیں بے نور ہوتی ہیں جب میں اس کے سامنے ہوتا ہوں، ایک طریقہ ایجاد کیا ہے میں نے، میں نگاہ اٹھا کر اسے نہیں دیکھتا اور کبھی اتفاقاً طور پر اگر میری نظر اس کے چہرے پر پڑ بھی جاتی ہے تو اس کی وجہ صرف یہ ہوتی ہے کہ میں اپنے ان الفاظ پر اس کا رد عمل جاننا چاہتا ہوں جو میں اس سے کہہ چکا ہوتا ہوں، اس سے زیادہ اگر مجھ سے کچھ اور کہلوانا چاہتی ہو تو مجھے بتا دو، میں اس بد شکل عورت سے اسی طرح نفرت کرتا ہوں جس طرح میں نے زندگی بھر بد نما چیزوں سے نفرت کی ہے، میری جان اپنے اشعر کو کچھ دن کے لیے کرائے پر دے دو، تم سمجھو کہ تم نے اشعر کی زندگی بنانے کے لیے اس کے ساتھ ایک تعاون کیا ہے، میں اس سے بہت جلد پیچھا چھڑالوں گا اور اس کے بعد تمہارے سوا میری زندگی میں اور کچھ نہیں ہوگا۔ بس اس کی دولت میرے قبضے میں آ جانے دو۔“ موبائل پر ریکارڈ کی ہوئی آواز بند ہو گئی۔ موبائل سے بنائی ہوئی مووی میں اشعر اور تانیہ نظر آ رہے تھے۔

صرف چند لمحوں کے لیے شکیلہ کے چہرے پر سنجیدگی طاری رہی، اس کے بعد اس نے موبائل اٹھا کر دیکھا اور دلچسپی سے بولی۔ ”یار کمال کی چیزیں ایجاد کر لی ہیں، ایجادات کرنے والوں نے کمپیوٹر، انٹرنیٹ، موبائل اور اس کے بعد اس میں یہ سارے آپشن کمال ہے، واقعی کمال ہے۔“

☆.....☆.....☆

”یار میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ کسی نے تمہارے کان بھر دیئے ہیں۔“

”تمہارے بارے میں بہت سی کہانیاں سن چکی ہوں اشعر، میں تمہیں ایک آفر کرنا چاہتی ہوں۔“ تانیہ نے کہا۔

”کیسی آفر؟“

”دیکھو، میں تمہاری محبت میں بہت آگے بڑھ گئی ہوں اور تم یہ بھی جانتے ہو کہ میں اس ماحول کی لڑکی ہو کر بھی برے کردار کی نہیں، اشعر تم بے شک عالیہ شاہ سے شادی کر لو، لیکن خدا کے لیے مجھے بھی اپنے قدموں میں پڑا رہنے دینا، میں بہت خوفزدہ ہو گئی ہوں۔ اشعر میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکوں گی۔“

”اوتانیہ تم بہت بے وقوف لڑکی ہو، مجھے ایک بات کا جواب دو، کب سے میرے تمہارے تعلقات ہیں، تم میری فطرت نہیں جانتیں، اس وقت جب میں کچھ بھی نہیں تھا، اس وقت بھی یقین کر لو کہ حسن پرستی میری فطرت میں شامل تھی۔ میں کسی بھی بدنما شے کو برداشت نہیں کر سکتا تھا، میں حسن کا شیدائی تھا۔ میرے پاس بعض اوقات کچھ بھی نہیں ہوتا تھا، میں اعلیٰ سے اعلیٰ پر فیوم استعمال کرتا تھا۔ بد صورتی کو تو میں برداشت ہی نہیں کر سکتا، لیکن تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میں کس طرح عالیہ شاہ کی جانب متوجہ ہوا۔ تانیہ میں نے اس کا مذاق اڑایا تھا، مذاق کیا اڑایا تھا بس یہ سمجھو کہ جو کچھ ذہن میں تھا، میں نے اسے کہنے میں وقت نہیں محسوس کی تھی اور سب کچھ کہہ دیا تھا، لیکن کم از کم ایک بات کا میں دل سے اعتراف کرتا ہوں بڑی فراخ دل اور نرم فطرت عورت ہے، ہر بات کو برداشت کرنا جانتی ہے۔ اس نے میرے ان الفاظ کے

”آپ موبائل اور کمپیوٹر کی تعریف کر رہی ہیں میڈم، کیا ان باتوں پر آپ نے کوئی توجہ نہیں دی۔“

نیلیم نے کہا۔

”کیوں توجہ نہیں دی بھئی، میرے قتل کی باتیں ہو رہی ہیں اور میں توجہ نہیں دوں گی۔“

”میں آپ کو صرف یہ بتانا چاہتی ہوں کہ زندگی بچائیے اس بے ایمان شخص سے، اپنی دولت بچائیے اس سے، اس نے مجھ سے بہت کچھ کہا تھا۔ تانیہ بے موت ماری جائے گی، مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے، میں جانتی ہوں کہ مجھ سے پہلے بھی وہ بہت سی لڑکیوں سے فلرٹ کر چکا ہے لیکن آپ کو تو وہ قتل کرنے کے درپے ہے، اس کے بعد وہ کچھ اور آگے بڑھے گا، اس کی ہمتیں تو بڑھتی ہی چلی جا رہی ہیں، میڈم! میں نے آپ کے لیے یہ کام کیا ہے۔“

”ہاں میں اس کے لیے تمہاری ممنون ہوں، کیا ایک کام اور کر سکتی ہو؟“

”جی فرمائیے!“

”یہ فون مجھے دے دو مجھے اس کی ضرورت ہے۔ میں تمہیں اس کی قیمت اپنی مرضی سے ادا کروں گی۔ تم نے یہ دس ہزار کا لیا ہوگا، پندرہ ہزار کا لیا ہوگا۔ لیکن اس میں جو مودی ہے اس کی قیمت کم از کم ایک لاکھ سمجھتی ہوں۔ پلیز یہ رقم رکھ لو اس پر اعتراض مت کرنا۔“

”ایک لاکھ روپے کی رقم شاید نیلیم کے لیے ناقابل یقین تھی اور خاص طور سے اس وقت جب وہ اسے فوراً ہی مل بھی گئی اس نے تعرض نہیں کیا تھا اور موبائل خاموشی سے شکلیہ کے حوالے کر دیا تھا۔

اپنے بیڈروم میں شکلیہ بہت دیر تک بستر پر لیٹی مسکراتی رہی تھی، اس نے کئی بار موبائل فون پر وہ مودی دیکھی تھی اور ان کے درمیان ہونے والی گفتگو سنی تھی، اس کے بعد اس نے کہا۔ ”کم بخت دل کھول کر بے عزتی کرتے ہیں میری، ان کے لیے تو میں کوئی بددعا بھی نہیں کر سکتی، ارے بے وقوف ایک انسان کا دل رکھتی ہوں اپنے سینے میں، اپنی شکل و صورت میں نے خود تو نہیں بنائی، میں بھی قدرت کی تخلیق ہوں اور صرف میں ہی کیا، اس دنیا میں کیا بد صورتوں کی تعداد کم ہے، آہ کاش! تم میں سے کوئی ایک مجھے ایسا مل جاتا جو مجھے اس بد صورتی کا ذمہ دار قرار نہ دیتا تو یقین کرو میں اس حد تک نہ پہنچتی، تمہی سب کھینچ کھانچ کر مجھے یہاں تک لے

آئے ہو۔ بہت افسوس کی بات ہے اور اب جب تم نے میرے خلاف ایک محاذ بنایا ہے تو میں بھی مرنا نہیں چاہتی، ٹھیک ہے جناب اب اپنی زندگی کی فکر کیجئے۔

نہ جانے شکلیہ کے ذہن میں یہ ذہانتیں کہاں سے آگئی تھیں۔ ویسے بھی جب انسان مجرم بن جاتا ہے تو مجرمانہ عمل میں اس کے ذہن کی برق رفتاریاں بھی بڑھ جاتی ہیں۔ بے شک شکلیہ کے ذہن میں اشعر کے لیے نفرت کا زہر اسی وقت بھر گیا تھا جب اس نے پہلی بار اس کے ساتھ بدتمیزی کا سلوک کیا تھا۔ انہی لوگوں کی مانند جو شکلیہ کی درندگی کو بھڑکا دیتے تھے اور اس کے بعد موت کی آغوش میں سو جاتے تھے، لیکن شکلیہ جو کام بھی کرتی تھی جلد بازی میں نہیں بلکہ پوری ذہانت سے کرتی تھی اور اب بھی وہ انتظار کر رہی تھی، اس دوران اشعر اقبال سے مسلسل ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ وہ ٹیلی فون بھی کرتا رہتا تھا اور جب بھی ملاقات ہوتی وہ اپنے جذبات کا اظہار کرتا اور کہتا ”عالیہ! میں شاعر نہیں ہوں شعر و شاعری بالکل بھی نہیں کر سکتا، لیکن جذبات کے اظہار کے لیے اشعار کا سہارا لینا ضروری تو نہیں ہوتا، میں صرف ایک بات کہتا ہوں کہ جب انسان کی نگاہ میں کسی کا کوئی مقام بن جاتا ہے تو پھر محبوب کے سوا زندگی میں کچھ باقی نہیں رہتا، میرا دل چاہتا ہے کہ جس طرح بھی ممکن ہو میرے اور تمہارے درمیان فاصلوں کی یہ دیوار لمحوں میں ختم ہو جائے۔“

ہاں اشعر، زندگی انسان کو زندہ رہنے کے لیے جتنا بھی موقع دے۔“ شکلیہ نے گول مول الفاظ میں کہا اور اشعر ان الفاظ کا مطلب سوچتا رہا جو اس کی سمجھ میں بالکل نہیں آیا تھا۔

پھر اس دن شکلیہ نے اسے صبح ہی صبح فون کیا تھا۔ ”کمال کی بات ہے، اسے کہتے ہیں دل سے دل کا راستہ، صرف ایک لمحے قبل میں تمہارے بارے میں سوچ رہا تھا، اپنے بیڈروم میں تھا کہ بادلوں کی گڑگڑاہٹ نے متوجہ کر دیا، باہر جھانک کر دیکھا تو موسم تاریک ہو رہا تھا، لیکن یہ تاریکیاں روشنی سے کہیں زیادہ خوبصورت ہوتی ہیں، میں نے سوچا کہ بادلوں کی یہ گرج تمہارے بغیر بالکل بیکار ہے، اگر آسمان سے پھوار برس پڑی تو بے چینی آسمان تک پہنچ جائے گی۔“

”لیجئے جناب اس کے بعد بھی شاعری کی کوئی گنجائش ہے۔“

”آنا چاہتا ہوں۔“

”فون میں نے اس لئے کیا ہے کہ میں شام تک مصروف ہوں، ہاں رات کا کھانا میرے ساتھ کھانا نہ بھولے گا۔“

”بہت بہتر، جیسا آپ کا حکم۔“ شکیلہ نے فون بند کر دیا تھا۔

پھر وہ دیر تک خاموش بیٹھی رہی تھی، شیلہ کی آمد نے ہی اسے چونکا دیا تھا۔

”بارش شروع ہو گئی ہے میڈم۔“

اس نے غم آلود نظروں سے شیلہ کو دیکھا اور بولی۔ ”تو پھر۔“

”نہیں، بس ایسے ہی میں نے سوچا آپ اندر بیٹھی ہیں۔ آپ کو شاید بارش کا پتہ نہیں ہے۔ ویسے میڈم گستاخی کی معافی چاہتی ہوں۔ آپ نے خود کو اپنی عمر سے بہت آگے بڑھالیا ہے۔“

”کیا کروں شیلہ؟“

”میڈم، آپ ایک دولت مند خاتون ہیں، مجھے معاف کیجئے گا دولت تو نہ جانے انسان کو کیا سے کیا بنا دیتی ہے، آپ نے اپنے آپ پر اتنے خول چڑھائے ہیں، ورنہ آپ اتنی غیر دلچسپ بھی نہیں ہیں لیکن میں سمجھتی ہوں اب آپ ایک صحیح قدم اٹھا رہی ہیں، شادی کے بعد آپ بہت کچھ بھول جائیں گی۔ میڈم! میں آپ کی خوشی میں دل سے خوش ہوں۔“

”آؤ شیلہ بیٹھ جاؤ۔“

شیلہ اس سے تھوڑے فاصلے پر بیٹھ گئی تھی۔

”کبھی کبھی شیلہ ایک معمولی سی غلطی انسان کی دشمن بن جاتی ہے۔ تم نے میری غمگساری کی ہے میرے دل کے چھالے پھوڑ دیئے ہیں۔ موسم کا حوالہ دے کر، میری عمر اور میری شخصیت کا حوالہ دے کر، تم بہت اچھی عورت ہو۔ بڑی خدمات سرانجام دی ہیں تم نے۔ آؤ آج میں تمہیں اپنے بارے میں کچھ تفصیل بتاؤں۔ شیلہ! میں ایک درمیانے گھرانے کی لڑکی تھی۔ میری ماں بہت خوبصورت تھی اور میرا باپ ایک بد صورت انسان، شیلہ، میری ماں میرے باپ سے نفرت کرتی تھی اور جب میں پیدا ہوئی تو اس نے اپنی نفرتوں کا سیلاب میری جانب موڑ دیا۔ تم یقین کرو میں ماں کے لمس کو نہیں جانتی اور پھر جیسے جیسے میری عمر بڑھتی گئی، میری ماں مجھ پر اپنی نفرتوں کا اظہار کرتی رہی اور میں عجیب سی بے بسی کا شکار ہو گئی، باپ البتہ مجھ سے محبت کرتا تھا،

لیکن وہ اس دنیا میں زیادہ وقت نہ رہ سکا، ماں کی نفرتوں کی آغوش میں وقت گزرتا رہا یہاں تک کہ ماں کو اپنا ایک دیرینہ محبوب مل گیا۔

اس نے اس سے شادی کر لی اور اس کے ساتھ کینیڈا چلی گئی، جاتے ہوئے اس نے اپنا وہ مکان بھی بیچ دیا جو میرے لئے واحد چھت تھا، بحالت مجبوری مجھے اپنی ایک دوست کے ساتھ رہنا پڑا۔ وہ ایک ہسپتال میں نرس تھی، نادیہ تھا اس کا نام، پھر میں نے بھی نرس کی نوکری کر لی، وہیں پر مجھے ایک بوڑھا شخص ملا جو انتہائی دولت مند آدمی تھا، اس نے مجھے اپنی دولت کے بارے میں بتایا اور میں نے اسے ہلاک کر کے اس کی دولت پر قبضہ کر لیا، کسی کو قتل کر دینا میرے لئے کوئی مشکل کام نہیں۔ اس دوران میں کئی ایسے لوگوں کو زندگی سے محروم کر چکی تھی جو میرا مذاق اڑاتے یا مجھے میری بد صورتی کا طعنہ دیتے۔ اس قدر پک گئی تھی میں کہ کسی بھی خوبصورت چیز کو فنا کر دینا میری ہابی بن گئی تھی۔ میں اذیت رسانی سے بڑا سکون محسوس کرتی تھی۔ اس شخص کو ہلاک کرنے کے بعد میں نے ہسپتال چھوڑ دیا اور اس دولت مند آدمی کی دولت پر قبضہ جمانے کے بعد اپنا نام بدل کر عالیہ شاہ رکھ لیا۔ عدنان شاہ کا اس کائنات میں کوئی وجود نہیں ہے، لوگوں نے یہ نہیں سوچا کہ ایک دولت مند آدمی مجھ جیسی بد صورت لڑکی سے بھلا شادی کیوں کرتا بس اس کے بعد زندگی اسی ڈگر پر چل پڑی اور اب ایک اور بد نصیب نے میرا مذاق اڑایا ہے۔ اس بد نصیب کا نام اشعر اقبال ہے میں نے دل میں اس بات کا تہیہ کر لیا ہے کہ جو بھی میرا مذاق اڑائے گا اور مجھ سے نفرت کا اظہار کرے گا میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔ اشعر اقبال نے کلب میں میری توہین کی تھی مجھ سے کہا تھا کہ میں رخ بدل کر بیٹھ جاؤں تاکہ اسے میری شکل نظر نہ آ سکے، وہیں سے اس کی زندگی کا ایک ایک دن کم ہونے لگا تھا۔ میں نے ضرورت پڑنے پر اس کی مدد کی اور وہ میرا غلام بن گیا۔ مجھ سے محبت اور مجھ سے شادی کے لیے ضد کرنے لگا، میں جانتی ہوں کہ وہ صرف مجھ سے دولت کے لیے شادی کرنا چاہتا ہے، اس کا اظہار اس نے دیکھو کس طرح کیا ہے، لو یہ دیکھو۔“ پھر شکیلہ نے موبائل آن کر کے وہ مووی شیلہ کے سامنے کر دی، جس میں اشعر تانیہ سے باتیں کر رہا تھا۔

شیلہ پتھرائی ہوئی نگاہوں سے اس مووی کو دیکھتی رہی اور اس کے بعد اس نے آنکھیں بند کر کے گردن جھٹکی اور بولی۔ ”کتنی بری ہے یہ دنیا۔ خود اپنے لئے گڑھے کھودتی ہے، مگر میڈم،

طرح کو رہو گئی تھی کہ کوئی سوچ بھی نہ سکے کہ اس کا ٹھکباڑ کے پیچھے کیا پوشیدہ ہے۔ ایک تھوڑا سا کباڑ ہٹا کر تہہ خانے میں داخل ہوا جاسکتا تھا اور اس کے بعد وہ ڈرتی کانپتی شیلہ کو لے کر تہہ خانے کی سیڑھیاں طے کرنے لگی۔

تہہ خانہ میں بھی روشنی کا معقول انتظام تھا چنانچہ اس نے تہہ خانہ روشن کر دیا اور شیلہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے چاروں طرف دیکھنے لگی، شکیلہ اسے آگے لے گئی اور پھر اس نے اسے وہ خزانہ دکھایا جسے دیکھ کر انسان پر ایک ہیبت ناک سحر طاری ہو جاتا تھا۔ شیلہ کی آواز بند ہو گئی تھی۔ اس نے شکیلہ کی طرف دیکھا اور نہ جانے کیوں اس کا سارا وجود کانپ کر رہ گیا۔ شکیلہ کا چہرہ اسے بے حد بھیاں لگ رہا تھا، وہ مسکرائی اور بولی۔ ”ویسے تم ٹھیک کہہ رہی تھیں، یہ خزانے بڑے منحوس ہوتے ہیں اور مشکل ہی سے ہاتھ لگتے ہیں لیکن اگر کوئی ان سے بھی زیادہ منحوس شخصیت ان تک پہنچ جائے تو پھر ان کی نحوست اس پر بے اثر ہوتی ہے اور میں جیسا کہ تم جانتی ہو اس کائنات کی سب سے منحوس عورت ہوں۔ لڑکی نہیں کہنا چاہتی اپنے آپ کو لیکن شیلہ ایک بات ضرور کہوں گی تم سے، انسان کو بہت سے معاملات میں اپنی زبان بند رکھنی چاہیے بعض اوقات غیر ضروری ہمدردی نہ جانے کیا سے کیا بن جاتی ہے۔ میں نے زندگی میں جو سب سے بڑا سبق سیکھا ہے وہ یہ ہے کہ اس کائنات میں کسی کو اپنا راز دار نہ بناؤ۔ رازوں کا راز رہنا ہی زیادہ موزوں ہوتا ہے۔ میں چاہتی تو تمہیں بہت پہلے اپنے ہر راز میں شریک کر سکتی تھی، لیکن شیلہ مجھے تمہاری ضرورت تھی، میں نے تمہیں اپنا کوئی راز نہیں بتایا لیکن اس وقت بارش کا حوالہ دے کر تم نے مجھے کچھ نصیحتیں کیں انسان تو میں بھی ہوں نا، میرے سینے میں نہ جانے کب سے ماضی کے زخم سڑ رہے تھے، تم نے ایسے وقت میں انہیں کریدا کہ میری زبان کھل گئی شیلہ، مجھے بے حد افسوس ہے، تم میری بڑی اچھی ساتھی تھیں لیکن تم نے غلط قدم اٹھایا اور جب میں اپنی زندگی کا ہر راز تمہیں دے چکی ہوں تو بھلا اب تمہاری زندگی کی کیا گنجائش ہے میں تو ابھی کافی عرصے زندہ رہنا چاہتی ہوں، لیکن تم خود بھی یہ بات جانتی ہو کہ جو چیز میں تمہیں بتا چکی ہوں اس کے بعد میری زندگی کس نہج پر پہنچ گئی ہے۔ سوری شیلہ غلطی تمہاری ہے کسی کو اپنی حد سے آگے نہیں بڑھنا چاہیے، بعض اوقات دلجوئی اور دلسوزی بہت بڑا گناہ بن جاتی ہے۔“

شیلہ حیرت سے یہ ساری باتیں سن رہی تھی اور پھر جب شکیلہ کی باتوں کا مفہوم اس کی سمجھ

آپ کو اپنی زندگی کی حفاظت کرنی چاہئے۔“

”ہاں تم ٹھیک کہتی ہو، چلو بارش سے لطف اٹھائیں، آؤ میرے ساتھ۔“

شکیلہ اپنی جگہ سے اٹھ گئی، باہر رم جھم ہو رہی تھی وہ شیلہ کو لئے ہوئے اپنی کار تک پہنچ گئی۔ شیلہ خود ڈرائیونگ کرتی تھی، ڈرائیونگ شکیلہ نے بھی سیکھ لی تھی، لیکن شیلہ ڈرائیونگ جانتی تھی اور عام طور سے جب دونوں ساتھ نکلتیں تو شیلہ ہی ڈرائیونگ کرتی تھی۔ شیلہ نے اس وقت بھی ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی اور کار سٹارٹ کر کے کوٹھی سے باہر نکل آئی۔

”کہاں چلیں؟“

”آؤ میں تمہیں راستے بتاتی ہوں، بارش کی اطلاع دی تھی نا تم نے، بارش کا لطف اٹھاتے ہیں۔“

اس وقت واقعی موسم اتنا خوبصورت ہو رہا تھا کہ شیلہ کو بھی ڈرائیونگ میں لطف آ رہا تھا۔ ”ادھر اس طرف، ادھر سے آگے سیدھے ہاتھ پر۔“ شکیلہ اسے گائیڈ کرتی رہی اور تھوڑی دیر کے بعد اس مکان کے عقب میں جا کر کھڑی ہوئی جس میں وہ خزانہ موجود تھا اور جہاں شکیلہ رات کی تاریکیوں میں آتی تھی اور کسی کو بھی پتہ نہیں چلتا تھا، جب وہ گھوم کر مکان کے دروازے پر آئی اور شکیلہ نے تالا کھولا تو شیلہ حیرانی سے بولی۔ ”یہ..... یہ کونسی جگہ ہے؟“

”وہ جگہ شیلہ جو تم نے آج تک نہیں دیکھی، اب جب میں نے تمہیں اپنی زندگی کے ہر راز سے آگاہ کر دیا ہے تو آؤ وہ خزانہ بھی دیکھ لو جس نے مجھے شکیلہ سے مسز عالیہ شاہ بنا دیا ہے۔ آؤ میرے ساتھ۔“

”مم..... میڈم، مجھے ایسی چیزوں سے ڈر لگتا ہے، خزانوں کے بارے میں، میں نے صرف پراسرار روایات سنی ہیں۔ اس طرح کے خزانے بہت کم لوگوں کو حاصل ہوتے ہیں اور جنہیں حاصل ہو جاتے ہیں وہ کسی نہ کسی مشکل کا شکار ہو جاتے ہیں آپ پلیز رہنے دیں، میں خزانہ نہیں دیکھنا چاہتی۔ آپ یہاں سے واپس چلیں، مجھے بڑا ڈر لگ رہا ہے۔“

”حقیقتوں کا چہرہ دیکھنا سیکھو شیلہ۔ یہ حقیقتیں ہی تو زندگی سے روشناس کراتی ہیں، آؤ۔“

شکیلہ نے صرف اس کمرے میں روشنی کی جہاں تہہ خانے میں داخل ہونے کا دروازہ تھا۔

کمرہ ٹوٹے پھوٹے فرنیچر کا کباڑ خانہ بنا ہوا تھا۔ تہہ خانے کے دروازے والی دیوار اس

میں آیا تو اس کے قدموں کی جان نکل گئی، وہ جہاں کھڑی تھی وہیں زمین پر بیٹھ گئی اور اس نے بمشکل کہا۔

”مم..... میڈم، میں آپ کی وفادار آپ کی غلام ہوں، اگر آپ سمجھتی ہیں کہ آپ کی کوئی بات میری زبان سے نکل کر کہیں پہنچ جائے گی تو میڈم ایسا کبھی نہیں ہوگا۔“

”ہو سکتا ہے کہ تم ٹھیک کہہ رہی ہو، لیکن شیدا یہ سب کچھ میری لغت میں نہیں ہے، ہاں ابھی ابھی ایک بات میرے ذہن میں آئی ہے تم میری بہت اچھی ساتھی ہو، تم نے میرا بڑا ساتھ دیا ہے، میں تمہیں ہلاک نہیں کر رہی، لیکن میں تمہیں اسی تہہ خانے میں چھوڑے جا رہی ہوں، یہ تہہ خانہ اندر سے کبھی نہیں کھلتا یہاں ایک عظیم الشان خزانہ موجود ہے، تم یہاں رہو، یہاں سے نکلنے کی کوشش کرو، اگر تم دروازہ کھول لیتی ہو تو اس خزانے میں سے جتنا چاہو اپنے ساتھ لے جاسکتی ہو اور اس کے بعد تمہیں اختیار ہوگا کہ سیدھی پولیس سٹیشن جا کر میرے بارے میں انکشاف کرو اور مجھے گرفتار کرا دو، یا اگر ایسا نہ چاہو تو خزانہ لے کر روپوش ہو جاؤ، میں وعدہ کرتی ہوں کہ تمہیں تلاش نہیں کروں گی اور اگر پولیس کو تم نے مجھ تک پہنچا دیا تو بھی مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے کیونکہ میں جانتی ہوں کہ اس بیکار زندگی کا ایک نہ ایک دن خاتمہ ہونا ہے۔“

مم..... میڈم مجھے معاف کر دیجئے۔“

”میرے کان نہیں ہیں، میرے سینے میں دل نہیں ہے، آرام کرو شیدا، دیکھو تنہائی میں خزانے کے اس ڈھیر کے ساتھ کیسے وقت گزرتا ہے۔“

”مم..... میڈم میڈم۔“ شیدا کی درد بھری آوازیں ابھریں، لیکن شکلیہ سیڑھیاں طے کرتی ہوئی باہر نکل آئی، تہہ خانے کا دروازہ باہر سے بند کر کے سارا کاٹھ کباڑ اسی طرح اپنی جگہ رکھ دیا اور پھر اطمینان انداز میں آگے بڑھتی ہوئی مکان کے دروازے سے باہر نکلی، تالا لگایا اور اپنی کار میں جا بیٹھی۔

کچھ لمحوں کے بعد کار سٹارٹ ہو کر واپس چل پڑی تھی اور شکلیہ کی طبیعت میں وہی فرحت بخش احساس پیدا ہو گیا تھا بارش مسلسل ہو رہی تھی وہ سیدھی اپنی رہائش گاہ میں داخل ہو گئی اور اس کے بعد اس نے لباس وغیرہ تبدیل کیا اور آرام کرنے لیٹ گئی۔

بہت سے خیالات اس کے ذہن میں گردش کر رہے تھے، وہ سوچ رہی تھی کہ اب اسے

ہر جگہ شیدا کے بغیر گزارا کرنا ہوگا لوگ یقیناً اس سے شیدا کے بارے میں سوالات کریں گے لیکن لوگوں کو کیا حق ہے کہ کسی کے ذاتی معاملات میں اس قدر مداخلت کرنے کی کوشش کریں۔ شیدا نے اس کا اصل مسئلہ حل کر دیا تھا، یعنی اسے ان تمام حلقوں میں روشناس کر دیا تھا جن میں وہ داخل ہونا چاہتی تھی اور اب شیدا کا کام ختم ہو گیا تھا ہاں یہ الگ بات ہے کہ اگر وہ اس قدر وفا پرستی کا مظاہرہ نہ کرتی تو شاید ایسی کسی مشکل کا شکار نہ ہوتی لیکن اب زندگی اس سے روٹھ گئی تھی بھلا اس تہہ خانے سے زندہ سلامت نکل آنے کا کیا جواز تھا جس میں باہر نکلنے کا راستہ ہی نہیں تھا۔

پھر ایک دن مقررہ وقت پر اشعر اقبال اس کے پاس پہنچ گیا۔ موسم کی مناسبت سے اس نے ایک بہت ہی خوبصورت سوٹ پہنا ہوا تھا۔ بہت ہی نفیس پرفیوم لگایا ہوا تھا وہ مسکراتا ہوا اندر داخل ہوا اور پھر شکلیہ کے

قریب پہنچ گیا۔ ”اگر تمہیں صرف عالی کہوں تو تمہیں اعتراض تو نہیں ہوگا۔“

جواب میں شکلیہ ہنس پڑی پھر بولی۔ ”ویسے تو جو نام بھی پیار محبت سے لیا جائے بڑی اہمیت کا حامل ہوتا ہے، لیکن بہت کچھ کھونے کے بعد اگر کچھ ملے تو عجیب سا لگتا ہے۔“

”ایک تو تم عالیہ نہ جانے کون کون سی کہانیاں سنانے بیٹھ جاتی ہو، اگر اس سانولی رنگت اور ان نقوش کو کوئی کسی محبت کرنے والے کی نگاہ سے دیکھے تو تم یقین کرو کہ شکل ہی دوسری نکل آتی ہے عالیہ پلیز اب تم اپنی نہیں میری امانت ہو اور میں نہیں چاہتا کہ کوئی میری زندگی کو ہلکی نگاہ سے دیکھے میں وہ آنکھیں پھوڑ دوں گا عالیہ جو تمہیں حقارت کی نگاہ سے دیکھیں گی۔“

عالیہ ایک دم ہنس پڑی پھر بولی۔ ”وعدہ کرتے ہو۔“

”ہاں عالیہ، تمہیں شک ہے میری محبت پر؟“

”مجھے صرف اپنے آپ پر شک ہے، پتہ نہیں زندگی میں وہ واسطے نبھاسکوں گی یا نہیں۔“

”میں سمجھا نہیں۔“

”باہر بارش ہو رہی ہے۔“

”نہیں، اب مدھم مدھم پھوار پڑ رہی ہے۔“

”تمہیں بارش پسند ہے؟“

”بہت یلن تم نے مجھ پر ظلم کیا، کیا مصروفیت رہی دن بھر؟“

کچھ کام تھے جو اپنے طور پر سرانجام دینے تھے۔“

”اچھا ہمیں نہیں بتایا جائے گا کہ کیا کام تھے؟“

”نہیں بتانے والی کوئی ایسی خاص بات نہیں، بس زندگی کے کچھ معمولات ہیں جنہیں

پورا کرنا پڑتا ہے۔ لباس تبدیل کر لو۔“

”کیوں! کہیں چلنا ہے کیا؟“

”نہیں اب بھلا کہاں وقت ہے اور پھر باہر جگہ جگہ پانی بھر گیا ہے، ہم لوگ یہیں آرام

کریں گے۔“

”تو پھر لباس بدلنے کے لیے کیوں کہہ رہے ہو؟“

”میں چاہتا ہوں تم میری پسند کا لباس پہنو۔“

”اوا اچھا، چلو اٹھو آؤ، میرے ساتھ۔“

شکیلہ نے کہا اور اشعر کو ساتھ لے کر اس کمرے میں پہنچ گئی جہاں اس کے لباس الماری

میں لٹکے ہوئے تھے۔

”یہ تمہارے لباس ہیں؟“ اشعر نے حیرانی سے کہا۔

”کیوں تمہیں کیا لگتا ہے؟“

”ارے بابا مجھے اپنی عمر بتاؤ، کتنی عمر ہے تمہاری اور تم نے یہ سارے لباس عمر رسیدہ

لوگوں جیسے بنائے ہیں اپنے لئے، مجھے بڑی مایوسی ہوئی ہے۔“

”آج؟“ عالیہ نے سوال کیا۔

”آج سے تمہاری کیا مراد ہے؟“

”میں یہ کہنا چاہتی تھی کہ تمہیں مایوسی آج ہوئی ہے، میں نے تو اپنی عمر نہ جانے کون سے

حصے سے مایوسیوں کے درمیان ہی بسر کی ہے۔“

”عالیہ بڑی بات ہے، اب تم اپنے بارے میں کچھ کہتے ہوئے یہ سوچا کرو کہ یہ کچھ تم

اپنے بارے میں نہیں کہہ رہیں بلکہ میرے بارے میں کہہ رہی ہو۔ میں ان میں سے کوئی لباس

تمہیں نہیں پہننے دوں گا، چلو ٹھیک ہے اب تم میری پسند کے لباس پہنوگی۔“

شکیلہ ہنس کر خاموش ہو گئی تھی۔ پھر مقررہ وقت پر ڈنر کا بندوبست ہوا، ڈنر کیا گیا، شکیلہ

نے موسم کی مناسبت سے کھانے تیار کرائے تھے۔ کھانے کے بعد کافی کا دور چلا، انتہائی نفیس

کریم کافی بنائی گئی تھی شکیلہ نے کافی کا ایک کپ اشعر کو دیا دوسرا خود لے کر بیٹھ گئی، بھیکے بھیکے

موسم میں کھڑکی کے ساتھ بیٹھے ہوئے کافی کے سب لینا بہت ہی اچھا لگ رہا تھا۔

”دل تو چاہتا ہے کہ یہیں ساری رات گزار دوں، لیکن خیر وہ وقت بھی زیادہ دور نہیں

ہے۔“

شکیلہ نے نگاہیں اٹھا کر اشعر کو دیکھا اور اپنی پیالی سے کافی کے گھونٹ لینے لگی۔ اشعر بھی

خاموشی سے کافی پیتا رہا تھا۔ جب اس کی کافی ختم ہو گئی تو شکیلہ نے کہا۔ ”اور دوں؟“

”نہیں، تشنگی میں بھی ایک مزہ ہے۔“

”ہاں ٹھیک کہتے ہو اشعر جیسے میں اپنے تشنہ تن ہونے کا مزہ لیتی ہوں میری زندگی بہت

عجیب رہی ہے اشعر اور میری زندگی میں شامل ہونے والے لوگ جیسے، تم بڑے نقصان میں

رہے ہیں۔ دیکھو تمہارے بارے میں مجھے ساری حقیقتیں معلوم ہو چکی ہیں، اگر چاہو تو یہ مووی تم

دیکھ لو۔“

”مووی؟“

اشعر نے آنکھیں بھیجنے کر سر جھٹکتے ہوئے کہا۔

”ہاں لو یہ دیکھو۔“ اور اس کے بعد شکیلہ نے وہ موبائل آن کر کے اشعر کے سامنے کر دیا

ایک لمحے تک تو اشعر غور کرتا رہا کہ یہ ہے کیا قصہ لیکن جب اس نے آگے کے مناظر دیکھے تو اس

کے سارے وجود میں سنسنی کی لہریں دوڑ گئیں یہاں تک کہ مووی ختم ہو گئی اس نے چندھیائی

ہوئی نگاہوں سے شکیلہ کو دیکھا اور بولا۔ ”یہ تمہارے پاس کہاں سے آئی؟“

”اس بات کو چھوڑ اشعر، تم مجھے بتاؤ کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے؟“

اشعر خشک ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگا، پھر بولا۔ ”میں جانتا ہوں یہ مووی تم نے نہیں

بنائی، ایسا کوئی لمحہ نہیں آیا جب میں اور تانیہ گفتگو کر رہے ہوں اور تم ہمارے قریب ہو، مجھے یہ

بتاؤ یہ مووی تمہیں کس نے بنا کر دی، کیا تم نے میرے پیچھے لوگ لگا رکھے تھے؟“

”نہیں اشعر بات تو وہاں سے شروع ہوئی تھی جب تم نے مجھ سے کہا تھا کہ میں رخ

بدل کر بیویوں۔ ہم بد صورت چیزوں کو نہیں دیکھ سکتے، استعرو ہیں سے میرے اور تمہارے درمیان کشمکش کا آغاز ہو گیا تھا میں ایسے ہر شخص کو زندگی سے محروم کر دیتی ہوں جو مجھے بد صورت کہے یا میرا مذاق اڑائے۔“

تمہاری ساتھی لڑکیاں مجھے دیکھ دیکھ کر ہنس رہی تھیں اور جب میں تمہارے پاس پہنچی تو تم نے نہایت حقارت کا سلوک کیا میرے ساتھ اشعر، میں نے اسی وقت یہ سوچ لیا تھا کہ تم زندگی کھو چکے ہو۔“

کک..... کیا مطلب؟“

”اشعر! میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ اپنا مذاق اڑانے والے کو میں زندہ نہیں چھوڑتی۔“

”ہوں..... ٹھیک ہے، تم ٹھیک کہہ رہی ہو اوکے، کوئی بات نہیں، میں نے واقعی یہ سوچا تھا کہ اگر میری شادی تمہارے ساتھ ہو جائے تو میں ایک انتہائی دولت مند شخص بن جاؤں گا بات صرف یہ ہے کہ دولت حاصل کرنا ہر شخص کی دلی خواہش ہوتی ہے میں اپنی ان کوششوں میں ناکامی کا منہ نہیں دیکھنا چاہتا۔ یہ تو بڑا اچھا مشورہ دیا ہے مجھے اس شخص نے جس نے یہ مووی بنائی ہے اور اب یہ ہوگا۔ یہی موبائل ایک اور مووی بنائے گا اور اس کے ذریعے تم میرے شکبے میں ہوگی، وہی کام کرو گی تم جو میں کہوں گا کیا سمجھیں، تم بہر طور ایک عورت ہو اور میں مرد۔“

جواب میں اچانک ہی شکیلہ کے چہرے پر ایک خوفناک اور سفاک کیفیت پھیل گئی۔ تم سے پہلے میں کئی مردوں کو ٹھکانے لگا چکی ہوں اشعر، اور میرے لئے اب یہ کوئی مشکل کام نہیں رہا۔

میں تمہارے ساتھ کوئی وحشیانہ سلوک نہیں کروں گا، لیکن تم ذرا اپنے آپ پر غور کرو، تم تو مر چکے ہو اشعر، مار دیا ہے میں نے تمہیں۔“

”کک..... کیا..... ب..... بکو اس کر رہی ہو؟“

اشعر نے ایک بار پھر آنکھیں بند کر کے گردن جھٹکی۔

شکیلہ ہنس کر بولی۔ ”گریم سی، اصل میں میں کچھ عرصے ایک ہسپتال میں نرس رہ چکی ہوں، وہاں سے مجھے دواؤں کے بارے میں معلومات حاصل ہیں، گریم سی نامی یہ گولی انتہائی خطرناک قسم کا زہر ہوتی ہے۔ سب سے دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ بے مزہ ہوتی ہے۔ یہ زہر ایک

خاص قسم کے کیڑے سے حاصل کیا جاتا ہے اور اسے کچھ دواؤں میں ملا کر کوڑھ کے مریضوں کو دیا جاتا ہے یہ زہر کوڑھ کے زہر کو مارتا ہے لیکن اگر یہ براہ راست جسم میں داخل ہو جائے تو صرف ایک گھنٹہ لیتا ہے انسان کو ختم کرنے میں جسم میں داخل ہونے کے بعد آنکھوں میں ایک نیند سی پیدا ہو جاتی ہے سر چکرانے لگتا ہے اور دونوں پاؤں ناکارہ ہو جاتے ہیں تم اگر چاہو تو اپنے پیروں کو جنبش دے کر دیکھ لو وہ اب تمہارے حکم کے تابع نہیں رہے۔ تم اپنے پیروں پر کھڑے نہیں ہو سکتے۔ اشعر، رفتہ رفتہ اس کا اثر اوپر کی طرف بڑھے گا۔ تمہارا نچلا دھڑ ناکارہ ہو جائے گا اور پھر یہ تمہارے سارے وجود پر اپنا اثر قائم کر لے گا۔ کچھ لمحوں کے بعد تمہیں اپنے سینے میں گھٹن محسوس ہوگی۔ تمہیں یوں لگے گا جیسے تمہارے پیچھے سانس لینے میں تمہاری مدد نہیں کر رہے۔ پھر تمہارا سانس گھٹے گا اور رفتہ رفتہ تم دم توڑ دو گے۔ میرا خیال ہے اس کا آغاز ہو گیا ہوگا، اپنے پیروں کو جنبش دے کر دیکھو۔“

اشعر نے دہشت زدہ انداز میں اپنے پیروں کو ہلانے کی کوشش کی اور اس کی آنکھیں دہشت سے پھیل گئیں اس کے پاؤں منجمد ہو چکے تھے۔ وہ دہشت بھری نگاہوں سے شکیلہ کو دیکھتا رہا اس نے کچھ بولنے کی کوشش کی لیکن زبان ساتھ چھوڑ چکی تھی۔

”میرا قصور بتاؤ اشعر، میرا قصور بتاؤ، اپنی شکل میں نے تو نہیں بنائی۔“

اشعر کے کانوں میں اب شکیلہ کی آواز بھی نہیں جا رہی تھی، وہ جانکنی کے عالم سے گزر رہا تھا آخر کار اس کی مشکل حل ہو گئی اس کی پتلیاں ساکت ہو گئی تھیں۔

”بڑا کہنا چاہو تو میری ماں کو بڑا کہو جس نے مجھے پیدا کیا ہے۔“

اشعر کی لاش اٹھا کر اس نے اس کی کار کی پچھلی سیٹ پر رکھی اور پھر رات گئے کار لے کر نکل کھڑی ہوئی، ایک سنسان سی جگہ کا اردک کر اس نے لاش پچھلی سیٹ سے اٹھا کر ڈرائیونگ سیٹ پر رکھی اور پھر اس کا سر اسٹیرنگ پر رکھ کر وہاں سے واپس چل پڑی، کوئی ایک میل چلنے کے بعد اسے ایک آٹو رکشہ ملا تھا۔

گھر واپس آ کر وہ مسہری پر لیٹ گئی، صبح کو پھر آسودگی کا احساس ہو رہا تھا۔

وہ خوشدلی سے سوچتی رہی، اب شیلہ بھی نہیں ہے۔ اشعر کی کہانی بھی ختم ہو چکی ہے۔ مجھے کیا کرنا چاہیے زندگی ایک ہی انداز میں تو نہیں گزاری جاسکتی، کوئی تبدیلی لائی جائے زندگی

میں، مگر کیا..... کیسے..... کچھ ہونا ضرور چاہیے۔

دوسرا دن معمول کے مطابق تھا۔ بارش آج بھی ہو رہی تھی سارا دن گھر میں رہی۔ کافی اداس ہو گئی تھی البتہ دوسرے دن مطلع صاف ہو گیا تھا دن کے کوئی گیارہ بجے کا وقت ہو گا اچانک نیلم آگئی تھی اس کے چہرے پر شدید غم کے نقوش تھے۔

”ہیلو نیلم۔ کیا بات ہے کچھ بیمار ہو۔“

”آپ۔ آپ نے اخبار نہیں پڑھا۔“ نیلم نے افسردہ لہجے میں کہا۔

”اخبار۔ کیوں خیریت! کوئی خاص بات ہے۔“

”اشعر سے کب سے ملاقات نہیں ہوئی۔“

”دو تین دن ہو گئے۔“

”اشعر..... اشعر اب اس دنیا میں نہیں رہے۔“ نیلم نے کہا اور سسکنے لگی۔

شکیلہ نے بھی بہترین اداکاری کی تھی وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے نیلم کو دیکھنے لگی۔ پھر

بولی، کیا ہوا؟“

”ہارٹ فیل۔ سڑک پر اپنی کار چلا رہے تھے۔“

”اس جیسے شخص کے ساتھ یہی ہونا چاہیے تھا۔“ وہ بولی اور رونے لگی روتے روتے اس

نے کہا۔ ”اس نے میرے دل پر گہرا گھاؤ لگایا تھا۔ کتنا بڑا انسان تھا وہ۔“

دونوں اپنے غم کا اظہار کرتی رہیں۔ ان حالات میں نیلم کو کسی طرح کا شک نہیں ہو سکتا

تھا۔ پھر اس نے نیلم سے پوچھا۔ ”تمہیں اس کی موت کے بارے میں کیسے معلوم ہوا۔“

”اخبار میں خبر لکھی تھی تصویر بھی چھپی تھی آج کلب میں اس کے لیے تعزیتی نشست ہے

شام کو، چلو گی؟“

”ہاں کیوں نہیں جانا تو ہوگا۔“ وہ بولی۔

نیلم بہت دیر تک اس کے پاس بیٹھی رہی۔ جب وہ چلی گئی تو شکیلہ ان واقعات کے

بارے میں سوچتی رہی جو ہر اس نے اشعر کو دیا تھا وہ تھا تو کچھ ایسی خصوصیات کا حامل کی کسی کو

اشعر کی موت پر شبہ نہیں ہو سکتا تھا لیکن پھر بھی شکیلہ کو احساس ہوا کہ اس بار اس نے کچھ کچا کام کر

ڈالا ہے۔ اشعر کی لاش کو ٹھکانے لگانے کے لیے کوئی موثر ذریعہ اختیار کرنا چاہیے تھا تا کہ چند

روز اس کی لاش کا پتہ نہ چلتا بہر طور جو ہونا تھا وہ ہو چکا تھا اپنے طور پر اس نے کوشش کی تھی کہ کم از کم نیلم کو کوئی شبہ نہ ہو سکے اور اس نے مزید اس بارے میں فیصلے کئے تھے چنانچہ رات کو وہ سیاہ لباس میں ملبوس ہو کر کلب پہنچی تھی۔

اشعر کلب کا ایک مقبول ممبر تھا اور پھر ویسے بھی کلب کے لوگ ایک دوسرے سے کافی

یگانگت رکھتے تھے..... یہ دیکھ کر اسے ہنسی آئی اور کچھ اطمینان بھی ہوا کہ اشعر کی تمام دوست

لڑکیاں کالے کپڑے پہن کر کلب آئی تھیں وہ بھی خاموشی سے اپنی میز پر جا بیٹھی، تھوڑی دیر

کے بعد اشعر کے بارے میں تعزیتی اجلاس شروع ہو گیا۔

کچھ لوگوں نے اس کے کردار پر روشنی ڈالی اور اس کے بارے میں باتیں کرتے رہے

پھر اس کی روح کے ایصال ثواب کے لیے فاتحہ خوانی کی گئی۔ طرح طرح کی باتیں کی جارہی

تھیں کسی نے کہا۔

”ویسے ایک تندرست و توانا آدمی کا اچانک اس طرح ہارٹ فیل ہو جانا بظاہر تعجب کی

بات تو نہیں ہے لیکن اشعر جس طرح کا انسان تھا وہ ذرا زیادہ دکھ کی بات ہے ویسے اسے کبھی فکر

مند یا پریشان نہیں دیکھا گیا۔“

”پچھلے دنوں اسے کوئی کاروباری نقصان ہوا تھا۔“

”ہاں لیکن یہ نقصان ہمارے کلب کی ایک بہت ہی مخیر اور عظیم خاتون نے پورا کر دیا

تھا۔“

”ارے ہاں، ہمیں خصوصی طور پر محترمہ عالیہ شاہ سے تعزیت کرنی چاہیے۔“ کچھ لوگ

اس کی میز پر آگئے ان میں لڑکیاں بھی تھیں۔

ایک عمر رسیدہ شخص نے عالیہ شاہ سے کہا۔

”آپ کی ڈیڑھ کروڑ روپے کی رقم تو ڈوب گئی۔“

عالیہ نے نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا اور بولی۔

”مجھے تعجب ہے کہ آپ نے اس رقم کے بارے میں اتنا گہرا نوٹس کیوں لیا، کیا انسان کی

زندگی اس رقم سے زیادہ قیمتی نہیں ہے؟“

”یہ بات نہیں مسز شاہ! ڈیڑھ کروڑ روپے کی رقم معمولی تو نہیں ہوتی۔“

”میں کبھی اس شخص سے رقم کی واپسی کا مطالبہ نہیں کرتی اور نہ ہی میں نے اسے یہ رقم قرض دی تھی، میں نے تو بس ایک دوست کی مدد کی تھی۔“

”سنا ہے اس نے آپ کو شادی کی پیشکش کی تھی، پچھلے دنوں سے اسے آپ کے ساتھ زیادہ دیکھا جا رہا تھا؟“

”انہی تمام باتوں سے دل چاہتا ہے کہ گوشہ نشینی اختیار کر لی جائے، آپ لوگوں کے درمیان میں دل بہلانے کے لیے آ جاتی ہوں، نہ جانے آپ کیوں میری دل شکنی کرنا چاہتے ہیں، وہ مذاق کرنے کا شوقین تھا اسے خوبصورت چیزوں سے پیار تھا اور آپ کو علم ہے کہ میں خوبصورت نہیں ہوں، حالانکہ وہ میرا احسان مند تھا لیکن پھر بھی میرا مذاق اڑانے سے نہیں چوکتا تھا آپ خود سوچ لیجئے ایک ایسا شخص جو فطرتاً حسن پرست ہو، کیا مجھ سے شادی کر سکتا ہے بے تکلف ہو گیا تھا کہہ بیٹھا کہ عالیہ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے بڑے پیار سے اس کا گال تھپتھا کر اسے خاموش کر دیا تھا۔“

”مگر اس نے دوسرے بہت سے لوگوں سے یہ بات کہی تھی۔“

”چلئے پھر یہی کہہ سکتی ہوں کہ وہ میری تقدیر میں نہیں تھا۔“

یہ رات عالیہ کے لیے خاصی تشویش کا باعث تھی وہ سوچ رہی تھی کہ معاملہ کہیں سنگین نوعیت نہ اختیار کر جائے غالباً جلد بازی کر ڈالی ہے۔ اسے تھوڑا سا وقت دینا چاہیے تھا۔ اب کیا کرنا چاہیے بہت غور و خوض کرنے کے بعد اس نے یہی فیصلہ کیا کہ بہت زیادہ محتاط رہنے کے بجائے اسے لا پرواہی اختیار کرنی چاہیے، کلب کے ممبران کے درمیان تعزیتی اجلاس میں اس نے جو رویہ اختیار کیا تھا وہ بھی غیر مناسب نہیں تھا اسی پر قائم رہنا چاہیے۔

دوسرے دن بھی وہ باقاعدہ کلب گئی۔ لوگ کسی کے مسئلے میں اس قدر جذباتی نہیں ہوتے جو لڑکیاں اشعر سے زیادہ قریب تھیں وہ بھی بس تھوڑی بہت سنجیدہ تھیں، باقی تمام لوگ اپنے اپنے مشاغل میں مصروف تھے وہ خود بھی اپنے طور پر وہی انداز اختیار کئے رہی جو پہلے سے ہوا کرتا تھا۔ کچھ شناسائیاں ہو گئی تھیں اور کچھ لڑکیاں اور کچھ نوجوان خاص طور سے اس کے پاس آنے لگے تھے اور یہ عمل اس وقت سے ہوا تھا جب سے اس نے اشعر کو ایک بھاری رقم دے دی تھی، اس کا اچھا خاصا چرچا ہو گیا تھا۔ شکیلہ کی دانست میں اسے تو رقم کی وصولیاں ہو گئی

تھی ابھی تو خزانے کا ایک معمولی سا حصہ بھی استعمال نہیں ہوا تھا اور اس کے پاس اتنا کچھ تھا کہ اگر وہ دن رات اس انداز میں دولت لٹاتی رہتی تو کوئی کمی نہ ہوتی۔

بہر حال دوسرا، تیسرا، چوتھا، پانچواں دن گزر گیا اور کوئی ایسی اہم بات نہیں ہوئی جو اس کے لیے باعث تشویش ہوتی تو اسے کسی قدر اطمینان ہو گیا لیکن چھٹے دن تقریباً گیارہ بجے کے وقت اس کی ایک خاص ملازمہ نے اسے اطلاع دی کہ پولیس آئی ہے تو وہ ایک دم سنجیدہ ہو گئی۔ شروع کے چند لمحات تو خوف کے عالم میں گزرے لیکن اس کے بعد اس نے خود کو سنبھال لیا ڈرائنگ روم میں پولیس کے تین افراد موجود تھے جبکہ اس نے اوپر کی منزل سے باہر نگاہ ڈالی تھی تو اسے پولیس کی ایک جیب نظر آئی تھی جس میں کئی کانسیل بیٹھے ہوئے تھے۔ اندر آنے والے تین افراد میں ایک ایس ایچ او تھا اور دو سب انسپکٹر۔ ایس ایچ او بہت خوبصورت چہرے والا نوجوان شخص تھا۔ نہ جانے کیوں شکیلہ کو ایک دم احساس ہوا کہ یہ شکل کچھ جانی پہچانی سی ہے لیکن اس وقت غور نہیں کیا جاسکتا تھا البتہ اس نے ایس ایچ او کے چہرے پر بھی ایسے ہی آثار دیکھے اس نے بڑے نرم اور خلیق انداز میں ان لوگوں سے کہا:

”فرمائیے میں حیران ہوں کہ آپ لوگوں کو اس طرح دردی میں میرے گھر آنا پڑا، تشریف رکھئے، بیٹھئے بتائیے کیا بات ہے؟“

”میڈم ہم آپ سے کچھ سوالات کرنا چاہتے ہیں۔“

”آپ بیٹھئے۔“

”شکریہ۔“ ایس ایچ او صوفے پر بیٹھ گیا جب کہ ایس آئی تھوڑے فاصلے پر جا کر کھڑے ہو گئے اور اس شاندار قیمتی ڈرائنگ روم کا جائزہ لینے لگے جس کی ڈیکوریشن ہی بیس پچیس لاکھ روپے سے کی گئی تھی۔ وہ شاندار ترین ڈرائنگ روم تھا۔

”میڈم، ہم ایک نوجوان تاجر اشعر کی موت کی تفتیش کر رہے ہیں۔“

”اوہ..... اشعر۔“

شکیلہ نے افسوس بھرے لہجے میں کہا۔

”ان کی جتنی قریبی ساتھی تھیں ان سب سے معلومات حاصل کی جائے گی تھوڑی سی تفصیل ہم آپ سے معلوم کرنا چاہتے ہیں کیا آپ ہمیں اپنے بارے میں بتانا پسند کریں گی؟“

تبدیل کر دی ہے۔“

شکیلہ کو ان لمحات میں اپنے آپ پر قابو پانا ذرا مشکل محسوس ہوا تھا۔ ایک عجیب سی لہر اس کے چہرے پر آ کر گزر گئی اس نے بمشکل خود کو سنبھالا تھا پھر کہا تھا۔ ”پوسٹ مارٹم رپورٹ، کیا اس میں کوئی خاص بات ہے؟“

”جی ہاں..... بہت ہی ماہر ڈاکٹروں نے پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کا تجزیہ کرتے ہوئے اپنی رپورٹ میں لکھا ہے کہ اشعر کے جسم میں ایک خاص قسم کے زہر کے اثرات پائے گئے ہیں اور اس بات کے امکانات ہیں کہ انہیں زہر دے کر ہلاک کیا گیا ہے۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ میں بڑی تفصیل سے یہ بات لکھی گئی ہے کہ کچھ زہر اس قسم کے ہوتے ہیں جن کے اثرات ذرا دیر میں نمودار ہوتے ہیں لیکن وہ جان لیوا ہوتے ہیں اس پوسٹ مارٹم رپورٹ کے بعد اشعر کی موت کی تفتیش کی ذمہ داریاں میرے سپرد کر دی گئی ہیں۔“

”یہ تو واقعی ایک سنسنی خیز بات ہے لیکن انسپکٹر صاحب، آپ پوری تفتیش کریں میں بھی آپ کی مدد کے لیے حاضر ہوں کیونکہ بہر حال میری اس سے تھوڑی بہت دوستی تو ہو ہی گئی تھی۔ البتہ ایک درخواست ضرور کروں گی آپ سے میں بہت ہی نڈھال زندگی گزار رہی ہوں اپنے آپ کو بھلانے کے لیے انسانوں کے درمیان گھس جاتی ہوں، خدا را میری اس کوشش کو رائیگاں نہ کر دیجئے گا۔“

”میں سمجھا نہیں۔“

”تو سمجھ لیں۔ انسپکٹر صاحب مجھے غور سے دیکھئے۔ میں لوگوں کو دوست نہیں بنا پاتی کیونکہ میرا چہرہ اس قابل نہیں ہے۔ میں ایک بد شکل اور بدنما عورت ہوں وہ تو بس نہ جانے عدنان شاہ صاحب کو کیوں مجھ پر رحم آ گیا تھا کہ انہوں نے مجھے اپنے قدموں میں جگہ دے دی۔ یہ جگہ میں نے زندگی میں کبھی نہیں پائی انسپکٹر صاحب اور انسان ہونے کی حیثیت سے میں یہ خواہش بھی دل میں رکھتی ہوں کہ کوئی تو ہو جو میرے چہرے سے نگاہیں ہٹا کر میرے دل کی گہرائیوں میں جھانک کے مجھ پر غور کرے یہ سوچے کہ میں خدا کی بنائی ہوئی ایک انسان ہوں اور میری جو شکل و صورت ہے اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے۔ بہر حال اگر واقعی اشعر کو کسی نے ہلاک کرنے کی کوشش کی ہے تو میں نہیں جانتی کہ اس نے یہ گناؤں ناجرم کیوں کیا ہے البتہ آپ

”ہاں آفیسر، ایک اچھی شہری کی حیثیت سے میں قانون سے ہر طرح کا تعاون کرنا چاہتی ہوں، ویسے بھی میری زندگی کا طویل ترین حصہ اپنے وطن سے دور گزرا ہے اور میں ملک سے باہر زندگی گزارتی رہی ہوں، ساؤتھ افریقہ میں میرے شوہر عدنان علی شاہ ایک تاجر تھے بہت اچھی زندگی گزاری میں نے اپنے شوہر کے ساتھ، لیکن وقت انہیں میرے ساتھ زندگی گزارنے کی اجازت نہ دے سکا ان کا انتقال ہو گیا وہاں میں بالکل تنہا رہ گئی۔ چنانچہ میں اپنے وطن واپس آ گئی۔ کافی سرمایہ تھا جو میں نے یہاں منتقل کر لیا اور اس کے بعد یہیں وقت گزارنے لگی۔ اشعر سے میری بھی دوستی تھی بلکہ کافی زیادہ تھی۔ ایک چھوٹا سا واقعہ ہو گیا تھا ان کے ساتھ۔ میں نے ایک دوست کی حیثیت سے ان کی مدد کی تھی۔ وہ میرے ممنون کرم ہو گئے نوجوان آدمی تھے۔ خوش مزاج اور انتہائی ہنس مکھ۔ مجھ سے ہر طرح کی باتیں کر لیا کرتے تھے۔ مذاق ہی مذاق میں انہوں نے مجھے شادی کی پیشکش بھی کر دی تھی۔ بہر حال تعجب کی بات ہے کہ ایک ایسے شخص کا جو ہنسنا جانتا تھا اس طرح انتقال ہو گیا لیکن بہر حال موت کے لیے کوئی نہ کوئی جواز ضروری ہوتا ہے اور یہ جواز اشعر کے لیے بھی پیدا ہو گیا کہ انہیں دل کا دورہ پڑا۔“

”آپ نے انہیں ڈیڑھ کروڑ روپیہ دیا تھا۔“

”انسپکٹر صاحب اس بات کو اہمیت نہ دیجئے، خدا نے مجھے بہت کچھ دیا ہے، تنہا ہوں، یہ میرے لئے کوئی بڑی چیز نہیں ہے۔“

”بہت بڑی بات ہے لوگ اس طرح پیسے کہاں بچھکتے ہیں؟“

”آپ بھی اگر کسی مشکل کا شکار ہوں تو مجھ سے رجوع کیجئے بلکہ میں تو ایک ایسے ادارے کے قیام کے بارے میں سوچ رہی ہوں جس میں مفلس اور نادار لوگوں کی خدمت کرنے کا اعلان کروں۔“

”آپ بہت عظیم ہیں خاتون۔“ ایس ایچ او کے انداز میں ایک دم تبدیلی رونما ہو گئی ایسی اسامیوں کو کون چھوڑنا پسند کرتا ہے۔ لیکن بہر حال وہ ایس آئی سے ایس ایچ او بنا تھا بہت محنت کی تھی اس نے اپنے اس عہدے تک آنے کے لیے۔ اس نے کہا۔

”در اصل میڈم! بظاہر ایسی کوئی خاص بات نہیں تھی حادثاتی موت کے بارے میں ظاہر ہے قانون بھی بے بس ہوتا ہے لیکن اشعر کے پوسٹ مارٹم کی رپورٹ نے صورتحال ذرا سی

مجھے اپنی مددگار کے طور پر ہمیشہ حاضر پائیں گے۔ اشعر کو اگر قتل کیا گیا ہے تو اس کے قاتلوں کو سزا دلوانا میری بھی بہت بڑی ذمہ داری اور فرض ہے۔

”بہت اچھی بات ہے جہاں تک آپ نے اپنی شکل و صورت کے بارے میں کہا تو محترمہ یہ ایسی کوئی بات نہیں ہے جسے جواز بنایا جائے آپ کی باتیں تو بہت اچھی ہیں۔ ٹھیک ہے میں چلتا ہوں ابھی تفتیش جاری ہے ہو سکتا ہے دوبارہ آپ کو تکلیف دینی پڑے۔“

”آپ سے میں نے خود کہا ہے کہ میں ہر مدد کے لیے حاضر ہوں۔“

انسپکٹر نے ساتھیوں کو اشارہ کیا اور وہ واپس چل پڑے۔ شکیلہ نے بے حد خوش اخلاقی کے ساتھ انہیں خدا حافظ کہا تھا لیکن ان کے جانے کے بعد وہ بے جان سے قدموں سے چلتی ہوئی ایک صوفے پر جا بیٹھی تھی۔

”یہ کیا ہوا؟ یہ تو بڑی خطرناک صورت حال ہو گئی۔ گریم سی کے بارے میں تو یہ سنا تھا کہ اس کے استعمال کا پتہ کسی صورت میں نہیں چلتا پھر پوسٹ مارٹم رپورٹ میں اس کے شواہد کیسے مل گئے؟ پھر اس نے سوچا کہ وہ صرف نرس ہے ڈاکٹر نہیں۔ پتہ نہیں کیا کیا عوامل ہوں مگر یہ صورتحال بے حد خطرناک ہو گئی۔ انسپکٹر کافی ذہین معلوم ہوتا ہے گو اس نے زیادہ ٹیڑھے سوالات نہیں کئے تھے لیکن وہ دوبارہ آنے کے لیے کہہ گیا تھا۔

دفعۃً اس کے ذہن میں ایک ٹیس سی اٹھی۔ گریم سی کی شیشی اس کی ڈیرینگ ٹیبل میں موجود تھی اگر غلطی سے انسپکٹر تلاشی لے ڈالتا تو یہ شیشی اسے ضرور مل سکتی تھی۔ اس کے بدن میں جیسے بجلیاں سی بھر گئیں۔ وہ پھرتی سے اٹھی اور ڈیرینگ ٹیبل کے پاس پہنچ گئی دراز کھول کر اس نے ننھی سی شیشی نکال لی اور سوچنے لگی کہ اسے کہاں ٹھکانے لگایا جائے پھر ایک اور خیال اس کے دل میں آیا اسے تلف کرنا مناسب نہیں ہوگا اس زہر کو بار بار نہیں حاصل کیا جاسکتا ممکن ہے آگے چل کر اس کی ضرورت پیش آجائے کچھ شکار سامنے تھے جیسے نیلم..... جیسے انسپکٹر.....؟

☆.....☆.....☆

گریم سی کی شیشی ہاتھ میں لئے اس نے ادھر ادھر نگاہیں دوڑائیں۔ اس زہر کی افادیت کا اسے پورا پورا اندازہ تھا لیکن اسے پوشیدہ رکھنا بھی بہت ضروری تھا کوئی ایسی جگہ جہاں کسی کی نگاہ نہ پڑے۔

چھوٹی سی شیشی کو اتنی بڑی کوٹھی میں چھپا دینا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ اس نے ایک ایسی جگہ منتخب کر لی جہاں کسی کا تصور بھی نہ جاسکے اور پھر اس نے اس شیشی کو وہاں پوشیدہ کر دیا لیکن رگ و پے میں دوڑتی ہوئی سنسنی کم نہیں ہو رہی تھی۔ بستر پر لیٹ کر وہ سوچوں میں ڈوب گئی۔ انسپکٹر جو کچھ بتا رہا تھا وہ بہر حال ایک خوفناک بات تھی، یہ انسپکٹر کس طرح قابو میں آ سکتا ہے وہ زیادہ سے زیادہ کیا پوچھ سکتا ہے، زیادہ سے زیادہ اس سلسلے میں اس کی پہنچ کہاں تک ہو سکتی ہے، وہ یہی کرے گا کہ اس سے اس کے ماضی کے بارے میں پوچھے گا تو اس سلسلے میں اس نے کمال ہوشیاری سے کام لے کر بہت سے ایسے کاغذات تیار کر لئے تھے جن کے ذریعے وہ یہ ثابت کر سکتی تھی کہ وہ واقعی ساؤتھ افریقہ سے یہاں آئی ہے۔ یہ کاغذات بے شک جعلی تھے لیکن ماہر لوگوں نے تیار کئے تھے اگر کوئی بہت زیادہ گہرائیوں میں جائے تو بے شک ان کی اصلیت پاسکتا تھا۔ خاص طور سے پولیس جس کے پاس خصوصی ذرائع ہوتے ہیں، پولیس کے اصلیت تک پہنچنے سے پہلے ہی وہ روپوش ہو جائے گی۔ کسی بھی جگہ کسی اجنبی حیثیت سے وہ مکان بہر حال اس کی مستقل پناہ گاہ بن سکتا ہے جو اسے مرنے والا شخص دے گیا تھا۔

اور پھر اسے اس موبائل کا خیال آیا جس میں تانیہ اور اشعر کی مووی موجود تھی۔ ایک بار پھر اس کے بدن میں سرد لہریں دوڑنے لگیں۔ وہ موبائل بہت خطرناک ثابت ہو سکتا ہے، اگر وہ

مووی دیکھ لی جائے تو اس سے کم از کم کسی کو بھی یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ اشعر کے الفاظ جو انتہائی توہین آمیز تھے کسی کو مشتعل کر کے اس کے قتل پر آمادہ کر سکتے ہیں۔ چنانچہ سب سے پہلے اس نے اس موہائل کو ضائع کرنے کا فیصلہ کیا جو ابھی تک اس کے پاس محفوظ تھا۔

موہائل کو اس نے پتھر سے ریزہ ریزہ کر کے ایک سوکھے ہوئے گٹر میں ڈال دیا جو ناقابل استعمال تھا اور جب وہ وہاں سے پلٹی تو اس کے ذہن میں ایک اور خیال آیا، موہائل تو ضائع ہو چکا ہے لیکن نیلم کے منہ میں زبان موجود ہے۔ اس طرح کی لڑکیاں کسی کو بھی اپنا دوست بنا سکتی ہیں اور پھر خواتین کا پیٹ تو ویسے ہی ہلکا ہوتا ہے۔ نیلم کہیں کسی کے سامنے یہ انکشاف نہ کر دے کہ اس نے ایک ایسی مووی مسز عالیہ شاہ کو فراہم کی تھی جس میں اس کے خلاف اشعر کی لاف زنی تھی۔ اگر نیلم نے یہ انکشاف کر دیا تو انسپکٹر جو شکل ہی سے ذہن نظر آتا تھا اس کے بارے میں مزید شبہ کا شکار ہو جائے گا۔ بستر پر لیٹتے ہوئے اس نے غور کیا اور اس کے منہ سے ایک غراہٹ سی نکلی۔ ”نیلم“

دوسرے دن وہ معمول کے مطابق کلب جانے کے لئے تیار ہو گئی تھی۔ اس نے اپنے مزاج کے مطابق ایک سادہ سا لباس پہنا لیکن آج اس کے لباس میں گریم سی کی دو گولیاں بڑی احتیاط سے چھپی ہوئی تھیں اور اس کے ذہن میں خطرناک منصوبوں کا بسیرا تھا۔ آخر کار وہ کلب پہنچ گئی۔

کچھ شناساؤں نے گردنیں ہلائی تھیں اور اس نے مدہم سی مسکراہٹ کے ساتھ گردن خم کر کے جواب دیا تھا چونکہ وہ عام طور سے تنہا اپنی میز پر بیٹھنے کی عادی تھی اس لئے زیادہ لوگ اس کی میز پر آنے کی کوشش نہیں کرتے تھے۔ وہ خاموش بیٹھی اطراف کا جائزہ لیتی رہتی تھی اور اس وقت بھی اس نے وہی عمل کیا۔

تھوڑی دیر کے بعد اسے نیلم نظر آ گئی جو نوریز کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔ نوریز کلب کا ایک نوجوان ممبر تھا، اچھی شکل و صورت کا مالک، لیکن انتہائی شاطر اس کے ذریعہ معاش کے بارے میں کسی کو کچھ معلوم نہیں تھا۔ نوریز خوش لباس تھا۔ خوش مزاج تھا ابھی تک کلب میں اس کے نام کے ساتھ کوئی بری بات وابستہ نہیں تھی۔ نیلم اکثر نوریز کے ساتھ دیکھی جاتی تھی۔ نیلم جیسی لڑکیاں ایک دو افراد کی دوستی پر قناعت نہیں کرتیں۔ ہر ایک سے اس طرح بے تکلف ہو

جاتی ہیں جیسے وہی ان کا سب سے گہرا دوست اور شناسا ہو۔

جیسے ہی شکیلہ اپنی میز پر بیٹھی تھی دونوں نے گردن گھما کر اسے دیکھا تھا اور پھر نوریز کئی منٹ تک شکیلہ کی طرف دیکھتا رہا تھا اور شکیلہ کے ذہن میں سنائے در آئے تھے۔ نیلم سے کیا بعید ہے کہ اس نے نوریز کو کچھ تفصیلات بتا دی ہوں۔ بہر حال وہ اپنے عمل کو ہر قیمت پر پورا کر دینا چاہتی تھی۔

کچھ دیر بعد اس نے ویٹر کو ان دونوں کی میز پر ایک مشروب کے برتن سرور کرتے ہوئے دیکھا۔ یہ زیتون کا سوپ تھا جو گہرے گاڑھے رنگ کا ہوتا تھا، شکیلہ کا دل خوشی سے اچھل پڑا۔ گریم سی کی گولی اس مشروب میں پہنچ کر اپنا کام تو کر دے گی لیکن ان لوگوں کو اس کا نام و نشان نہیں ملے گا۔

وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر اگر ان کی میز کے پاس سے گزرتی ہوئی واش روم کی جانب جائے اور جاتے ہوئے ان کی میز سے ٹکرائے تو گریم سی کی گولی آسانی سے نیلم کے مشروب میں پہنچ سکتی ہے لیکن کام اس قدر برق رفتاری سے کرنا ہوگا کہ کسی کو کوئی شبہ نہ ہو سکے۔

کچھ دیر کے بعد اس نے نیلم کو وہ مشروب خاص قسم کے پیالوں میں انڈیلے ہوئے دیکھا۔ نیلم دونوں برتنوں میں کالی مرچ چھڑک رہی تھی۔ تب وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور تھکے تھکے قدموں سے آگے بڑھتی ہوئی ان کی میز کے پاس سے گزری۔ نیلم پہلے ہی اسے ہاتھ ہلا کر خوش آمدید کہہ چکی تھی جب وہ اس کی میز کے پاس سے گزری تو اس نے مسکرا کر اسے ”ہیلو“ کہا۔ اسی لمحے شکیلہ لڑکھرائی اور اس کا پرس زمین پر گر پڑا۔

فطری طور پر نوریز اور نیلم اس کے پرس کی جانب متوجہ ہوئے اور لڑکھڑا کر گرنے سے بچنے کے لئے شکیلہ نے میز کا سہارا لیا لیکن انتہائی صفائی سے اس کی دو انگلیوں کے درمیان دبی ہوئی ننھی سی گولی نیلم کے سامنے رکھے ہوئے مشروب کے برتن میں گر پڑی تھی۔ اس نے اپنا پرس اٹھایا۔ آنکھیں بھیج کر پیشانی جھٹکی اور مسکراتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔

دل بڑی طرح دھڑک رہا تھا۔ لیکن اسے اس بات کا یقین تھا کہ جس طرح اس نے فطری طور پر اداکاری کی ہے اور جس عمدگی کے ساتھ اپنا کام سرانجام دیا ہے۔ اسے کوئی دیکھ نہیں سکا ہوگا۔

وہ واش روم چلی گئی، واپس پلٹی تو دور ہی سے اس نے دیکھا کہ نیلم اور نوریز مشروب کے سب لے رہے ہیں۔ وہ اسی راستے سے چلتی ہوئی اپنی میز پر جا پہنچی۔ نیلم نے مسکراتی نگاہوں سے اسے دیکھا تھا اور وہ بھی مسکرا دی تھی۔ میز پر بیٹھ کر اس نے اپنے لئے بھی ایک مشروب طلب کر لیا اور بیزاری کے انداز میں چاروں طرف دیکھنے لگی۔ لوگ اپنی اپنی مصروفیات میں مگن تھے۔

وہ مشروب کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لیتی رہی اور پھر اس کی کاوش کا نتیجہ نکل آیا۔ نوریز والی میز پر کچھ افراتفری پیدا ہوئی تھی اور دوسری میزوں سے لوگ اٹھ کر اس طرف جا رہے تھے۔ اس نے بھی اپنی جگہ چھوڑ دی اور نوریز کی میز پر پہنچ گئی۔ نیلم کا سر میز پر رکھا ہوا تھا۔ کسی نے سرسراتی آواز میں کہا۔ ”یہ زندگی سے دور ہو چکی ہے۔“ یہ ڈاکٹر نرگس کی آواز تھی۔

چاروں طرف سے آوازیں ابھریں۔ کلب کی انتظامیہ دوڑ پڑی اور کچھ دیر کے بعد ایمبولینس آئی۔ نوریز نیلم کے ساتھ تھا۔ ہسپتال میں نیلم کی موت کی تصدیق کر دی گئی۔ کلب چونکہ انسپکٹر ارسلان خان کے تھانے کے علاقے میں تھا اس لئے اسے بھی اطلاع دے دی گئی اور نوجوان انسپکٹر ہسپتال پہنچ گیا۔ خصوصی تفتیش نوریز ہی سے کی گئی۔ ارسلان نے اس سے اس واقعے کے بارے میں پوچھا۔

”انتہائی حیرت انگیز سر..... وہ خوش و خرم تھی مجھ سے باتیں کر رہی تھی کہ اچانک زور زور سے سر جھٹکنے لگی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ کیا بات ہے تو اس نے بتایا کہ اس کا سر بُری طرح چکرا رہا ہے۔ پھر اس کی زبان لڑکھڑانے لگی۔ اس کے بعد وہ زور سے اچھلی اور اس نے سر میز پر ٹکا دیا۔ اس منظر کو آس پاس کے لوگ بھی دیکھ رہے تھے کچھ افراد میز پر آگئے اور اس کے بعد کلب کی ممبر ایک ڈاکٹر نے اسے دیکھ کر اس کی موت کی تصدیق کر دی۔

”اس وقت آپ کچھ کھا پی رہے تھے؟“

”ہاں، ہم ایک سوپ لے رہے تھے۔“

”اوہ۔ اعجاز خان، کلب سے معلوم کرو کہ اس میز پر جو برتن تھے وہ کہاں ہیں؟“

ایس آئی اعجاز خان تیزی سے دوڑ گیا تھا، کچھ لمحوں کے بعد اس نے واپس کر آ کہا۔

”نہیں جناب وہ برتن میز سے ہٹا دیئے گئے ہیں اور اب ان کی نشاندہی نہیں کی جاسکتی۔ آپ کی

اجازت کے بغیر کلب کی انتظامیہ کو ایک ہدایت کر دی ہے کہ جس ویٹریاویٹروں نے اس میز پر مشروب سپلائی کیا تھا انہیں گھر نہ جانے دیا جائے اور انتظامیہ کے اہم افراد انہیں لے کر فوراً پولیس کے پاس ہسپتال پہنچ جائیں۔“

انسپکٹر ارسلان خان نے تعریفی نگاہوں سے ایس آئی کو دیکھا اور پھر نوریز کی جانب متوجہ ہو گیا۔

”مسٹر نوریز! آپ دونوں ایک میز پر ایک ساتھ لائے ہوئے برتنوں میں مشروب پی رہے تھے۔ نیلم اس مشروب کو پی کر موت کا شکار ہو گئی جبکہ آپ بالکل صحیح سلامت ہیں۔ ایسی صورت میں پولیس کو آپ پر شک تو ہونا چاہئے، معذرت کے ساتھ آپ کو کچھ وقت ہمارے ساتھ گزارنا ہوگا۔“

”میں پولیس سے ہر طرح کے تعاون کے لئے حاضر ہوں جناب۔“ نوریز نے فراخ دلی سے کہا۔

وہ ویٹری پینچ گیا جس نے مشروب سپلائی کیا تھا۔ سیدھا سادہ معصوم سا آدمی تھا۔ اس نے بتایا کہ کاؤنٹر سے وہ مشروب لے کر آیا اور اس نے لوگوں کے سامنے سرو کر دیا۔

”ایک بات بتاؤ ویٹری مشروب جو ان برتنوں میں تھا وہ تم نے اپنے ہاتھ سے ان دونوں کے سامنے رکھے تھے میرا مطلب ہے مس نیلم اور مسٹر نوریز کے سامنے؟“

”جی سر وہ ہم نے اپنے ہاتھ سے سرو کئے تھے۔“ ویٹری نے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے اسے جانے دو۔“ اور اس کے بعد انسپکٹر ارسلان خان نے ہسپتال کے ذمے دار افراد کو جلد از جلد پوسٹ مارٹم رپورٹ پیش کرنے کے لئے کہا اور نوریز کو ساتھ لے کر تھانے آ گیا۔ نوریز کافی افسردہ نظر آ رہا تھا۔ انسپکٹر ارسلان خان نے اپنے معمولات سے فارغ ہو کر اس سے سوالات کئے۔

”مسٹر نوریز! نیلم کی آپ سے کتنے عرصے سے شناسائی ہے۔“

”تقریباً چھ ماہ سے جناب۔“

”آپ دونوں کے درمیان کس طرح کے تعلقات تھے، معاف کیجئے گا سوال کافی ذاتی ہے، لیکن آپ جانتے ہیں کہ معاملہ ایک اچانک موت کا ہے۔“

”جی جی..... آپ بے دھڑک مجھ سے ہر سوال کیجئے میں جواب دوں گا۔“

”تو پھر آپ بتائیے کہ نیلم کے آپ سے کس طرح کے تعلقات تھے؟“

”آپ یقین کیجئے وہ ایک صاف ستھری طبیعت کی مالک لڑکی تھی اور صرف مجھ سے ہی نہیں کلب میں بہت سے لوگوں سے اس کے تعلقات تھے۔ البتہ ایک بات میں آپ سے کہنا ضروری سمجھتا ہوں، نیلم کا تعلق کسی گاؤں سے تھا۔ اس کے والدین کا انتقال ہو چکا تھا۔ ایک بھائی جو شادی کے بعد اپنے معاملات میں مصروف ہو گیا تھا۔ نیلم یہاں آئی، کچھ اثاثے اپنے ساتھ لائی تھی۔ ایک فلیٹ میں رہتی تھی کرائے پر۔ کلب کی ممبرشپ اس نے خاصی رقم دے کر اختیار کی تھی اور جہاں تک میرا اندازہ ہے اپنی حیثیت سے آگے بڑھ کر اتنی بھاری رقم خرچ کر کے جو ممبرشپ اس نے حاصل کی اس کے پیچھے اس کا ایک نظریہ کارفرما تھا۔

”کیا؟“

”ایک ایسے دولت مند شخص کی تلاش جو اسے اپنالے اور اس کی زندگی بہتر انداز میں گزر جائے۔“

”آپ کو اس بات کے بارے میں کیسے علم ہوا؟“

”نیلم میری دوست تھی اس نے خود یہ بات کہی تھی کہ زندگی اس طرح نہیں گزرتی اس کے لئے ایک ساتھی درکار ہوتا ہے۔“

”مسٹر نوریز معاف کیجئے گا کیا وہ آپ سے شادی کی خواہش مند تھی۔“

”نہیں کیونکہ اسے معلوم تھا کہ میں ایک درمیانے درجے کا آدمی ہوں۔ نیلم کو میرے حالات معلوم تھے اور میں سمجھتا ہوں کہ کم از کم اس کے ذہن میں میرے لئے ایسی کوئی گنجائش نہیں تھی۔“

”کسی اور کے لئے؟“

”کچھ نہیں کہہ سکتا۔ میں نے آپ سے عرض کیا نا کہ اگر آپ کلب میں تفتیش کریں گے تو آپ کو اس بات کا پتہ چل جائے گا کہ میرے جیسے اس کے اور بھی بہت سے دوست تھے۔

”ہوں۔ آپ اس کی موت کی وجہ پر کچھ روشنی ڈال سکتے ہیں۔“

”نہیں انسپکٹر، براہ کرم آپ مجھے اس کی اس موت میں ملوث کرنے کی کوشش نہ کیجئے

میں ایسا انسان ہی نہیں ہوں، میرا پورا ماضی دیکھ سکتے ہیں آپ۔“

”اب آپ اپنے ذریعہ معاش کے بارے میں بتائیے۔ دیکھئے یہ تفتیش میں آپ سے صرف اس لئے کر رہا ہوں کہ وہ اس وقت آپ کے پاس تھی جب اس کی موت واقع ہوئی ہے۔“

”میں خود بھی اس کی موت کی وجہ جاننا چاہتا ہوں۔ اگر اس کا ہارٹ فیل ہوا ہے تو اس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے کیونکہ وہ افسردہ ضرور تھی لیکن اس قدر بھی نہیں کہ اس کی موت واقع ہو جائے۔“

نوریز نے انسپکٹر سے اس طرح تعاون کیا تھا کہ انسپکٹر کے دل میں اس کے لئے نرم گوشہ پیدا ہو گیا، اس نے نوریز سے آخری سوال کیا۔

”اب آپ اپنے ذریعہ معاش کے بارے میں بتائیں گے۔“

”جی کیوں نہیں، میں ایک تنہا آدمی ہوں انسپکٹر، زندگی گزارنے کے لئے میں نے کچھ طریقہ کار اختیار کئے ہیں، مثلاً میں نے کچھ شیئرز خرید رکھے ہیں، اس کے علاوہ کچھ رقم میں نے بینکوں میں رکھی ہوئی ہے۔ اس کی ماہانہ آمدنی ملتی ہے مجھے۔ ریس کا شوقین ہوں اور ریس والے دنوں میں لازمی طور پر ریس کورس جایا کرتا ہوں۔ ہار جیت زندگی کا حصہ ہوتی ہے لیکن بس یہی میرا ذریعہ معاش ہے، زندگی کا ایک سیٹ اپ ہے اور زندگی کے انہی لمحات کو اپنی پسند کے مطابق گزارنا چاہتا ہوں۔ خواہش میری بھی ہے کہ میرے پاس کوئی بڑی دولت آجائے اور میں دنیا کی سیر کے لئے نکل جاؤں اور یہ خواہش صرف ریس سے ہی پیدا ہو سکتی ہے۔ چنانچہ رسک لیتا رہتا ہوں آپ مجھ سے سوالات کیجئے مجھے اچھا لگ رہا ہے۔“

”آپ باتیں کرنے کے بہت شوقین معلوم ہوتے ہیں، اپنا ایڈریس لکھوا دیجئے، میں

آپ کو غیر ضروری طور پر تھانے میں نہیں رکھنا چاہتا لیکن ایک درخواست ہے آپ سے، آپ کی

ضرورت جب بھی پیش آئے آپ زحمت کیجئے گا۔“

”دل و جان سے حاضر ہوں انسپکٹر ارسلان۔“

نوریز نے کہا اس کے بعد اس نے اپنا شناختی کارڈ اور ٹیلی فون نمبر وغیرہ ارسلان کو دے

دیا اور ارسلان نے اسے پر جوش مصافحہ کر کے اسے رخصت کیا۔

رپورٹ ملی اس نے ارسلان خان کو بری طرح چونکا دیا۔ پتہ یہ چلا کہ نیلم کو زہر دیا گیا تھا، ایک ایسا زہر جو بڑی مشکل سے دریافت کیا جاسکتا ہے۔ اس کے اثرات بہت مشکل سے ظاہر ہوتے ہیں اور ان کا پتہ لگانا بہت مشکل ہوتا ہے۔

ارسلان خان دنگ رہ گیا تھا۔ ایک پوائنٹ خاص طور سے قابل غور تھا۔ وہ یہ کہ اس سے پہلے جو شخص موت کا شکار ہوا تھا یعنی اشعر، اس کا تعلق بھی اسی کلب سے تھا اور آج بھی اسی کلب کے ایک دوسرے ممبر کی موت بھی اسی انداز میں ہوئی تھی۔ انسپکٹر نے تجربے کے طور پر نوریز کو فون کیا تو نوریز نے خود ہی فون ریسیو کیا۔

”مسٹر نوریز پوسٹ مارٹم رپورٹ آگئی ہے۔ آپ کی ضرورت ہے۔“

”مجھے بتائیے میں کتنی دیر میں حاضر ہو جاؤں۔“

”جلد آجائیے پلیز۔“ ارسلان خان نے کہا اور بہر حال وہ اس شریف آدمی کی شرافت کا معترف ہو گیا۔ جو بہت ہی مختصر وقت میں تھانے پہنچ گیا تھا۔

”پوسٹ مارٹم رپورٹ کیا بتاتی ہے؟“

”جی مسٹر نوریز! نیلم کو زہر دیا گیا ہے، ایک انتہائی خوفناک زہر۔ لطف کی بات یہ ہے کہ یہی زہر اسی کلب کے ایک اور ممبر اشعر کو بھی دیا گیا تھا۔“

”اوہ میرے خدا، یہ کیا چکر ہے، ایسا کون ہے جو کلب کے ممبران کو زہر دے رہا ہے۔“

”معاف کیجئے مسٹر نوریز! اب ذرا صورت حال بدل گئی ہے۔ مجھے آپ کو مجبوراً اپنی تحویل میں رکھنا ہوگا کیونکہ اس بات کی تفتیش انتہائی ضروری ہے کہ آخر آپ کی میز پر مس نیلم کو زہر کیسے دیا گیا؟“

نوریز نے کسی قدر پریشان نگاہوں سے انسپکٹر کو دیکھا اور بولا۔ ”انسپکٹر میں آپ کے ایک ٹیلی فون پر آ گیا ہوں، کیا یہ ضروری ہے کہ آپ مجھے لاک اپ کریں؟“

”ہاں آپ کو میری تفتیش کی تکمیل تک لاک اپ میں رہنا پڑے گا۔“

”ٹھیک ہے جیسا آپ چاہیں۔ بہر حال میری ایک گزارش ہے، اگر میرے اوپر کوئی فرد

جرم لگتی ہے تو آپ کم از کم مجھے وکیل کرنے کی اجازت ضرور دیں گے۔“

”آپ مجھے اپنا دوست ہی سمجھتے۔ غیر ضروری طور پر میں آپ کو ایک منٹ لال اپ میں نہیں رکھوں گا، بس میری تفتیش مکمل ہو جانے دیجئے۔“

اور نوریز کو لاک اپ میں بند کر دیا گیا۔ شبے کی فرد لگائی گئی تھی کیونکہ نیلم نوریز کی میز پر تھی اور اس کے بعد انسپکٹر ارسلان خان نے کلب میں تفتیش شروع کر دی اور بہت سے ممبران کے بیانات لئے۔ ان بیانات سے اس بات کی تصدیق ہو گئی تھی کہ نوریز اور نیلم کے درمیان بس سرسری سی دوستی تھی، نیلم خوش مزاج لڑکی تھی اور کلب کے بہت سے ممبروں سے اس کے اسی طرح کے تعلقات تھے۔ بہر حال نوریز کو چوبیس گھنٹے لاک اپ میں رہنا پڑا۔ اس کے بعد انسپکٹر ارسلان خان نے اس سے معذرت آمیز مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ ”میں اس تعاون کے لئے ذاتی طور پر آپ کا شکر گزار ہوں، مجھ سے اگر کوئی بھی کام ہو تو آپ دوستوں کی طرح میرے پاس تشریف لے آئیے مسٹر نوریز۔“

”کچھ پتہ چل سکا کہ نیلم کی زندگی سے کھیلنے والا کون ہے؟“

”ابھی تک کچھ پتہ نہیں چل سکا۔“ انسپکٹر ارسلان خان نے پر خیال لہجے میں کہا۔

شکیلہ اس دوران باقاعدگی کے ساتھ کلب جاتی رہی تھی۔ اس نے اپنے انداز میں کوئی تبدیلی نہیں پیدا کی تھی، وہی اس کی میز، وہی خاموشی سے وقت گزارنے کی عادت۔ البتہ وہ ایک ایک لمحے سے باخبر تھی۔ اسے یہ بھی پتہ چل چکا تھا کہ پولیس نے نوریز کو تحویل میں لے لیا ہے۔ بہر حال اسے اس بات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ ان معاملات میں کون پھنستا ہے اور کون مصیبت میں گرفتار ہوتا ہے۔ اس نے اس مشکل کا ایک مرحلہ ختم کر دیا تھا جو اسے پیش آنے والی تھی۔

نیلم واقعی ایک خطرناک شخصیت ثابت ہو سکتی تھی۔ اپنے ہاتھوں ایک اور موت نے اسے آسودگی سے دوچار کیا تھا جس کی وہ خواہش مند رہتی تھی۔ اب اس کی فطرت میں ایک اذیت رسانی کی کیفیت پیدا ہو چکی تھی۔ اکثر اس کے ذہن میں طرح طرح کے خیالات آتے رہتے تھے۔ اکثر خوابوں میں اپنے آپ کو وہ ایک خون ریز ناگن کی حیثیت سے دیکھتی تھی اور شاید یہ مرض اس کے اندر ترقی پاتا جا رہا تھا۔

اس دن بھی وہ گیارہ بارہ بجے کے وقت اپنے معمولات سے فارغ ہو کر ایک کتاب

کافی تھا پھر اس کی گلوگیر آواز ابھری۔

”نوریز! مجھ سے کوئی غلطی ہوگئی ہے، کسی بات پر مجھ سے ناراض ہو، اگر ایسا ہے تو سب سے پہلے مجھے اپنی ناراضگی کی وجہ بتاؤ۔“

”میں آپ سے بالکل ناراض نہیں ہوں، میڈم عالیہ شاہ۔“

”تو پھر یہ الزام مجھ پر کیوں لگانا چاہتے ہو؟“

”اس لئے کہ یہ محض ایک الزام نہیں ہے۔“

”یہ ایک ایسی کہانی ہے جس کا میری ذات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ مجھے صرف اور

صرف بتاؤ کہ تم کیا چاہتے ہو، یہ سامنے ٹیلی فون رکھا ہے اس کے برابر موبائل فون بھی ہے، جاؤ انسپکٹر ارسلان شاہ کو فون کرو۔ اسے بلا لو اور میرے سامنے اسے ساری کہانی سناؤ۔ تم نہیں جانتے نوریز میرا ماضی کیا ہے اور میں حال میں کن حالات سے گزر رہی ہوں۔ چلو چھوڑو میری باتوں کو، تم مجھے یہ بتاؤ کہ یہ سب کچھ مجھے سنا کر تم مجھ سے کیا چاہتے ہو۔ اگر مجھے نیلم کا قاتل ثابت کر کے کوئی انتقام لینے کے خواہشمند ہو تو میں حاضر ہوں، جو کچھ میں کہہ رہی ہوں اس کا ایک ایک لفظ سچ ہے، بلا لو انسپکٹر ارسلان کو تحقیقات تو کرے گا ہی، نکما اور ناکارہ ہوا تو مجھے مجرم قرار دے دے گا نہ ہوا تو سچائیوں کی تہہ پالے گا، مگر یہ سب کچھ، یہ سب کچھ میرے لئے انتہائی تکلیف دہ ہے نوریز۔ ارے میں تو انسانوں سے پیار کرتی ہوں۔ تم کسی کے قتل کی بات کرتے ہو میں تو چڑیا کا بچہ تک نہیں مار سکتی۔ نوریز مجھے صرف یہ بتا دو کہ مجھ سے تمہیں کیا گلہ ہے۔ کیا نیلم کی موت تمہارے اعصاب پر اثر انداز ہوئی ہے؟“

”ہرگز نہیں عالیہ شاہ ہرگز نہیں، نیلم میری شناسا تھی صرف۔ میرا اس سے کوئی جذباتی تعلق نہیں تھا اور یہ بات میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ وہ اشعر سے محبت کرتی تھی، بھلا میں کسی ایسی لڑکی کو کیسے چاہ سکتا ہوں جو کسی اور کی محبت میں گرفتار ہو۔ بہر حال آپ مجھ سے بار بار یہ سوال کر رہی ہیں تو دل کی بات میں آپ سے کہہ دوں۔ میں معمولی سی زندگی کا حامل ایک شخص ہوں اور اپنی محدود آمدنی میں اپنی حیثیت سے بڑھ کر گزارہ کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ ضرورت کے نہیں ہوتی یہ بات میرے علم میں آئی تو میں نے سوچا کہ آپ سے بات کروں، آپ بہت مخیر ہیں، میری کچھ مالی امداد فرمادیں، میری زبان ہمیشہ کے لئے بند رہ جائے گی۔“

شکیلہ پھیکے سے انداز میں ہنسنے لگی۔ اب وہ مکمل طور پر اپنی ذہانت کے ساتھ نوریز کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار تھی۔ اس نے افسوس بھرے لہجے میں کہا۔ ”یہ دولت بھی کیا شے ہے، ساری مروت سارا اخلاق بھاڑ میں جھونک دیتی ہے۔ دیکھو انسپکٹر ارسلان سے تمہارا جو دل چاہے کہہ دو، میں قسم کھاتی ہوں کہ میں اپنا دفاع نہیں کروں گی، اگر انسپکٹر ارسلان مجھے ملے گا تو میں اس سے کہہ دوں گی کہ وہ میرے خلاف تحقیقات کرے اور اگر میں مجرم ثابت ہو جاؤں تو جو سزا چاہے مجھے دلوادے، مجھے اس زندگی سے کوئی زیادہ دلچسپی نہیں ہے، جانتے ہو کیوں، جاننا چاہتے ہو۔“

نوریز نے بے خیالی کے انداز میں گردن ہلا دی، شکیلہ نے آنکھیں بند کر لی تھیں، پھر اس نے کہا۔ ”صورتیں تو خدا کی بنائی ہوئی ہوتی ہیں، کیا انسان اپنی شکل و صورت خود بنا سکتا ہے، میں بچپن ہی سے اپنی شکل و صورت کی وجہ سے سب کی نفرتوں کا شکار رہی ہوں، سب کی نفرتوں کا شکار۔ کیا تم اس بات پر یقین کرو گے کہ خود میرے باپ نے مجھے اپنی ماں کی نفرت کا شکار پا کر اپنا وطن چھوڑ دیا تھا وہ صحرا صحرا قریہ قریہ مارا مارا پھرتا رہا۔ اس کی یہی آرزو تھی کہ کوئی مجھے قبول کر لے۔ کوئی مجھے اپنی زندگی کا ساتھی بنا لے وہ ایک مہم جو تھا اور اسی مہم جوئی کے درمیان اسے ایک عظیم الشان خزانہ دریافت ہو گیا، اتنا بڑا خزانہ نوریز کہ تم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے ہو۔ وہ بہت خوش تھا کہ اس خزانے کے حصول کے بعد میرے بہت سے طلب گار پیدا ہو جائیں گے۔ عدنان شاہ جو ساؤتھ افریقہ میں رہتا تھا ایسا ہی ایک شخص تھا جس نے اس پر یہ تاثر قائم کیا کہ وہ مجھے قبول کر لے گا۔ نوریز! بد صورت ہوں میں لیکن کیا چہرے کی بد صورتی دل کے حسن کو بھی ختم کر دیتی ہے۔ عدنان شاہ نے مجھے اپنا لیا لیکن جلد عروسی میں وہ مجھے یہ سب کچھ بتا کر غائب ہو گیا کہ اسے میری ذات سے کوئی دلچسپی نہیں ہے، وہ صرف خزانے کی تلاش میں ہے اور اس خزانے کے چکر میں مجھ تک پہنچا ہے۔ نوریز، میرے باپ کو جب اس بات کا علم ہوا تو وہ اس صدمے کی شدت برداشت نہ کر سکا اور اسے دل کا دورہ پڑا اور وہ جاں بحق ہو گیا۔ میں بالکل تنہا رہ گئی تھی نہ کوئی ہمدرد، نہ پرسان حال۔ عدنان شاہ نے وہ خزانہ حاصل کیا اور اس کے بعد مجھے بتائے بغیر یہاں واپس آ گیا۔ وہ خزانہ اس نے یہاں منتقل کر لیا تھا۔ اس نے ایک گھر خریدا جس میں ایک تہہ خانہ تھا اس تہہ خانے میں اس نے وہ عظیم الشان خزانہ منتقل کر دیا۔ میں

پڑھنے بیٹھی تھی کہ اطلاعی کھنٹی بجی اور اس نے ملازم کو بھیجا کہ معلومات حاصل کرے۔
ملازم نے کسی مسٹر نوریز کی آمد کی اطلاع دی تھی۔ نوریز کا نام سن کر شکلیہ کچھ لمحوں کے لئے ساکت رہ گئی تھی۔ یہ شخص اس کا اتنا گہرا شناسا تو نہیں تھا کہ اس طرح منہ اٹھا کر اس کے گھر چلا آئے، اسے واپس بھی نہیں کر سکتی تھی۔ دل میں خلش رہتی کہ نجانے کیوں آیا ہے۔ اس نے ملازم سے کہا کہ اسے ڈرائنگ روم میں بٹھائے اور جب ملازم چلا گیا تو خود تیار ہونے کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

زیادہ دیر نہیں لگائی اور ڈرائنگ روم میں پہنچ گئی۔ نوریز نے صوفے سے کھڑے ہو کر اس کا استقبال کیا تھا۔

”معافی چاہتا ہوں میڈم، اس طرح مجھے آپ کے گھر نہیں آنا چاہئے تھا لیکن بعض اوقات اس طرح کے اقدامات کرنے پڑ جاتے ہیں کہ اپنے آپ کو بھی بُرے محسوس ہوں۔“
”کوئی بات نہیں ہے مسٹر نوریز، ہماری اتنی شناسائی تو ضرور ہے کہ کسی ضرورت پر ہم ایک دوسرے سے مل سکتے ہیں، آپ تشریف رکھئے پلیز۔“ اس نے انتہا نرم اور خلیق لہجے میں کہا۔

نوریز شکر یہ ادا کر کے بیٹھ گیا۔ اس نے شاطرانہ نگاہوں سے ڈرائنگ روم کا پہلے ہی جائزہ لے لیا تھا۔ اس قدر قیمتی اشیاء سے سجا ہوا یہ ڈرائنگ روم کسی کروڑ پتی کیا ارب پتی شخص کا ہی ہو سکتا تھا۔

شکلیہ نے پوچھا۔ ”یہ بتائیے کیا پلاؤں آپ کو؟“

”نہیں میڈم، جس مقصد کے تحت میں آیا ہوں اسے سن کر آپ مجھے زہر پلانے کے علاوہ اور کچھ نہیں سوچیں گی۔“

شکلیہ مسکرا دی، بہر حال کسی حد تک اسے اپنے اعصاب پر قابو پانے کی مہارت ہو گئی تھی اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”یہ گھر جو ہے نا اس کی چھت کے نیچے آپ کو محبت اور دوستی تو مل سکتی ہے، زہر پلانے کا اس گھر سے کوئی تصور نہیں اٹھتا، بہر حال یہ آپ کی اپنی سوچ ہے، البتہ مجھے یہ بتائیے کہ آپ کے الفاظ کے معنی کیا ہیں۔“

”میڈم! زیادہ تمہید میں نہیں جاؤں گا، نیلم کا قتل زہر خورانی کے ذریعے کیا گیا ہے جس

طرح بھی نیلم کو زہر دیا گیا وہ ایک انتہائی ماہرانہ کام تھا۔ میں اس کی میز پر موجود تھا چنانچہ مجھے گرفتار کر لیا گیا، لاک اپ میں رکھا گیا اور میرے بارے میں تفتیش کی گئی۔ کیونکہ آخری بار نیلم نے میری ہی میز پر سانس لی تھی اور اس کے بعد وہ زندگی سے محروم ہو گئی تھی۔ پولیس نے مجھے مجبور کیا کہ میں نیلم کے قاتلوں کے بارے میں زبان کھولوں لیکن ایسے ہی کچھ مواقع ہوتے ہیں جب انسان تھوڑے سے صبر کا مظاہرہ کر کے اپنا مستقبل بنالیتا ہے۔ میں آپ سے عرض کروں محترمہ کہ نیلم مجھے آپ کے بارے میں پوری تفصیل بتا چکی تھی۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ آپ کے اچھے خاصے تعلقات اشعر سے قائم ہو چکے تھے۔ یہاں تک کہ آپ نے ڈیڑھ کروڑ روپے سے اس کی مدد کی اور وہ کاروبار میں گرتے گرتے پھر سے سنبھل گیا۔ اس کے بعد اشعر نے آپ کو شادی کی پیشکش کی اور شاید آپ بھی اس پیشکش کو قبول کرنے کے لئے تیار ہو گئیں لیکن نیلم نے آپ کو اس کی فطرت کے بارے میں بتایا اور یہ بھی بتایا کہ وہ صرف آپ سے آپ کی دولت کے لئے شادی کرنا چاہتا ہے، میڈم! اس کے بعد اشعر اور اس کی ایک دوست تانیہ کے درمیان کچھ گفتگو ہوئی اور نیلم نے وہ گفتگو موبائل پر ریکارڈ کر لی اور وہ موبائل آپ کو دے دیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اشعر نے نیلم سے بھی شادی کا وعدہ کیا تھا، وہ کم بخت کچھ ایسی پرکشش شخصیت کا مالک تھا کہ لڑکیاں خود بخود اس پر نثار ہونے لگتی تھیں۔ نیلم نے جوش رقابت میں آپ کو تانیہ اور اشعر کے بارے میں تفصیل بتادی اور اس کے بعد آپ انتقام پر تل گئیں اور آپ نے اشعر کو ایک انتہائی خوفناک زہر دے دیا۔ میڈم یہ صرف ایک کہانی نہیں ہے بلکہ ایک ٹھوس سچ ہے۔ پھر آپ کو یہ خوف ہوا کہ نیلم یہ انکشاف پولیس پر بھی کر سکتی ہے تو آپ نے احتیاطاً نیلم کو راستے سے ہٹا دیا۔ میں ان لمحات کو نہیں بھولوں گا جب آپ ہماری میز کے قریب سے گزر رہی تھیں اور آپ کا پرس نیچے گرا تھا اور ہم دونوں اس کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ یہ لمحہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ محترمہ عالیہ شاہ! میں تو کچھ نہیں، انسپکٹر ارسلان خان بے حد ذہین ہے۔ اگر یہ ساری کہانی انسپکٹر ارسلان تک پہنچ جائے تو آپ خود بتائیے کہ آپ کس مشکل کا شکار ہو سکتی ہیں۔“

اس وقت ایک بھرپور اداکاری کی ضرورت تھی، شکلیہ کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔ یہ آنسو کس تصور نے اس کی آنکھوں میں پیدا کئے تھے یہ تو وہی جانتی تھی لیکن اس کے چہرے سے جس مظلومیت کا اظہار ہو رہا تھا، وہ سامنے بیٹھے ہوئے کسی بھی شخص کو متاثر کرنے کے لئے

ساؤتھ افریقہ میں کئی ہوئی پتنگ کی طرح ڈولتی رہی، عدنان شاہ کو تلاش کرتی رہی اور پھر مجھے پتہ چل گیا کہ عدنان شاہ یہاں موجود ہے۔ میں اس کا تعاقب کرتی ہوئی یہاں تک آ گئی اور میں نے اسے تلاش کر لیا اور اس کے بعد میں اس کے قدموں میں گر گئی۔ میں نے اس سے کہا کہ مجھے صرف اپنا نام دے دے، ٹھیک ہے میں بد صورت ہوں، مجھے اپنی محبت کا درجہ نہ دے لیکن ایک عزت دے دے، ایک وقار دے دے۔ وہ اس پر بھی تیار نہیں ہوا تو میں نے اس کے ساتھ دھوکہ دہی کی اور اسے اس تہہ خانے میں خزانے کے ساتھ بند کر دیا۔ جہاں وہ آج تک قید ہے۔ میں ہفتے میں ایک بار وہاں جاتی ہوں اسے کھانے پینے کی اشیاء فراہم کر دیتی ہوں۔ یہ پہلا اور آخری شخص ہے جس سے میں نے اپنی توہین کا انتقام لیا ہے وہ وہیں رہتا ہے وہیں جی رہا ہے تم خود سوچو جو چیز مجھے دل کا سکون نہ دے سکی وہ میرے لئے کیا ہو سکتی ہے۔ میں کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتی اگر نقصان پہنچا سکتی تو سب سے پہلے عدنان شاہ کو قتل کرتی جس نے میری زندگی کو ایک زخم بنا دیا۔ یہ جو دولت ہے نا تم تصور نہیں کر سکتے میرے لئے کس قدر بے حقیقت چیز ہے، بتاؤ کیا چاہتے ہو، کتنی رقم درکار ہے تمہیں، لیکن ایک دوست کی حیثیت سے مجھ سے جو دل چاہے مانگ لو اور کچھ مت کرنا صرف مجھ سے ہمدردی کرتے رہنا۔ اگر دل میں کوئی ایسی بات ہے کہ نیلم میرے ہاتھوں قتل ہوئی یا اشعر میرے ہاتھوں مارا گیا تو میں تمہیں پورے خلوص کے ساتھ یہ اجازت دیتی ہوں کہ ارسلان خان کو میرے بارے میں تفصیلات بتا کر تحقیقات کراؤ اور اگر اس کے باوجود میں مجرم نہ ثابت ہوں تو مجھ سے معذرت کر لینا اور محبت کے دو بول کہہ دینا مجھ سے۔ بڑی پیاس ہے میرے سارے وجود میں محبت کی۔ اس پیاس نے مجھے خاکستر کر دیا ہے۔ بتاؤ کیا چاہتے ہو۔ کتنی دولت درکار ہے تمہیں، تمہاری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جائیں گی اگر تم وہ خزانہ دیکھ لو۔“

نوریز کے پورے بدن میں سنسنی دوڑ رہی تھی۔ شکیلہ نے جس انداز میں اسے اپنی کہانی سنائی تھی جس قدر مظلومیت کے انداز میں اس نے اسے اپنی کہانی سنائی تھی وہ اس قدر مظلومیت کا انداز تھا کہ نوریز اس پر شک کر ہی نہیں سکتا تھا۔ شکیلہ نے یہ مہارت بڑی مشکل سے حاصل کی تھی۔ وہ گردن جھکائے گہری گہری سانسیں لینے لگی تھی اور نوریز شدید کشمکش کا شکار تھا۔

اس کی آنکھوں میں سنہرے خواب جاگ رہے تھے، سونے کے انبار اس کی آنکھوں

میں چل رہے تھے، اگر شکیلہ پر اپنا اعتماد قائم کر دے اگر اس سے اتنی ہمدردی ظاہر کر دے کہ وہ اس کے فریب میں آ جائے تو زندگی سنور جائے گی۔ بہت کچھ ہو جائے گا اور فیصلہ جلد ہی کر لینا تھا۔

اس نے بھاری بھاری لہجے میں کہا۔ ”عالیہ شاہ تم نے تو میرا دل ہلا کر رکھ دیا، خواب میں بھی نہیں سوچ سکتا تھا کہ میں ایک ایسی ہستی سے ہم کلام ہوں جو اپنے اندر زخموں سے پُور وجود رکھتی ہے، بڑی بے وقوفی کی ہے میں نے عالیہ شاہ، میں سوچ رہا ہوں کہ میری نگاہیں تمہارے سامنے کیسے اٹھیں گی۔ کیا احتمالہ بات کی میں نے اور میں تمہیں سچ بتا دوں بلکہ بتا بھی چکا ہوں کہ نیلم میری محبوبہ نہیں تھی اب تو تمہیں اس بات کا علم بھی ہو چکا ہے کہ وہ اشعر کو چاہتی تھی۔ بس دوستی میری بھی تھی اس سے اور ہم لوگ اس قدر فراخ دل ہوتے ہیں کہ کوئی بھی ہمیں اپنا دوست سمجھ سکتا ہے۔ سوری عالیہ شاہ! سوری کاش میں تمہارے لئے کچھ کر سکتا اور جہاں تک بات رہی ارسلان خان کی تو مجھے صرف ایک بات پر خوشی ہے کہ جلد بازی یا کسی جوش کی کیفیت میں ارسلان خان سے میں نیلم کی بتائی ہوئی کہانی نہیں دہرا سکا اور سچ کہہ رہا ہوں اس وقت صرف یہ خیال میرے دل میں تھا کہ میں تمہیں بلیک میل کر کے رقم بٹوروں گا۔ عالیہ یہ دولت کم بخت چیز ہی ایسی ہے کہ انسان کے دل میں اس کے حصول کی خواہش پیدا ہو جاتی ہے۔ عالیہ میں سخت شرمندہ اور افسردہ ہوں اور اب ایک ہی حل رہ جاتا ہے اپنی شرمندگی کے اظہار کا وہ یہ کہ میں یہ شہر چھوڑ دوں، چلا جاؤں یہاں سے نہیں عالیہ! میں اب تمہارا سامنا نہیں کر سکتا۔ میں بھی صاحب دل ہوں، میرے دل میں بھی بہت سے احساسات ہیں اور میں اپنی ذات میں کچلا گیا ہوں، مجھے اجازت دو عالیہ، ایک بار پھر معافی چاہتا ہوں۔“

شکیلہ نے افسردہ نگاہوں سے اسے دیکھا اور بولی ”کیا میں اس قابل بھی نہیں ہوں نوریز کہ مجھ سے ہمدردی کے دو بول کہہ لو۔“

”عالیہ میرا بس چلے تو میں اپنا دل چیر کر تمہارے سامنے رکھ دوں۔ تم ہمدردی کی بات کرتی ہو، مگر میں اس سے آگے کچھ نہیں کہوں گا۔“

”تو سنو اس طرح نہ جاؤ، دوست بن کر بھی تو رہ سکتے ہو میرے۔ میں کسی سے کچھ نہیں مانگتی۔ کوئی تصور نہیں ہے میرے دل میں۔ بس کبھی مجھ سے مل لیا کرو اور ایک بار پھر میں یہ کہتی

ہوں کہ دولت کے طلبگار ہو تو دولت کی میرے پاس کی نہیں ہے۔“

”عالیہ! خزانوں کی کہانیاں کتنی عجیب ہوتی ہیں۔ میں سچ کہہ رہا ہوں، میں نے فلموں میں اس طرح کے خزانے دیکھے ہیں اور خوابوں میں سوچا ہے کہ کبھی کوئی ایسا خزانہ اپنی آنکھوں سے دیکھوں۔“

”تو دیکھ لو، میں تمہیں وہ منحوس شے دکھا سکتی ہوں جس کا میری زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔“

”نہیں عالیہ رہنے دو۔“ نوریز نے کہا۔

دو شاطر اپنا اپنا کھیل کھیل رہے تھے۔ نوریز اپنے آپ کو لا پرواہ ظاہر کر کے عالیہ پر یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ اب اسے خزانے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے بلکہ وہ عالیہ سے زیادہ متاثر ہے اور اس طرح وہ عالیہ کا اعتماد حاصل کر کے اس خزانے کو دیکھنا چاہتا تھا۔ ادھر عالیہ یہ سوچ رہی تھی کہ نوریز کو کسی بھی صورت میں آزاد نہیں رہنا چاہئے۔ ایک ایسا شخص جو اسے بلیک میل کرنا چاہ رہا تھا، بھلا دولت سے دستبردار کیسے ہو سکتا ہے۔ اسے فوری طور پر قابو میں آنا چاہیے، اس نے کہا۔ ”نوریز! میں تمہیں خزانہ دیکھنے کی دعوت دیتی ہوں۔ باقی تمہاری مرضی پر منحصر ہے۔ میں وہ منحوس شے بالکل بے مقصد اور بیکار سمجھتی ہوں اس میں سے جو کچھ بھی تم لینا چاہو لے سکتے ہو، مجھے اعتراض نہیں ہے بہر حال اب یہ تمہاری مرضی پر منحصر ہے۔“

نوریز خاموشی سے شکلیہ کو دیکھتا رہا پھر اس نے آہستہ سے کہا۔ ”کیا تم مجھ پر اس قدر اعتماد کرو گی عالیہ شاہ؟“

”کیا مطلب؟“

”مجھے اس خزانے تک لے جاؤ گی؟“

”ارے بابا! جس چیز سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے اس میں اعتماد یا بے اعتمادی کا کیا سوال۔ تم یقین کرو کہ وہ سب کچھ کسی کے حوالے کر کے اس سے ہمدردی اور محبت کے دو بول، بول لیتی ہوں وہ اس خزانے سے کہیں زیادہ قیمتی ہوتے ہیں میرے لئے۔“

نوریز نے گردن خم کر دی اور بولا۔ ”عالیہ میں وہ خزانہ دیکھنا چاہتا ہوں۔“

”جب تمہارا دل چاہے، کل کا پروگرام رکھ لیتے ہیں۔“

”آج کیوں نہیں۔“ نوریز نے کہا۔

”آج رہنے دو میں ذہنی طور پر اپنے آپ کو تیار تو کر لوں۔“

”کل کس وقت؟“

”دن کو ساڑھے بارہ بجے بلکہ یوں کرو کہ دوپہر کا کھانا تم میرے ساتھ کھا لو۔“

”ٹھیک ہے۔ اس کے بعد ہم چلیں گے۔“ نوریز نے کہا۔

شکلیہ بہت دیر تک اس سے باتیں کرتی رہی اور نوریز اس طرح کا اظہار کرتا رہا جیسے وہ شکلیہ کی باتوں سے بہت زیادہ متاثر ہو رہا ہے۔ پھر اس کے بعد اس نے واپسی کی اجازت مانگ لی۔

جب وہ چلا گیا تو شکلیہ کسی حد تک تشویش کا شکار ہو گئی۔ یہ بات معلوم ہونے کے بعد کہ شکلیہ کے خلاف اس طرح کا کوئی پروگرام زیر عمل ہے۔ اصولی طور پر شکلیہ کو اسی وقت کچھ کرنا تھا کیونکہ سانپ کو آزاد چھوڑ دینا سب سے بڑی غلطی ہوتی ہے۔ کوئی بھی واقعہ، کوئی بھی ایسا عمل ہو سکتا ہے جب اس کے بارے میں کوئی اور کارروائی ہو جائے لیکن اس وقت کچھ ممکن نہیں تھا۔ نوریز ظاہر ہے ان شکوک و شبہات کا شکار ہوا تھا جو حقیقت سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ اتنی آسانی سے شکلیہ کے جال میں نہیں پھنس سکتا تھا کل کا دن بڑی اہمیت کا حامل تھا۔ شکلیہ سوچنے لگی کہ اگر وہ لٹچ یہاں کرتا ہے تو کیا گریم سی اس پر کارآمد ہو سکتی ہے۔ امکانات تو نہیں تھے اس بات کے، کیونکہ نوریز محتاط ہوگا۔ کہیں کوئی اپنا لٹا ہی عمل نہ ہو جائے اس کے لئے اسے محنت کرنا تھی اور یہ محنت کرنا بے حد ضروری تھا، چنانچہ اس نے یہ پروگرام ملتوی کر دیا۔

دوسری طرف نوریز بے شک اس کی کہانی سے متاثر ہوا تھا لیکن خود بھی چونکہ صاف انسان نہیں تھا اور ذہنی طور پر تھوڑا سا مجرم بھی تھا، اس نے سوچا کہ ایک بہت بڑی غلطی کی ہے کہ شکلیہ کے ساتھ لٹچ قبول کر لیا ہے۔ یہ مناسب نہیں ہوا، چاہے نیلم کسی بھی طرح زہر خورانی کا شکار ہوئی ہو کم از کم ایک مشکوک شخصیت سامنے ہے تو پھر کوئی احتمال نہ رسک لینا مناسب نہیں ہوگا۔ اس بارے میں کچھ کر لیا جائے تو بہتر ہے، بہت دیر تک وہ سوچتا رہا تھا اور پھر دوسرے دن اس نے گیارہ بجے کے قریب ایک فیصلہ کیا اور فون پر شکلیہ سے کہا۔

”سوری ڈیئر عالیہ، پروگرام میں ذرا سی تبدیلی کرنی ہے اگر تم مناسب سمجھو تو۔“

”ہاں ہاں کہو نوریز۔“

”ہم دوپہر کا لُنج کینسل کرتے ہیں میں ساڑھے گیارہ بجے تک تمہارے پاس پہنچ رہا ہوں۔ ساڑھے گیارہ بجے ہم لوگ گھر سے نکل لیں گے، اپنی مطلوبہ جگہ چلیں گے اور اس کے بعد واپس آجائیں گے، میں اور تم لُنج کسی عمدہ سے ہوٹل میں کریں گے اور پھر میں تم سے اجازت لے لوں گا چونکہ مجھے اس کے بعد ایک بہت ہی ضروری کام سے جانا ہے۔“

”کوئی حرج نہیں ہے، میں تو ویسے بھی ایک بیکار شخصیت ہوں۔ میرے پاس وقت ہی وقت ہے۔ اگر تمہاری مصروفیت ہے تو بے شک میں اس پر اثر انداز نہیں ہوں گی، آج کا دن بھی نہ رکھنا چاہو تو کوئی بات نہیں۔“

”نہیں عالیہ آج ہی کا دن رکھتے ہیں تم دیکھو نا تجس کیا چیز ہوتی ہے۔“

”میں نے کہا نا مجھے دونوں صورتوں میں کوئی اعتراض نہیں ہے۔“ شکلیہ نے جواب دیا لیکن دل ہی دل میں وہ مسکرا رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ نوریز تم ایک چالاک آدمی ہو، ذرا دیر سے فیصلہ کیا تم نے لیکن بڑا مناسب فیصلہ ہے تمہارا۔ کسی پر صرف چند لمحوں میں اعتبار کر لینا شدید حماقت ہوتی ہے۔“

سلسلہ منقطع ہو گیا اور شکلیہ اپنے طور پر سوچ میں ڈوب گئی کہ اب کیا طریقہ کار مناسب ہوگا۔ ویسے اگر واقعی نوریز اس کے ساتھ لُنج قبول کر لیتا تب بھی شکلیہ نے بڑے غور و خوض کے ساتھ یہ فیصلہ کیا تھا کہ گریم سی کا استعمال کسی بھی طور ایک ایسے آدمی پر ممکن نہیں ہوگا جو اس سلسلے میں مشکوک ہے، ہو سکتا ہے کہ وہ برتن جس میں گریم سی ہو نوریز تبدیل کر دے اور اس کو لینے کے دینے پڑ جائیں البتہ وہ ایاز کو جس طرح قتل کر چکی تھی اگر اسی انداز میں کوشش کی جائے تو زیادہ بہتر رہے گا اور اس کے لئے اسے مناسب تیاریاں کرنی تھیں۔ نوریز کے پاس اپنی کار بھی موجود تھی لیکن شکلیہ وہاں جانے کے لئے اپنی کار استعمال کرنا چاہتی تھی اور یہی سب سے اہم مرحلہ تھا اس کے لئے اور یہ تیاریاں اسے بہت مختصر وقت میں کرنا تھیں۔ بہر حال یہ سارے کام اس کے لئے مشکل نہ رہے۔ نوریز مقررہ وقت پر اس کے پاس پہنچ گیا تھا۔

شکلیہ نے اس وقت بھی اپنی اداکاری برقرار رکھی اور بہت زیادہ گرما گرمی کا مظاہرہ نہیں کیا، نوریز آیا تو اس نے لباس تک تبدیل نہیں کیا ہوا تھا۔

”ارے..... کیا تم تیار نہیں ہو عالیہ؟“ نوریز نے بے تکلفی سے کہا۔

”نوریز میں بہت تھکی ہوئی ہوں، دنیا سے، زندگی سے، اچھا ہوا تم مجھے مل گئے، کم از کم ایک ایسا راز دار تو ہے میرے ساتھ جو ایک قیمتی خزانے کے بارے میں تفصیلات جانتا ہے، میں اگر اس دنیا میں نہ رہی تو یہ قیمتی چیز بیکار پڑی تو نہ رہ جائے گی، کوئی تو ہوگا جو اس سے فائدہ اٹھا سکے۔“ شکلیہ نے مغموم مسکراہٹ کے ساتھ کہا اور نوریز کے دل میں پچھلے لگ گئے۔

دل ہی دل میں اس نے سوچا کہ محترمہ ایسا تو جس قدر جلد ہو جائے بہتر ہے، آپ کا اس دنیا میں رہنا ضروری تو نہیں ہے، بیکار زندگی گزار رہی ہیں آپ، نہ کوئی پرسان حال، نہ کوئی ہمدرد نہ رفیق، اتنا بڑا خزانہ اگر کسی ضرورت مند کو مل جائے تو زندگی کا رخ ہی بدل جائے، بشرطیکہ آپ سچ بول رہی ہوں۔

بہر حال شکلیہ نے لباس نہیں تبدیل کیا، بس یونہی بال وغیرہ سنوارے اور وہ باہر نکل آئی نوریز نے کہا۔ ”اپنی گاڑی میں چلتے ہیں ہم۔“

”نہیں، تم اپنی گاڑی ادھر کھڑی کر دو، میں اپنی کار نکال رہی ہوں، میں خود ڈرائیو کروں گی۔“

”تم تھکی تھکی سی ہو عالیہ۔“

”نہیں نوریز جو کچھ میں کہہ رہی ہوں وہی کرو۔“ شکلیہ نے سرد لہجے میں کہا۔

”ٹھیک ہے بھی اس میں کسی بحث کی کیا گنجائش ہے۔“ نوریز بولا۔

شکلیہ نے اپنی گاڑی باہر نکالی تو نوریز نے اپنی گاڑی اندر لا کر کھڑی کر دی اور پھر وہ دونوں گاڑی میں بیٹھ کر چل پڑے۔ جو لباس اس وقت شکلیہ نے پہنا ہوا تھا اس کا انتخاب اس نے نہایت ہوشیاری کے ساتھ کیا تھا لباس میں کوئی ایسے بٹن وغیرہ نہیں تھے جو ٹوٹ کر گر جائیں اور اس کی نشاندہی کر دیں، اس کے علاوہ اس کے پاس زیور چوڑی کوئی لاکٹ یا انگوٹھی یا کوئی بھی ایسی چیز نہیں تھی جو بعد میں اس کی نشاندہی کر دے۔ اپنی کار بھی اس لئے لے کر نکلی تھی کہ اس میں اس کا دوسرا لباس ضرورت کی دوسری اشیاء مثلاً وہ برق آسا چھری جو اس طرح بدن کے ٹکڑے کر دے کہ جس شخص کے بدن میں اتاری جائے لمحوں تک اسے بھی پتہ نہ چلے کہ کیا ہو گیا ہے۔

ان تمام چیزوں سے لیس ہو کر ہی وہ گھر سے باہر نکلی تھی۔ جوتے بھی اس نے اس طرح کے پہن رکھے تھے کہ ان کے ذریعے کسی طرح کی وقعت نہ ہو۔

نوریز بھی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا اور وہ خود بھی خاموش تھی، فاصلے طے ہوتے گئے۔

شکیلہ کی نگاہیں چاروں طرف جائزہ لے رہی تھیں اس علاقے کے بارے میں اسے کافی معلومات حاصل تھیں اور وہ جانتی تھی کہ قرب و جوار کا ماحول ہمیشہ ہی اس طرح رہتا ہے کہ اس میں کوئی ہنگامہ خیزی نہیں ہوتی، اس وقت بھی ہر طرف ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ اس نے گاڑی ایک انتہائی محفوظ جگہ کھڑی کر دی اور نوریز کے ساتھ وہ اندر داخل ہو گئی۔ نجانے کیوں اس مکان میں داخل ہوتے ہوئے نوریز کا دل بری طرح دھڑکا تھا۔ کسی اندرونی حس نے اسے خوفزدہ ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔ کوئی ایسا لمحہ تھا جو اسے یہ احساس دلا رہا تھا کہ اس کا اس طرح بے دھڑک چلے آنا اس کے لئے نقصان دہ ہے۔

بہر حال مرد تھا کسی عورت کے سامنے اپنی کمزوری کا اظہار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ خود کو سنبھال لیا اور شکیلہ کے ساتھ مکان میں داخل ہو گیا۔

شکیلہ کے چہرے پر رفتہ رفتہ ایک عجیب سی کیفیت طاری ہوتی جا رہی تھی۔ وہ اپنے ذہن کو بوجھل محسوس کر رہی تھی، بہر حال جو کچھ اسے سرانجام دینا تھا وہ اپنے طور پر ایک اہمیت کا حامل تھا۔ نوریز اس کے ساتھ قدم بڑھاتا ہوا آگے بڑھنے لگا اور کچھ لمحوں کے بعد وہ اس کمرے میں داخل ہو گئے جہاں سے تہہ خانے میں اترنے کا راستہ تھا۔ شکیلہ نے آگے بڑھ کر وہ کاٹھ کباڑ ہٹانا شروع کر دیا جس کے بعد اندر جانے کا راستہ ظاہر ہوتا تھا۔ نوریز سحرزدہ سا اس منظر کو دیکھ رہا تھا۔ یہاں تک کہ کچھ لمحوں کے بعد وہ دروازہ بھی نمودار ہو گیا۔ لیکن اس کے کھلتے ہی بدبو کا ایک شدید بھبھکا باہر کی جانب لپکا اور دونوں نے چنگلی سے ناک پکڑ لی۔

”یہ..... یہ بدبو کیسی ہے؟“ نوریز بمشکل تمام بول سکا۔

”اپنے چہرے کو ڈھک لو، اس تہہ خانے سے ہمیشہ ایسی ہی بدبو آتی ہے۔“ شکیلہ نے ایک لمحہ ضائع کئے بغیر کہا۔

”یوں لگتا ہے جیسے انسانی گوشت سڑ رہا ہو۔“

”خوفناک باتیں مت کرو، ناک پر رومال رکھ کر یا رومال باندھ کر میرے ساتھ آ جاؤ۔“

شکیلہ نے کسی قدر خشک لہجے میں کہا۔

دل میں وہ یہ سوچ رہی تھی کہ ذرا سی غلطی ہو گئی۔ نوریز کو یہاں لانے سے پہلے یہاں کا ایک چکر لگالینا چاہئے تھا کیونکہ شیلہ کو وہ یہاں بند کر گئی تھی اور بھوک پیاسی شیلہ کو اصولی طور پر زندہ ہونا بھی نہیں چاہیے تھا یہ اس کے سڑتے ہوئے گوشت کی بدبو تھی۔ خزانہ ایسی ہی چیز ہوتی ہے کہ انسان موت تک کو نظر انداز کر بیٹھتا ہے۔

نوریز نے ناک پر رومال کس لیا، خود شکیلہ نے بھی اپنے لباس سے ناک ڈھک لی تھی اور اس کے بعد وہ تہہ خانے میں اترتے چلے گئے، شدید بدبو پھیلی ہوئی تھی اور شکیلہ سوچ رہی تھی کہ یہ گڑبڑ ہو گئی۔

بہر حال نوریز تہہ خزانے کی آخری سیڑھی اترنے کے بعد وہاں موجود چیزوں کا جائزہ لینے لگا، آس پاس کچھ نظر نہیں آ رہا تھا، خود شکیلہ بھی چاروں طرف نگاہیں دوڑا رہی تھی، شیلہ کی لاش اسے نظر نہیں آئی تھی، یقینی طور پر وہ خزانے کے اس انبار کے پیچھے ہو گئی۔

نوریز نے پھر کہا۔ ”اوہ عدنان شاہ! کیا یہ اس کے مردہ جسم کی بدبو تو نہیں ہے۔“

”آؤ نوریز، ان فضول باتوں میں پڑنے کے بجائے تم وہ اصل چیز دیکھو۔ میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ اس تہہ خانے میں اس طرح کی بدبو مستقل آتی رہتی ہے اور اس کی بنیادی وجہ وہ گٹر ہے جو اس گوشے میں موجود ہے۔“

”اوہ تو یہ کہونا۔“

”آؤ۔“ شکیلہ نے کہا اور اس کے بعد وہ نوریز کو لئے ہوئے اس جگہ پہنچ گئی جہاں وہ منحوس خزانہ موجود تھا۔

خزانے کی پہلی جھلک دیکھ کر ہی نوریز بے حواس ہو گیا۔ وہ خوفناک بدبو بھی اس کے دماغ سے نکل گئی۔ پھر اس کی لرزتی ہوئی آواز ابھری۔ ”میں، میں اسے چھو کر دیکھ سکتا ہوں۔“

”کیوں نہیں۔ یہ بے حقیقت شے میرے لئے قابل نفرت ہے۔“ شکیلہ نے جواب دیا اور نوریز نے گردن گھما کر عجیب سی نظروں سے شکیلہ کو دیکھا پھر خزانے کی طرف متوجہ ہو گیا۔

شکیلہ نے لباس میں چھپی ہوئی چھری کو ہاتھ سے چھو کر دیکھا۔

کے ایک گوشے میں لے جا کر اس نے نوریز کے جسم کو ڈال دیا اور اس کے بعد شیلہ کے جسم کو دیکھنے لگی۔

اس کے جسم کو ہاتھ لگانا بڑا گھناؤنا عمل تھا لیکن وہ ہمت کر کے آگے بڑھی۔ نوریز کے جسم کو بھی جب اس نے گھیٹ کر اس کوٹے میں ڈالا تو خون کی لکیریں وہاں تک چلی گئیں، خود اس جگہ جہاں نوریز نے دم توڑا تھا کافی خون جمع تھا۔ شکیلہ نے شیلہ کی ٹانگ پکڑی اور اسے گھیٹتی ہوئی اس جگہ تک لے گئی جہاں نوریز کا جسم پڑا ہوا تھا۔ اسے بہر حال اس بدبو کا احساس تھا جو اس تہہ خانے میں پھیلی ہوئی تھی۔ اسے اس بدبو سے نجات حاصل کرنا بہت ضروری تھا۔ اس نے اپنے ذہن میں طے بھی کر لیا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔

وہ تہہ خانے سے باہر نکل آئی۔ اپنے ساتھ کئی چیزیں لائی تھیں جو کار میں پوشیدہ تھیں مثلاً نیا لباس، نئے جوتے، البتہ گاڑی سے پٹرول نکالنے کے لئے اسے کسی برتن کی تلاش ہوئی اور گھر کے کچن میں وہ بہت سے برتن اس طرح چھوڑ گئی تھی جو اس وقت اس کے معاون ہوئے اور اس نے ایک برتن میں گاڑی سے پٹرول نکالا اور اسے لئے ہوئے واپس تہہ خانے کی جانب چل پڑی۔

اپنا لباس ایک طرف رکھ کر وہ پٹرول کے برتن سے ان دونوں لاشوں پر پٹرول چھڑکنے لگی اور اس کے بعد اس نے ماچس کی تیلی جلا کر ان پر پھینک دی۔ پٹرول نہایت احتیاط سے ڈالا گیا تھا۔ تہہ خانے میں بے شک دھواں وغیرہ بھرنا تھا، وہ باہر نکل آئی۔ ابھی اسے اور بھی بہت کچھ کرنا تھا، چنانچہ اس نے گھر میں واپس تلاش کیا، پانی کی بالٹی بھی لی اور اس کے بعد تیار ہو گئی۔ اس کمرے کے دروازے کھڑکیاں پہلے ہی سے بند تھیں۔ اس نے اپنی ناک بھی بند کر لی تھی جیسے ہی کمرے میں داخل ہوئی اندر سے اٹھنے والی گوشت کی سڑاند نے ایک طرح سے دم گھونٹ دیا۔ وہ غور کرنے لگی کہ اس بدبو اور دھوئیں کو باہر نکلنا ہی ہے، اگر دروازہ کھول دیا جائے تو یہ بدبو کتنے فاصلے تک پہنچ سکتی ہے اپنے طور پر اس نے یہ اندازہ لگایا کہ مکانات کافی دور دور ہیں اور پھر یہاں کے سنسان ماحول نے اس سلسلے میں اور بھی مدد کی تھی۔ وہ اس بدبو اور سڑاند سے بچنے کے لئے خود بھی باہر نکل آئی اور اس کے بعد گھر کے دروازے پر پہنچ گئی۔ یہاں سے اس نے چاروں طرف کا جائزہ لیا، بدبو بے شک یہاں بھی پھیلی ہوئی تھی لیکن تیز ہوا چل رہی

انتہائی وحشت ناک تھا، خون کی پھواریں اڑا کر خونی خزانے کے سنہرے رنگ میں رنگ آمیزی کر رہی تھیں۔ شکیلہ فاصلے پر جا کر نوریز کے تڑپتے ہوئے جسم کو دیکھتی رہی خون کی کچھ جھینٹیں لباس کو رنگدار کر رہی تھیں لیکن اس سے بچنا آسان نہیں تھا۔ آخر کار نوریز کا پھڑپھڑاتا ہوا جسم سرد ہو گیا تو شکیلہ نے ایک گہری سانس لی اور اس کے منہ سے آواز نکلی۔

”یقین کرو، بعض اوقات مجھے اپنی فطرت پر خود بھی سخت حیرانی ہوتی ہے کہ میں اس قدر سنگدل کیسے ہو گئی مگر میں جانتی ہوں کہ ایسا کیسے ہوا۔ قصور وار میں نہیں ہوں بلکہ وہ حسین عورت ہے جس نے اپنے غرور میں ایک ایسا وجود تشکیل دے دیا جو انسانیت کے لئے کس قدر ہولناک ہے۔ یقین کرو کبھی جب تنہائی میں مجھے اپنی سفاکی کا خیال آتا ہے تو میں خود حیران رہ جاتی ہوں اب بیکار باتیں سوچنے سے کچھ نہیں حاصل، تم چلے گئے، جانا ہی چاہیے تھا تمہیں، ارے ہاں شیلہ کہاں ہے؟“

اور پھر وہ بند صندوقوں کے پیچھے پہنچ گئی۔ شیلہ کا بھیا نک پیکر وہاں موجود تھا۔ اس نے ایک لرزہ خیز منظر دیکھا۔ انسانی جسم میں اگر روح نہ ہو تو سارا جسم کس طرح بگڑنے لگتا ہے وہ اس وقت اس کی نگاہوں کے سامنے تھا۔ شیلہ کا جسم خمیری آنے کی طرح پھول گیا تھا اور اس سے بدبو کے بھپکے اٹھ رہے تھے۔ وہ تو شکر تھا کہ تہہ خانے میں کیڑے موجود نہیں تھے۔ ہاں یہ کیڑے اگر خود سڑے ہوئے گوشت میں پیدا ہو جائیں تو اور بات ہے لیکن ابھی شاید اس کا وقت نہیں آیا تھا وہ شیلہ کے جسم کو دیکھتی رہی اس نے کہا۔ ”سوری شیلہ! تم بھی نوریز ہی کی طرح تھیں یعنی میرے راز سے واقف ہو گئی تھیں۔ ہر وہ شخص جسے میرا راز معلوم ہو جائے زندہ رہنے کا حقدار نہیں ہے۔ ایک بار صرف ایک بار مجھے وہ عورت مل جائے جس نے مجھے یہاں تک پہنچا دیا ہے میں اسے وہاں تک پہنچا دوں جہاں میں اسے پہنچانا چاہتی ہوں میں وعدہ کرتی ہوں میرے ہاتھوں سے مرنے والو تم سے، کہ اس کے بعد میں پرسکون ہو جاؤں گی اور انتظار کروں گی کہ کوئی بھی لمحہ مجھ سے میری زندگی لے لے، پتہ نہیں میں جینا چاہتی ہوں یا مرنا بس یہی فیصلہ میرے لئے مشکل ہے۔“

وہ شیلہ کے پاس سے ہٹ گئی اور پھر اس نے نوریز کے جسم کو دیکھا اور آگے بڑھ کر اس کی دونوں ٹانگیں پکڑ لیں، اسے گھیٹتی ہوئی ایک طرف لے جانے لگی، وسیع و عریض تہہ خانے

عالیہ کے دونوں ہاتھ پیچھے سے آگے آگئے اور وہ بہت ہی پتلی سی بجلی کی لہر جسے چھری کہہ لیا جائے تو کوئی حرج نہیں ہے، فضا میں کوندی اور بانیں پہلو سے دائیں پہلو تک اس طرح گزر گئی کہ نوریز حیرت سے دیکھتا ہی رہ گیا۔

پھر اچانک ہی اسے اس تکلیف کا احساس ہوا جو اس کے وجود کے کپڑوں پر آیا اور نوریز کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ شکلیہ ایک دم سے پیچھے ہٹ گئی تھی۔ نوریز کے کٹے ہوئے جسم سے اب خون تیز رفتاری سے باہر نکلنے لگا تھا اور شکلیہ بہر حال اپنے آپ کو اس خون سے بچانا چاہتی تھی۔ نوریز چند قدم آگے بڑھا۔ وہ گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھ گیا اور کسی ندیدے کتے کی طرح شکلیہ کو ٹکنے لگا۔

شکلیہ نے ہنستے ہوئے کہا ”ہاں نوریز، سونے اور جواہرات کے اس طرح کے ڈھیر بڑی انسانی جانیں لیتے ہیں۔ ان کے ارد گرد ایسے ہی کھیل ہوتے ہیں۔ سوری یار تم نے بے شک میری بد صورتی کا مذاق نہیں اڑایا لیکن جو کام تم کرنے آئے تھے میں نے اس کی تکمیل کر دی۔ میں ایک بات کہوں تم سے یہ حقیقت ہے کہ میں خود آج تک اپنے دل کی گہرائیوں میں نہیں جھانک سکی، غالباً یہ اتنا آسان کام بھی نہیں ہے لیکن میں جینا چاہتی ہوں، میری آرزو ہے کہ ایک بار صرف ایک بار وہ ہو جائے جو میرے دل میں ہے۔ کیا ہے میرے دل میں، اس کا ذرا میں اندازہ لگا لوں، آں..... آں..... کوئی کوشش مت کرو، بیکار ہے۔ ہاں اگر تم چاہو تو میں یہ چھری تمہارے زرخرے پر اور پھیر دوں تا کہ تمہیں زندگی کی اذیت سے نجات مل جائے، موت تو اب تمہارا مقدر ہے۔“

”مم..... مجھے، مجھے بچالو، میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔“

”بے وقوف، اگر اس طرح کا کوئی خیال ہوتا میرے دل میں تو میں تمہیں یہاں تک نہ لاتی۔ چلو تمہارے ساتھ ایک مہربانی اور کئے دیتی ہوں۔“

شکلیہ نے اپنی جگہ چھوڑ دی اور نوریز کے عقب میں پہنچ گئی اور پھر اس کے بعد اس تیز برق نما چھری نے نوریز کی گردن زرخرے کے پاس سے کاٹ دی اور نوریز کا سر سینے پر لٹک گیا۔

وہ گھٹنوں کے بل بیٹھا تھا چنانچہ اوندھا گر گیا اور اس کے بعد اس کے تڑپنے کا منظر

☆.....☆.....☆

سونے کی سنہری چمک نے نوریز کے حواس پر پوری طرح قبضہ کر لیا تھا۔ وہ سحر زدہ نگاہوں سے سونے اور جواہرات کے اس ڈھیر کو دیکھ رہا تھا، ایسے خزانے کو حاصل کرنے کے لئے تو زندگی کو نجانے کیسے کیسے موت سے ہمکنار ہونا پڑتا تھا لیکن یہ عظیم الشان خزانہ اس کے سامنے پڑا ہوا تھا اور اس کا حصول بھی مشکل نہیں تھا۔ کیا ضرورت ہے اس کے لئے عالیہ سے درخواست کرنے کی، دور دراز علاقے میں یہ تہہ خانہ عالیہ کی قبر بن سکتا ہے۔ کوئی نہیں جان سکے گا کہ کیا ہوا۔ بس عالیہ پیش منظر سے ہٹ جائے گی اور پھر اس کے بعد ایک نئی زندگی کا آغاز۔ اس نے خزانے سے نگاہیں ہٹا کر عالیہ کی طرف دیکھا۔

عالیہ دونوں ہاتھ پشت پر باندھے اسے ہی دیکھ رہی تھی، اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”کیوں..... دیکھا تم نے سونے کے اس چمکدار ڈھیر کو۔ کیسی عجیب و غریب چیز ہے یہ۔ ایک لمحے کے اندر اندر انسان کے خیالات بدل دیتا ہے۔ تم سوچ رہے ہو اس پر قبضہ جمانے کے لئے اور اس کے لئے میرا قتل ضروری ہے۔ پھر اسے بآسانی حاصل کیا جاسکتا ہے لیکن میرے دوست تمہارے پاس میرے کچھ راز ہیں اور میں نے زندگی میں آج تک ایک ہی عقل کا کام کیا ہے اپنے کسی رازدار کو اس دنیا میں نہیں چھوڑا۔“

نوریز اس کی باتیں سن رہا تھا۔ خزانے کا سحر اب تک اس کے دماغ پر ایک نشے کی طرح مسلط تھا۔ اس نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ عالیہ شاہ کو قتل کر دے لیکن وہ اس سے کیا کہہ رہی تھی اس کے کانوں تک تو ضرور پہنچ رہا تھا البتہ ابھی اس نے اس کے الفاظ کے مفہوم پر غور نہیں کیا تھا اور یہ تو ہونا ہی تھا۔

جب وہ ان تمام کاموں سے فارغ ہو کر اپنے بیڈروم میں پہنچی تو اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اس کا جسم پھول کی طرح ہلکا ہو گیا ہو۔ پچھلے کچھ عرصہ سے وہ محسوس کرنے لگی تھی کہ جب بھی اس کے ہاتھوں کسی انسان کا قتل ہوتا ہے اس کے سارے رگ و پے میں ایک فرحت بخش کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ بڑا سکون محسوس کرتی ہے۔ آہ یہ سب کچھ اچھا تو نہیں ہے لیکن میں کیا کروں؟ اگر میں بد صورت پیدا ہو گئی تو اس میں میرا کیا قصور تھا، لیکن دنیا نے ایک عجیب و تیرہ اختیار کیا، کیا بد صورتی کا مذاق اسی طرح اڑانا چاہیے اور اگر مذاق اڑاتے ہو تم لوگ تو پھر اس کے نتائج کے ذمہ دار بھی تمہی ہو، کوئی کیا کرے۔

سب انسپکٹر مخدوم شاہ نے اطلاع دی تھی کہ نوریز چند روز سے کلب آرہا ہے نہ ہی وہ اپنے گھر پر موجود ہے، کہیں سے اس کا پتہ نہیں چل رہا اور پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس کی گاڑی ایک پبلک مقام پر کھڑی ہوئی ہے۔ وہاں سے تھانے کو رپورٹ کی گئی تھی کہ چار دن سے ایک گاڑی اس جگہ کھڑی ہوئی ہے اور کوئی اسے لینے نہیں آیا۔ پولیس اس گاڑی کو بہر حال لفر سے اٹھا کر لے آئی۔

رجسٹریشن آفس سے اس گاڑی کی چھان بین کی گئی تو وہ نوریز نامی کسی آدمی کی نکلی جس کا ایڈریس وغیرہ بھی پتہ چل گیا تھا اور بالکل اتفاقیہ طور پر مجھے اس علاقے کے تھانے کے ایک ایس آئی سے اس گاڑی کے بارے میں علم ہوا کیونکہ آپ نے مجھے نوریز کے لئے ہدایت کی تھی اس لئے میں حیران ہوا اور پھر میں نے مزید تفصیلات معلوم کیں۔

انسپکٹر ارسلان خان اپنے ماتحت مخدوم شاہ کے منہ سے یہ ساری کہانی سن کر گہری سوچ میں ڈوب گیا تھا۔

وہ نجانے کیوں کلب میں ہونے والی ان دو اموات سے غیر مطمئن تھا۔ یہ قتل تو ثابت ہو چکے تھے کیونکہ ان کے جسم میں زہر خورانی کے اثرات پائے گئے تھے۔ وہ اس بات کو نظر انداز نہیں کر سکا تھا کہ جس کسی نے بھی ان دو ہستیوں کو زہر دیا ہے وہ بہت ہی چالاک ہے اور کلب سے اس کا ضرور کوئی تعلق ہے۔

ہر چند کہ عالیہ شاہ اس سلسلے میں بالکل غیر متعلق ثابت ہوئی تھی، لیکن نجانے کیوں انسپکٹر

تھی اور بہت زیادہ شدت نہیں محسوس ہو رہی تھی۔ اس کا مطلب ہے کہ بدبودور تک نہیں جائے گی، وہ باہر کا جائزہ لیتی رہی، کہیں کوئی تحریک نہیں ہوئی جو اسے بڑا مطمئن کر رہی تھی۔

ایک بار پھر وہ واپس تہہ خانے کی جانب پلٹی، لاشیں جل کر خاکستر ہو چکی تھیں۔ ان سے مدھم مدھم دھواں اٹھ رہا تھا۔ اس نے مزید پٹرول ان پر ڈال دیا، وہ چاہتی تھی کہ ہڈیاں تک سلگ کر کوئلہ بن جائیں تاکہ بدبودوغیرہ کا امکان نہ رہے۔ وہ چاہتی تھی کہ جب تک یہ آگ بجھے وہ یہیں رہے۔ وہ بار بار باہر جا کر ماحول کا جائزہ لے لیتی تھی۔ جب ہر طرح سے اطمینان ہو گیا تو اس نے غسل خانے میں جا کر اپنا جسم دھویا، نیا لباس اور جوتے پہن لئے۔ پرانا لباس اور جوتے اس نے انہی ہڈیوں پر ڈال دیئے تھے۔ لمحوں کے اندر اندر لباس اور جوتوں وغیرہ نے آگ پکڑ لی۔ بدبودو مکمل طور پر تو نجانے کب تک ختم ہوتی لیکن اتنا ضرور ہو گیا تھا کہ اب وہ باہر نہیں جا رہی تھی چاروں طرف سے مطمئن ہونے کے بعد اس نے پوری طرح سے ہر سمت کا جائزہ لیا۔ ایک نشان بھی ایسا باقی نہیں رہ گیا تھا جو اس کی نشاندہی کر سکے، البتہ اس نے ایک کام ضرور کیا۔ وہ چھری اس نے تہہ خانے ہی میں ایک ایسی جگہ چھپا دی جہاں اگر کبھی دوبارہ ضرورت پیش آجائے تو اسے باہر سے لانے کا مسئلہ یا جھگڑا نہ رہے۔ اس کے بعد وہ وہاں سے باہر نکل آئی اور اپنے ایک ایک قدم پر غور کرتی ہوئی آخر کار مکان کے دروازے سے باہر نکل آئی اور کار میں جا بیٹھی۔

قرب و جوار بالکل سناں پڑے ہوئے تھے، انسانوں نے ایک دوسرے سے اس قدر دوری اختیار کر لی ہے کہ اگر وہ خود بھی کبھی کسی مصیبت میں پھنس جائیں تو کوئی پرسان حال نہ ہو۔ عالیہ یا شکیلہ جیسے لوگوں کے لئے ایسا ماحول بڑا کارآمد ثابت ہوتا ہے۔

شکیلہ کار میں بیٹھ کر چل پڑی اور پھر تھوڑی دیر کے بعد گھر پہنچ گئی۔ البتہ نوریز کی کار وہاں موجود تھی اسے ٹھکانے لگانا بہت ضروری تھا۔ ایک لمحہ ضائع کئے بغیر وہ یہ کام بھی کر لینا چاہتی تھی۔ نوریز اپنی کار کی چابی یہیں چھوڑ گیا تھا۔ اس نے چابی نکالی اور اس کے بعد ہاتھوں پر دستاں پہن کر نوریز کی کار میں جا بیٹھی۔ پھر اس نے کار ایک ایسے بھرے پرے علاقے میں ایک شاپنگ سینٹر کی پارکنگ میں پارک کی اور وہاں سے واپس پلٹی۔ پھر ایک ٹیکسی روک کر اس میں بیٹھی اور گھر واپس چل پڑی۔

کے لئے سرکاری طور پر کارروائی کرتا ہوں تو اس میں کافی وقت لگ جائے گا اور پھر یہ ایک بڑا لمبا پراسیس ہے، اس عورت پر نجانے کیوں بار بار میری نگاہ پڑنے لگتی ہے۔ مخدوم شاہ مجھے یوں لگتا ہے جیسے میں نے اسے کہیں پہلے بھی دیکھا ہو اور یہ بات ایک گرہ بن گئی ہے میرے دماغ میں، مگر بالکل یاد نہیں آیا کہ میں نے اسے کہاں دیکھا ہے۔ میری یادداشت اتنی کچی بھی نہیں ہے، میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں اس سلسلے میں کیا کروں۔“

”سرویسے تو آپ جو کچھ سوچ رہے ہیں اس کی یقیناً کوئی بڑی وجہ ہوگی لیکن کبھی کبھی بعض چہرے ہمیں خواہ مخواہ جانے پہچانے محسوس ہوتے ہیں، حالانکہ ہم نے انہیں کبھی نہیں دیکھا ہوتا۔“

”بالکل ٹھیک کہا تم نے، ایسا ہوتا ہے لیکن کیا ہم عالیہ شاہ کو نظر انداز کر دیں۔“

”نہیں سر، اصل میں آپ کے ذہن میں جو یہ الجھن پیدا ہوئی ہے، وہ یوں ہوئی ہے کہ اشعر کا عالیہ سے گہرا تعلق تھا اور اس کے بعد نیلم کو بھی عالیہ کے آس پاس دیکھا گیا۔ مجھے ایک بات کا شبہ تھا کہ یہ نوریز جو ہے نا اس کے بارے میں جو ہمیں تفصیلات معلوم ہوئی ہیں ان سے یہی پتہ چلا ہے کہ دو نمبر آدمی ہے۔ اس کا کوئی باقاعدہ کاروبار سیٹ نہیں ہے اور جو کاروبار بظاہر نظر آتا ہے وہ صاف صاف یوں لگتا ہے کہ اس نے دکھاوے کے لئے تیار کیا ہے ورنہ اس کا ذریعہ معاش کچھ اور ہی ہے۔ اچھا خاصا دولت مند آدمی ہے، یہ ضرور اپنے اندر کوئی گہرائی رکھتا ہے۔“

”وہ غائب ہے، حالانکہ میں نے اسے ہدایت کردی تھی کہ اگر شہر چھوڑ کر کہیں جائے تو مجھے اطلاع ضرور دے۔“

مخدوم شاہ پر خیال انداز میں گردن ہلانے لگا تھا۔ تھوڑی دیر تک خاموش رہنے کے بعد ارسلان خان نے کہا۔ ”مخدوم شاہ تم ایک کام کرو۔“

”جی سر آپ حکم دیجئے۔“

”میرا خیال ہے ہفتے دس دن تم عالیہ شاہ کا تعاقب کرو۔ اس کے مشاغل کیا ہیں، کہاں جاتی ہے، بیرونی دنیا سے کیا تعلق ہے؟ اس کے علاوہ تم یوں کرو کہ کلب چلے جاؤ یا پھر اس کا تعاقب کرتے ہوئے کسی بھی ایسی جگہ جہاں وہ تمہیں لا پروا نظر آ جائے اس کی کچھ تصویریں

ارسلان خان کے ذہن میں ایک عجیب سی کشمکش تھی۔ وہ عالیہ شاہ کو ایک عام شخصیت نہیں سمجھ رہا تھا۔ اس کی گہرائیوں میں کچھ ہے ضرور۔ نوریز بھی بظاہر بے قصور نکلا تھا اور کوئی ایسی بات سامنے نہیں آئی تھی جس سے یہ ظاہر ہو سکے کہ نوریز نیلم کے قتل میں ملوث ہے، نیلم جس طرح عام لوگوں کی دوست تھی اسی طرح نوریز کی بھی دوست تھی اور اس سلسلے میں ارسلان خان کافی تحقیقات کر چکا تھا۔ نجانے کیوں نوریز کی اس طرح گمشدگی بھی اسے عجیب لگ رہی تھی اور اس کا ذہن بار بار عالیہ شاہ کی طرف جارہا تھا۔ پھر مخدوم شاہ نے نوریز کی کار کے بارے میں جو رپورٹ دی تھی وہ مزید شکوک و شبہات کا اظہار کرتی تھی۔ نوریز کا اپنا گھر تھا، اس گھر میں چار کاریں کھڑی ہو سکتی تھیں پھر یہ کیا قصہ تھا کہ وہ اپنی کار کسی پبلک مقام پر کھڑی کر کے غائب ہو گیا اور غائب ہوا تو کہاں غائب ہوا بھرے پرے گھر اور بھرے پرے کاروبار کا مالک تھا، سب کچھ اس نے یونہی چھوڑ دیا تھا آخر کیوں۔“

وہ کرید میں لگا رہا اور آخر کار اس نے اپنے معتمد خاص مخدوم شاہ ہی کو طلب کیا۔

”یار مخدوم! سرکاری فرائض انجام دینا بہت بڑی ذمہ داری ہے، میں کوشش کرتا ہوں کہ اپنے کام بخوبی سرانجام دوں، جس قدر میری صلاحیت ہے میں اپنے کسی کام میں کوتاہی نہیں کرتا لیکن بعض معاملات ایسے ہوتے ہیں جنہیں نظر انداز کرنے سے کم از کم ذہنی بیماری ختم ہو جاتی ہے، اب اس بات کا کیا کیا جائے کہ میں انہیں نظر انداز نہیں کرتا۔“

”سر میں آپ کے بارے میں جانتا ہوں، آپ بڑی دیانتداری سے اپنے فرائض سرانجام دیتے ہیں اور یہ بات میں ہی نہیں ایس پی ابراہیم صاحب بھی دو تین بار ڈی ایس پی صاحب سے کہہ چکے ہیں کہ یار یہ شخص ضرور ترقی کرے گا اس کا خیال رکھنا، بڑی محنت سے اپنے کام کرتا ہے۔“

”یہ تو خدا کا شکر ہے مخدوم شاہ کہ میری کارکردگی میرے اعلیٰ افسران کی نگاہوں میں ہے، میں ان دنوں ایک بڑی الجھن کا شکار ہوں اور یہ الجھن ان دو انسانوں کے قتل سے متعلق ہے، میں ایک پریشانی میں مبتلا ہوں۔“

”کیا سر، کیا آپ مجھے بتانا پسند کریں گے؟“

”مسز عالیہ شاہ، اگر میں ساؤتھ افریقہ سے اس کے بارے میں معلومات حاصل کرنے

بنالو۔ یہ تصویریں پرنٹ کرا کے ان میں سے کچھ مجھے دو، باقی اپنے پاس محفوظ رکھو، ہم تھوڑی سی تفتیش کرتے ہیں اس کے بارے میں۔ اگر ہمارا ذہن صاف ہو جاتا ہے تو پھر ٹھیک ہے ورنہ دیکھیں گے کہ اور کیا کیا جاسکتا ہے۔ بہر حال ان اموات کی تفتیش تو میرے ذمے ہے، اعلیٰ حکام کسی بھی وقت رپورٹ طلب کر سکتے ہیں۔“

”سر میں خوشی سے یہ کام کر لوں گا۔ تھوڑا سا وقت درکار ہوگا، اصل میں میری والدہ کافی بیمار ہیں اور بہت دن سے ان کا علاج ہو رہا ہے۔ میں سوچ رہا ہوں انہیں ہسپتال میں داخل کرادوں۔“

”ضرور ضرور۔ ظاہر ہے کوئی بھی کام چند گھنٹوں میں تو نہیں ہو جاتا تم پہلے اپنے کام سے فراغت حاصل کر لو۔“

”نہیں سر، انہیں بس ہسپتال پہنچانا ہوگا۔ دیکھ بھال میری بیوی کرے گی۔“

”کچھ مجھ سے چاہو تو بتا دو۔ کسی خاص ہسپتال میں داخلے کا پروگرام ہے؟“

”جی سر، لیکن یہ کام میں کر لوں گا، جہاں کہیں آپ کی ضرورت پیش آئی وہاں میں ضرور آپ کو زحمت دوں گا۔“

”ٹھیک ہے شکریہ۔“ ارسلان خان نے کہا اور گہری سوچوں میں ڈوب گیا۔

مخدوم شاہ نے اپنے کام کا آغاز کر دیا۔ اس نے ارسلان خان کی ہدایت کے مطابق پہلے اپنی والدہ کا ہسپتال میں چیک اپ کرایا اور اس کے بعد ڈاکٹروں کی ہدایت پر انہیں ہسپتال میں داخل کر دیا۔ ایک پولیس افسر کی وردی ہی ہسپتال کے عملے کے لئے کافی ہوتی ہے۔ مخدوم شاہ کی والدہ کا بہترین علاج ہونے لگا۔ اپنی بیوی کو ان کی تیمارداری پر چھوڑ کر مخدوم شاہ اپنے کاموں میں مصروف ہو گیا۔

عالیہ شاہ کے گھر کے آس پاس پہلے وہ سادہ لباس میں چکر لگاتا رہا اور یہ اندازہ لگاتا رہا کہ اس گھر میں کتنے افراد رہتے ہیں۔ آس پاس سے تھوڑی بہت معلومات حاصل کرنے سے یہی پتہ چلا کہ یہ میڈم کہیں باہر سے آئی ہیں۔ اچھی ملنسار عورت ہیں۔ محلے والوں کو کبھی ان کی ذات سے کوئی شکایت نہیں ہوئی، یہاں بہت کم لوگ آتے ہیں بلکہ آنے والوں کی آمد نہ ہونے

کے برابر ہے، البتہ شام کو خاتون تیار ہو کر اپنی گاڑی میں کہیں چلی جاتی ہیں۔ مخدوم شاہ کو دو دن تک تو موقع نہیں مل سکا لیکن تیسرے دن وہ کلب جا پہنچا اور اس نے بڑی احتیاط کے ساتھ عالیہ شاہ کی کئی تصویریں بنا ڈالیں۔ اصل میں ان دنوں جدید ترین آلات نے بہت سے مسائل حل کر دیئے ہیں۔ اب بڑے بڑے کیمروں کی ضرورت باقی نہیں رہی ہے۔ چھوٹے چھوٹے موبائل سیٹ اور ڈیجیٹل کیمرے آگئے ہیں جن کی پر فارمنس قابل دید ہوتی ہے۔ بہر حال مخدوم شاہ نے ڈیجیٹل کیمرے سے عالیہ شاہ کی بڑی واضح تصاویر بنائیں اور پھر انہیں کاغذ پر منتقل کرالیا۔ ان میں سے چند تصویریں ارسلان خان کو دینے کے بعد وہ باقی کارروائیوں میں مصروف ہو گیا۔ والدہ کی دیکھ بھال بھی ضروری ذمہ داریوں کا ایک حصہ تھی اور اس دن وہ اپنی ماں کے پاس ہی بیٹھا ہوا تھا۔ نرس نے بزرگ خاتون کو دو انجکشن دیئے اور مخدوم شاہ کی بیوی کو ان کے بارے میں کچھ ہدایات دینے لگی۔

بیوی تفصیلات سن رہی تھی۔ ایک برتن اس کے ہاتھ میں تھا جو اچانک اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گرا تو مخدوم شاہ جلدی سے اس خیال کے تحت برتن پر لپکا کہ نیچے گرنے سے آواز ہوگی۔ جیسے ہی وہ برتن اٹھانے کے لئے جھکا اس کی جیب سے عالیہ شاہ کی دو تصویریں نکل کر نیچے گر پڑیں۔ نرس دو قدم پیچھے ہٹ گئی تھی، مخدوم شاہ نے معذرت کر کے پہلے برتن پھر تصویریں اٹھائیں۔ نرس کسی قدر حیران ہو گئی اور اس نے سرسراہٹ ہوئی آواز میں کہا۔ ”سرا ایک منٹ ایک منٹ.....“ مخدوم شاہ رک گیا۔

”یہ تصویر پلیز آپ مجھے دکھائیے.....“ نرس بولی اور مخدوم شاہ نرس کو حیرانی سے دیکھنے لگا۔ پھر اس نے تصویر آگے بڑھا دی۔ نرس نے تصویر اس کے ہاتھ سے لے لی۔

پھر نرس کی سرسراہٹ ہوئی آواز ابھری۔

”صاحب جی یہ تصویر کس کی ہے؟“

اب مخدوم شاہ چونکا۔ عالیہ شاہ کی تصویر دیکھ کر یہ نرس اس قدر حیران کیوں ہوئی ہے، اس نے سوچا اور پولیس والی رگ پھڑک اٹھی بولا۔ ”کیوں کیا بات ہے سسٹر، آپ اس تصویر کو دیکھ کر کیوں حیران ہوئیں۔“

”صاحب جی یہ تو شکلیہ ہے۔“

”شلیہ۔“

”ہاں جی، میری دوست، میری بہت پرانی دوست میں اسی لئے حیران ہوئی کہ یہ تصویر آپ کے پاس کہاں سے آگئی؟“

مخدوم شاہ نرس کا چہرہ دیکھنے لگا، سیدھی سادی شریف سی عورت تھی، اس نے کہا ”تم تھوڑا سا وقت مجھے دوگی سسٹر۔“

”ہاں جی کیوں نہیں، بڑی اچھی دوست تھی یہ میری، ناراض ہو کر چلی گئی میرے پاس سے، اسی ہسپتال میں نرس رہ چکی ہے۔“

”تم نے اسے ٹھیک سے پہچان لیا؟“

”بہت پرانی دوستی ہے جی میری، بے شک تھوڑی سی موٹی ہو گئی ہے اور کپڑے وغیرہ بھی بہت اچھے پہنے ہوئے ہے۔ پہلے تو میرے ساتھ معمولی سی نرس تھی۔“

”کچھ اور بتاؤ گی اس کے بارے میں سسٹر۔ آؤ اس طرف آ جاؤ۔“

”جی صاحب جی۔ ہم ڈیوٹی پر ہیں وقت نہیں ہے ہمارے پاس، مگر بات ہی کچھ ایسی ہے آئیے۔“

راستے میں مخدوم شاہ نے اس سے پوچھا۔

”کہاں رہتی ہیں آپ؟“

”جناب یہیں کوارٹر ہے تھوڑے فاصلے پر۔“

”سسٹر آپ کو یقین ہے کہ یہ شلیہ ہی ہے۔“

”لگ تو وہی رہی ہے جناب، تھوڑا سا حلیہ بے شک بدل لیا ہے پر ہمیں وہی لگ رہی ہے۔“

”اچھا، سسٹر یہ آپ کے پاس سے کب گئی؟“

”کئی مہینے ہو گئے جناب، اصل میں بس ناراض ہو گئی تھی تھوڑی سی اور پھر بیچاری بڑی دکھوں کی ماری ہے۔“

”اگر یہ آپ کے سامنے آ جائے تو آپ اسے پہچان لیں گی۔“

”آپ ہمیں یہ بتائیے صاحب، کہ یہ ہے کہاں؟“

”میں آپ کو اس سے ضرور ملا دوں گا سسٹر، آپ ذرا سی تکلیف کیجئے مجھے اپنے کوارٹر کا پتہ بتا دیجئے۔“

”صاحب جی کوئی الٹی سیدھی بات تو نہیں ہے، اصل میں یہ بعد میں کچھ بیماری ہو گئی تھی۔ بیماری تو بیچاری کو بچپن ہی سے لگی ہوئی تھی کیا بتائیں آپ کو اس کے بارے میں۔“

”سسٹر میں آپ سے آ کر ملوں گا اور آپ کو اس کے بارے میں پوری تفصیل بتاؤں گا۔ آپ بالکل بے فکر رہیں۔ سسٹر کہتا ہوں میں آپ کو، آپ میری بہن ہی کی مانند ہیں۔“

”نہیں صاحب جی، آپ شریف آدمی ہو، ہمیں پتہ ہے۔“

”آپ کی ڈیوٹی کس وقت ختم ہو جائے گی؟“

”سات بجے، اس کے بعد سے ہم کوارٹر پر ہی ہوں گے، ہمارا کوارٹر نمبر فور فائیو سی ہے۔“

”میں آپ کے پاس آٹھ بجے پہنچوں گا سسٹر۔“

”ٹھیک ہے جناب۔“ نرس نے تصویر مخدوم شاہ کو واپس کر دی۔

”آپ کا نام کیا ہے؟“

”نادیہ جی۔“ نرس نے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے سسٹر نادیہ، آٹھ بجے آپ سے ملاقات ہوگی۔“

مخدوم شاہ کے دل میں عجیب سی اٹٹھن ہو رہی تھی، یہ انکشاف اچانک ہی ہوا تھا بعض اوقات اتفاقات پتہ نہیں کہاں سے کہاں پہنچا دیتے ہیں۔ یہ نرس جو کچھ کہہ رہی ہے غلط تو نہیں ہوگا۔ دیکھیں کیا نتیجہ نکلتا ہے۔ وہ سوچ رہا تھا۔ ماں کی کیفیت خاصی بہتر تھی۔ بیوی سے بات

چیت کی اور اسے مستعد رہنے کی ہدایت کر کے وہاں سے چل پڑا۔

اب اسے انسپکٹر ارسلان خان کی تلاش تھی جو اسے تھوڑی دیر کے بعد مل گیا، وہ بیٹھا ہوا کوئی فائل دیکھ رہا تھا، مخدوم شاہ کو دیکھ کر اس نے فائل بند کی اور بولا۔ ”خیر تو ہے مخدوم شاہ تم

اس وقت کیسے آ گئے، تمہیں تو اس وقت ہسپتال میں ہونا چاہئے تھا۔ والدہ خیریت سے ہیں، یار تم یقین کرو میں بس کچھ دیر کے بعد انہیں دیکھنے کے لئے ہسپتال جانے ہی والا تھا، یہ سوچ رہا

تھا کہ پہلے گھر جا کر وردی تبدیل کر دوں گا اور اس کے بعد ہسپتال پہنچ جاؤں گا۔“

”بالکل نہیں سسٹر، آپ کی اتنی ہی مہربانی کافی ہے کہ آپ نے ہمیں یہاں آنے کا موقع دیا۔“

”بات اصل میں یہ ہے صاحب جی کہ میں بھی بے اختیار ہو گئی ہوں۔ اس لڑکی کی کہانی بہت عجیب تھی اور میں حیران ہوں کہ آخر یہ کہاں گئی۔ صاحب جی آپ کے حیران ہونے کی وجہ تو میں نہیں جانتی لیکن اپنی حیرانی کی وجہ میں آپ کو بتائے دیتی ہوں۔ یہ ایک اچھے گھرانے کی لڑکی تھی۔ باپ ایک بد صورت آدمی تھا۔ ماں بہت خوبصورت تھی اور اپنے حسن پر نازاں تھی۔ اس نے اپنے شوہر کو دو کوڑی کا بنا کر رکھا ہوا تھا۔ جب یہ پیدا ہوئی تو یہ بھی بد صورت تھی۔ اس کی ماں نے اس کی پیدائش کے پہلے دن سے ہی اس سے نفرت کا اظہار کیا جس سے یہ سانیکو ہوتی چلی گئی۔ پھر اس کے باپ کا ایک حادثے میں انتقال ہو گیا اور اس کی ماں نے اپنے پرانے کالج کے محبوب سے شادی کر لی اور ملک چھوڑ کر باہر چلی گئی، اس نے اپنی بیٹی کو بیچ دیا تھا جہاں یہ لوگ رہتے تھے، یہ در بدر ہو گئی اتفاق سے میری اس سے اسی ہسپتال میں شناسائی ہو گئی، چنانچہ یہ میرے پاس آ گئی۔ میں اس کے دکھ درد کو جانتی تھی۔ میں نے اسے اپنے پاس رکھ لیا اور تھوڑے عرصے کے بعد میں نے اسے یہاں نرس لگوا دیا۔ بہت محنت اور ذمے داری سے کام کرتی رہی لیکن جب کبھی اس کی صورت کا مذاق اڑایا جاتا تو اس پر دیوانگی طاری ہو جاتی تھی اور اس وقت صاحب جی یہ دنیا کا خطرناک سے خطرناک کام کرنے پر آمادہ ہو جاتی تھی۔ میں اس کے بارے میں کوئی غلط لفظ نہیں کہہ سکتی لیکن اتنا ضرور کہہ سکتی ہوں کہ اس پر خون سوار ہو جاتا تھا۔ نرس کی حیثیت سے اس نے یہاں بڑا نام پیدا کر لیا تھا لیکن اچانک ہی اس کے کام خراب ہونے لگے، ایک مرتبہ ہمارے ہسپتال کے بڑے ڈاکٹر صاحب نے اسے برا بھلا کہا پھر اس نے استعفیٰ دے دیا اور کچھ اس طرح اپ سیٹ ہو گئی کہ خاموشی سے گھر چھوڑ کر چلی گئی۔ بس اس کے بعد سے مجھے اس کے بارے میں کچھ نہیں معلوم۔“

ارسلان نادیہ کی شکل دیکھتا رہا۔ اس کی پیشانی پر گہری شکنیں پھیلی ہوئی تھیں۔ نادیہ کے بیان سے کوئی خاص نتیجہ اخذ نہیں کیا جاسکتا تھا۔ وہ بہت دیر تک سوچتا رہا اور پھر اس نے نادیہ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ کا بہت بہت شکریہ سسٹر، ہمارا تعلق پولیس سے ہے اور ہم اس عورت کے بارے میں تحقیقات کر رہے ہیں۔ اسی سلسلے میں یہ تصویریں ہمارے پاس تھیں۔“

”بہت بہت شکریہ سر وہ بالکل خیریت سے ہیں، میرا خیال ہے میں ایک بہت ہی اہم خبر لے کر آیا ہوں۔“

”ہاں ہاں بولو، آؤ بیٹھو۔“ ارسلان خان نے مہربان لہجے میں کہا۔
مخدوم شاہ شکریہ ادا کر کے بیٹھ گیا۔ پھر اس نے کہا۔ ”سر ہسپتال میں ایک عجیب اتفاق ہو گیا۔ میرے پاس وہ تصویریں موجود تھیں جو میں نے کلب میں عالیہ شاہ کی بنائی تھیں، ایک نرس اس وقت میری والدہ کی تیمارداری کر رہی تھی کہ میں کچھ اٹھانے کے لئے جھکا اور وہ تصویریں میری جیب سے گر پڑیں۔ میں نے تصویریں اٹھائیں تو نرس چونک کر بولی کہ شکلیہ کی یہ تصویر میرے پاس کہاں سے آئی۔“

”شکلیہ.....“ ارسلان خان نے ٹوکا۔

”جی سر اس نے یہی نام لیا۔“

”اچھا پھر؟“

”وہ اس بات پر مصر ہو گئی کہ یہ تصویر شکلیہ ہی کی ہے، بس وہ ذرا موٹی ہو گئی ہے، میں نے زیادہ تفصیل نہیں پوچھی اس سے، وہ ہسپتال ہی کے نرسنگ کوارٹرز میں رہتی ہے۔ نادیہ نام ہے، میں نے اسے آٹھ بجے کا وقت دیا ہے، ملاقات کے لئے۔“

”اسے یقین تھا کہ یہ تصویر کسی شکلیہ نامی عورت کی ہے؟“

”جی سر وہ کہہ رہی تھی کہ یہ تھوڑے عرصے پہلے اس کے پاس نرس تھی۔“

ارسلان خان گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر اس نے کہا ”بے چین کر دیا تم نے یار، چلو ٹھیک ہے آٹھ بجے کا انتظار کئے لیتے ہیں۔“

ٹھیک آٹھ بجے مخدوم شاہ اور ارسلان خان نے نرس نادیہ کے کوارٹر پر دستک دی تھی اور کوارٹر کا دروازہ نادیہ ہی نے کھولا تھا۔

”آئیے صاحب جی، میں آپ ہی کا انتظار کر رہی تھی۔“

”شکریہ نادیہ۔ یہ ارسلان خان صاحب ہیں۔“

”صاحب جی، آئیے یہ گھر آپ کے شایان شان تو نہیں ہے پر جو کچھ حاضر ہے آئیے بیٹھے، میں چائے بناتی ہوں آپ کے لئے۔“

آپ بہت اچھی خاتون ہیں اور آپ یہ بات بھی جانتی ہیں کہ قانون کی مدد کرنا کتنی اہمیت کا حامل ہوتا ہے، ہو سکتا ہے ہم آپ کو زحمت دیں، آپ کو تکلیف اٹھانی پڑے گی۔“

”مگر کیوں صاحب جی، کیا بات ہے، کیا اس نے کوئی جرم کر ڈالا ہے، وہ دماغی مریض ہے صاحب جی، کچھ بھی کر سکتی ہے اور ایک بات آپ کو میں اور بتا دوں، اس کے چہرے کے نقوش سو فیصد شکیلہ جیسے ہیں لیکن یہ جس لباس اور جس سلیقے میں نظر آ رہی ہے وہ شکیلہ جیسا نہیں ہے، اپنے آپ پر تو وہ کبھی توجہ ہی نہیں دیتی تھی اور دوسرے لوگ بھی کہا کرتے تھے کہ سسٹر شکیلہ ہسپتال کے کچھ آداب ہیں آپ ان کا خیال رکھا کریں وہ لاپرواہی سے ان کی بات ٹال دیا کرتی تھی۔ پھر یہ کچھ ذرا موٹی بھی ہو گئی ہے، میں نہیں کہہ سکتی کہ وہی ہے یا کوئی اور.....“

”آپ ہمیں ایک بات کا جواب دیجئے سسٹر، اگر کبھی ہمیں آپ کی ضرورت پڑی تو کیا آپ ہماری مدد کریں گی؟“

”صاحب جی قانون کی مدد کرنا تو بہت ضروری ہوتا ہے اتنی بات میں ضرور جانتی ہوں۔ آپ بے فکر رہیں۔ میں ہر طرح آپ کی مدد کروں گی۔“

”ٹھیک ہے سسٹر، ہمیں اجازت دیجئے۔“

ارسلان خان اور مخدوم شاہ نادیہ کے کوارٹر سے باہر نکل آئے لیکن دونوں کے چہروں پر الجھن نظر آ رہی تھی، ارسلان خان نے کہا ”والدہ کے پاس جانا چاہتے ہو تو جاؤ، کل آفس میں ملاقات ہوگی۔“

”اگر آپ حکم دیں سر تو میں آپ کے ساتھ ہی چلوں۔“

”نہیں اس وقت میں گھر جاؤں گا کل البتہ دس بجے تک آفس پہنچ جانا۔“ ارسلان خان نے کہا۔

مخدوم شاہ کسی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا وہ بولا۔

”سر! ایک بات میرے ذہن میں آ رہی ہے۔“

”کیا؟“

”کیوں نہ نرس نادیہ کو عالیہ شاہ کے سامنے لایا جائے اور پھر عالیہ شاہ کا رد عمل دیکھا جائے، اس کے علاوہ نادیہ بھی یہ تصدیق کر دے گی کہ وہ شکیلہ ہے یا نہیں، یہ قدم تو اٹھانا پڑے گا

جائے، اس کے علاوہ نادیہ بھی یہ تصدیق کر دے گی کہ وہ شکیلہ ہے یا نہیں، یہ قدم تو اٹھانا پڑے گا

جناب۔“

”میں نے خود بھی اس بارے میں ایک لمحے کے لئے سوچا تھا مخدوم شاہ لیکن مجھے کچھ خطرہ نظر آتا ہے۔“

”کس طرح کا سر؟“ مخدوم شاہ نے سوال کیا۔

”پہلی بات تو یہ کہ اگر وہ شکیلہ ہی ہوئی تو نادیہ کو دیکھ کر ایک دم ہوشیار ہو جائے گی اور اس کے بعد پتہ نہیں وہ کیا قدم اٹھائے۔ دوسری بات یہ کہ نادیہ نے جس طرح اس کے بارے میں بتایا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ خود نادیہ اسے چاہتی ہے اور اسے دیکھ کر نادیہ کا ذہن بھی بھٹک سکتا ہے، نہیں یہ مناسب نہیں ہوگا، کسی بھی طرح نہیں۔“

”ایسے ہی سر بس میرے ذہن میں یہ خیال آیا تھا۔“

”خیال اچھا تھا لیکن ہمیں تھوڑا سا اور وقت درکار ہے، ذرا کوئی ٹھوس بات پتہ چل جائے۔ تم آرام کرو، کل پہنچ جاؤ، کل اس سلسلے میں مزید کوئی موثر قدم اٹھائیں گے۔“

اس رات ارسلان خان بہت دیر تک سوچوں میں ڈوبا رہا۔ اس نے اپنی تربیت کے مطابق اس کیس پر از سر نو غور کیا تھا۔ ایک ایسی عورت جو دولت مند ہے، تنہا ہے، نوجوان ہے وہ بقول نرس نادیہ سائیکو بھی ہے اور اپنی بد صورتی سے نفرت بھی کرتی ہے اور ان لوگوں سے بھی جو اس کی بد صورتی کا مذاق اڑاتے ہیں اگر وہ نرس شکیلہ ہی ہے تو پھر اس کے پاس اتنی دولت کہاں سے آئی۔ وہ اس طرح اپنے آپ کو بدلنے میں کیسے کامیاب ہوئی یہ ایک الجھن تھی، ایک معمہ تھا اور وہ اس بارے میں غور کر رہا تھا، دیگر یہ کہ ہسپتال کی کسی نرس کو ہی ایسے کسی زہر کے بارے میں معلومات حاصل ہو سکتی ہیں جو انسانی جسم پر بہت مشکل سے ظاہر ہوتا ہے۔ وہ ایک غریب عورت تھی، بد صورت تھی اور بقول نادیہ اس کی ماں نے اس سے ہمیشہ نفرت کی اور پھر اچانک ہی ارسلان خان اچھل پڑا، وہ بستر سے نیچے اتر آیا تھا۔ اس کے اندر شدید بے چینی اور وحشتیں نمودار ہو گئی تھیں۔ اسے یاد آ گیا تھا کہ اس شکل کو اس نے کہاں دیکھا ہے۔ اوہ میرے خدا، واقعی یہ وہی عورت تھی، اس وقت ارسلان خان ایک اور سینئر آفیسر انسپکٹر ضمیر احمد شاہ کو اسسٹ کر رہا تھا جب ایک خوفناک قتل ہو گیا تھا۔ ایک شخص ایاز احمد بڑی بے دردی سے قتل کر دیا گیا تھا اور اس سلسلے میں انسپکٹر ضمیر احمد تفتیش کر رہا تھا۔ وہ معلومات حاصل کرتے ہوئے علاقے کے

ایک گھر میں پہنچے تھے جہاں رشیدہ نامی ایک ملازمہ انہیں ملی تھی اور وہ رشیدہ یہی عورت، عالیہ شاہ تھی یعنی وہ نرس شکیلہ بھی تھی اور رشیدہ بھی اور اب اتنا وقت گزرنے کے بعد عالیہ شاہ، نرس شکیلہ نے رشیدہ تک اور رشیدہ کے بعد عالیہ شاہ تک کا سفر کیسے طے کیا، اس بارے میں بے شک کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا لیکن بات بڑی سنسنی خیز تھی۔ اس کا پس منظر ضرور تھا، اب اس کے علاوہ اور کوئی چارہ کار نہیں تھا کہ دوسرے دن وہ ایاز احمد کی بیوہ سے اس گھر میں رہنے والی ملازمہ رشیدہ کے بارے میں معلومات حاصل کرے۔

چنانچہ دوسرے دن جب مخدوم شاہ مقررہ وقت پر اس کے پاس پہنچ گیا تو وہ مخدوم شاہ کو لے کر چل پڑا۔ وہ جگہ اسے معلوم تھی جہاں وہ واردات ہوئی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ اس گھر پر پہنچ گیا، جہاں تفتیش کے دوران انسپکٹر ضمیر احمد خاں کے ساتھ آیا تھا۔

گھر کے دروازے پر تالا لگا ہوا تھا، وہ تھوڑی دیر تک قرب و جوار کا جائزہ لیتا رہا اور پھر اس کے بعد وہاں سے واپس پلٹ پڑا۔ اس نے یہ اندازہ لگانے کی کوشش کی تھی کہ گھر میں کوئی ہے یا نہیں۔ اس سلسلے میں وہی گھر سب سے زیادہ کارآمد تھا جو ایاز احمد کا تھا۔ ایاز احمد کے گھر کے دروازے پر بھی ایک چوکیدار موجود تھا۔ اس نے ایاز احمد کی بیوہ کے بارے میں پوچھا تو چوکیدار نے بتایا۔

”نہیں صاب یہ گھر حمید صاحب کا ہے، ہمیں حمید صاحب نے ہی نوکر رکھا ہے، ادھر جو مالک لوگ رہتا تھا مالک کا قتل ہو گیا اور ان کا بیگم صاب اپنے بھائی صاب کے گھر چلا گیا، حمید صاب ان کا بھائی ہے، انہوں نے میرے کو ادھر چوکیدار رکھا۔ اب اس گھر میں کوئی نہیں رہتا، بس میں رہتا ہے۔“

”اور ایاز صاحب کی بیگم؟“

”وہ اپنے بھائی صاب کے گھر رہتا ہے۔“

”چوکیدار مجھے ان کے گھر کا پتہ بتاؤ۔“

چوکیدار نے بے چون و چراں حمید احمد کے گھر کا پتہ بتا دیا۔ پھر ارسلان خان نے کہا۔

”چوکیدار وہ سامنے والا گھر دیکھتے ہو؟“

”جی صاب روزانہ دیکھتا ہے، جب بھی باہر نکلتا ہے ہم اس گھر کو دیکھتا ہے۔“

”کیوں؟“ ارسلان خان نے چونک کر پوچھا۔

”صاب وہ نظر آتا ہے کیونکہ سامنے ہے۔“

چوکیدار نے معصومیت سے کہا اور مخدوم شاہ ہنس پڑا۔

”میرا مطلب ہے ادھر کوئی رہتا ہے۔“

”نہیں صاب، تالا پڑا رہتا ہے۔“

”مستقل۔“

”جی صاب۔“

”تم نے کبھی کسی کو ادھر آتے ہوئے نہیں دیکھا۔“

”نہیں صاب، کبھی بہت دن کے بعد کوئی گاڑی ادھر آ کر رکتا ہے۔ اب اس گاڑی سے

کون اترتا ہے، کون اندر جاتا ہے میرے کو نہیں معلوم۔“

”کون سی گاڑی ہے؟“

”چلنے والا صاب، موٹر موٹر۔“ چوکیدار نے کہا۔

”بے وقوف آدمی، موٹروں کی بھی قسمیں ہوتی ہیں۔ دیکھو یہ پولیس جیپ ہے، کاریں

ہیں، کس طرح کی گاڑی آتی ہے ادھر؟“

”صاب خدا قسم میرے کو نہیں معلوم، جو چلتا ہے میں اس کو گاڑی سمجھتا ہے۔“

چوکیدار سے بس حمید احمد کا پتہ چلا تھا اور ارسلان خان نے فیصلہ کیا کہ وہاں جا کر ایاز

احمد کی بیوہ سے معلومات حاصل کی جائے، باقی کچھ نہیں معلوم ہو سکا تھا۔ مخدوم شاہ کو اس نے

ساتھ ہی رکھا تھا، جو پتہ چوکیدار سے معلوم ہوا تھا وہ تھوڑی سی تلاش کے بعد ٹھیک نکلا۔ سیدھا

سادہ چوکیدار صحیح پتہ نہیں بتا سکا تھا لیکن بہر حال حمید احمد کا مکان مل گیا اور خود حمید احمد نے

ارسلان خان سے ملاقات کی۔

”جی فرمائیے، کیسے تشریف لائے آپ؟“

”مسز ایاز سے ملاقات کرنی ہے۔“

”کس سلسلے میں؟“ حمید احمد متجسس شخصیت کے آدمی لگتے تھے۔

”یہ میں نہیں ہی بتاؤں گا، آپ انہیں اطلاع دے دیجئے کہ پولیس انسپکٹر ارسلان خان

ان سے ملنا چاہتا ہے۔“

حمید احمد نے پھر کچھ جرح کرنے کی کوشش کی تو ارسلان نے غصیلے لہجے میں کہا۔ ”آپ بہت زیادہ بولنے کے عادی معلوم ہوتے ہیں، جو کچھ میں کہہ رہا ہوں وہ کیجئے۔“

”ہاں بھی کیوں نہیں آخر پولیس والے ہیں آپ، مالک ہوتے ہیں ہر چیز کے۔ ہم کیا ہماری اوقات کیا۔ بہتر ہے انتظار فرمائیے، میں ڈرائنگ روم کھلواتا ہوں۔“

ڈرائنگ روم کھلوا یا گیا اور تھوڑی دیر کے بعد شازیہ اندر داخل ہو گئی۔ دہلی پتلی سی اچھی شکل و صورت کی مالک خاتون تھی۔ عمر بھی زیادہ نہیں تھی، چہرے پر ایک اضمحلال اور مایوسی سی نظر آتی تھی۔

”معافی چاہتا ہوں محترمہ، کافی دن کے بعد آپ کو ایک ایسے مسئلے میں تکلیف دینا پڑی جو آپ کے لئے تکلیف دہ تھا۔“

”جی فرمائیے۔“ شازیہ نے مدہم لہجے میں کہا۔

”پولیس مجرم کو پکڑنے کی مخلصانہ کوشش کرتی ہے، بعض اوقات وہ اپنی کوششوں میں کامیاب نہیں ہو پاتی لیکن اس کا یہ مقصد نہیں ہے کہ وہ اپنے فرض سے غافل ہوتی ہے، میں ایاز احمد کے سلسلے میں آپ کے پاس حاضر ہوا ہوں۔“

شازیہ نے طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

”بعض اوقات کا لفظ آپ نے خوب استعمال کیا، حالانکہ اصولی طور پر آپ کو یہ کہنا چاہئے تھا کہ پولیس صرف خانہ پری کرتی ہے اور اپنا فرض پورا کر لیتی ہے۔ سو میں سے دس واقعات کی بھی تفتیش صحیح طور پر نہیں ہوتی۔ خیر فرمائیے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتی ہوں۔“

مخدوم شاہ کے چہرے پر غصے کے آثار نظر آئے تھے لیکن ارسلان خان نے ٹھنڈی فطرت کا مظاہرہ کیا اور بولا۔ ”آپ بے شک پولیس کو برا بھلا کہہ لیں لیکن آپ یہ دیکھئے کہ مجرم ہم سے پوچھ کر جرم نہیں کرتا کہ ہمیں اس کے بارے میں علم ہو، ہم تحقیقات کرتے ہیں، جرم کرنے والا آخری حد تک کوشش کرتا ہے کہ اپنے آپ کو چھپائے رکھے، اب ہمارے پاس جادو کی چھڑی تو ہوتی نہیں کہ ہم فوراً اسے تلاش کر کے اس تک پہنچ جائیں، بہر حال آپ یہ سب کہنے میں حق بجانب ہیں چونکہ آپ کا دل دکھا ہوا ہے، ہم ابھی تک اس سلسلے میں تفتیش کر رہے

ہیں، آپ سے تھوڑی سی مدد درکار ہے۔“

”جی بتائیے کیا کر سکتی ہوں میں آپ کے لئے؟“ شازیہ نے بیزاری سے کہا۔ وہ ارسلان خان کی باتوں سے متاثر نہیں ہوئی تھی۔

”اصل میں میڈم ایک کردار ہمارے علم میں آیا ہے، ہم آپ سے اس کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔“ ارسلان خان کے الفاظ پر شازیہ سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی، ارسلان خان نے مزید کہا۔ ”آپ کے گھر سے تھوڑے فاصلے پر بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ آپ کے گیٹ سے بالکل سامنے ایک ویران سا مکان نظر آتا ہے اس پر عموماً تالا پڑا رہتا ہے، کیا آپ ہمیں اس کے بارے میں کچھ بتا سکتی ہیں؟“

”یہی بتا سکتی ہوں کہ وہ مکان ویران پڑا رہتا تھا، اب تو طویل عرصے سے ایاز کی موت کے بعد میں نے ادھر کا بالکل رخ نہیں کیا، کافی عرصے سے وہ مکان خالی پڑا ہوا تھا پھر اس میں مکان مالک نے ایک ملازمہ کو رکھ لیا اور وہ وہاں رہتی رہی بس اس کے بعد مجھے نہیں معلوم کہ اس مکان میں تالا پڑا ہوا ہے یا وہ ملازمہ بدستور وہاں رہتی ہے۔“

”اس مکان میں تالا پڑا ہوا ہے۔“

”ہو سکتا ہے ایاز کے قتل کے بعد وہ خوفزدہ ہو کر وہاں سے بھاگ گئی ہو، بہر حال آپ مجھ سے جو پوچھنا چاہتے ہیں مجھے بتائیے۔“

”میں آپ سے اسی ملازمہ کے بارے میں پوچھنا چاہتا ہوں۔“

”ملازمہ۔“

”جی کیا نام تھا اس کا۔“

”رشیدہ۔“

”آپ کو اس کا نام اچھی طرح یاد رہا۔“

”میری اس سے بہت سی ملاقاتیں ہوئی تھیں بلکہ اس علاقے میں چونکہ آبادی نہ ہونے کے برابر تھی ایک دن ہم جاگنگ کرتے ہوئے جا رہے تھے کہ ہم نے اسے گھر کے دروازے پر دیکھا وہ گھر کی صفائی کر رہی تھی۔ پھر اس کے بعد میں نے اس سے کہا وہ اکثر میرے گھر آ جایا کرے، آئی تو نہیں، وہ ایک آدھ بار ہی آئی لیکن بہر حال اچھی تھی بیچاری۔“

”بدن سی سی وہ عورت۔“

”آپ لوگ سب مرد ایک ہی طرح کے ہوتے ہیں۔ شکل و صورت تو اللہ کی بنائی ہوئی ہوتی ہے لیکن مرد عورت میں خوبصورتی ضرور تلاش کرتے ہیں وہ بیچاری بلکہ ایاز بھی اس کا مذاق ہی اڑاتے رہتے تھے۔ پہلی بار دیکھنے کے بعد ہی انہوں نے اس کے بارے میں کچھ جملے کہے تھے جن پر بعد میں، میں نے احتجاج بھی کیا تھا۔“

”اس کے سامنے کہے تھے۔“

”ہاں وہ جملے مجھے یاد نہیں، لیکن وہ اس کا مذاق اڑانے کے لئے ہی تھے۔“

”اس کے بعد وہ آپ کے گھر آتی رہی؟“

”میں نے کہا نا کبھی کبھی۔“

”بعد میں بھی ایاز صاحب نے اس کا مذاق اڑایا ہوگا۔“

”ایاز ایسے ہی خوش مزاج آدمی تھے، بولتے ہی رہتے تھے کچھ نہ کچھ۔“

”میڈم کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ اس ملازمہ نے اپنا مذاق اڑانے پر آپ کے شوہر کو قتل کر دیا

ہو۔“

”کیوں بیچاری سے کوئی دشمنی ہو گئی ہے آپ کو۔ غالباً آپ کو مجرم نہیں مل رہا اور آپ ہر قیمت پر کسی کو مجرم ثابت کرنا چاہتے ہیں، یہ تو پولیس کا پرانا کھیل ہے۔“

”آپ اس کی بہت زیادہ طرفدار ہیں۔“

”جی ہاں اس کے ساتھ مجھے بھی گرفتار کر لیجئے، میں نے اس کی مدد سے اپنے شوہر کو قتل

کیا ہے۔ میں ذہنی طور پر بہت پریشان ہوں آپ سے جو کیا جاسکتا ہے آپ کر لیجئے۔“

”نہیں پلیز، دیکھئے، ہو سکتا ہے میرے الفاظ غلط ہو گئے ہوں لیکن ہم آپ پر نہیں اس پر

شک کر رہے ہیں، وہ اب وہاں نہیں ہے۔ کہاں گئی ہے، کیا کر رہی ہے، یہ کچھ نہیں معلوم۔“

”دیکھئے میں آپ سے کہہ چکی ہوں کہ ہو سکتا ہے ایاز صاحب کے قتل کے بعد اس نے

وہ جگہ چھوڑ دی ہو۔“

”ایک زحمت اور دوں گا میں آپ کو۔“

”دیکھئے۔“ شازیہ نے کہا اور ارسلان خان نے جیب سے وہ تصویر نکال لی جو عالیہ شاہ

کی تھی۔

”آپ اسے غور سے دیکھئے، پوری طرح غور سے دیکھئے اور یہ بتائیے کہ یہ وہی ملازمہ ہے۔“

شازیہ نے تصویر اس کے ہاتھ سے لے لی، دیکھتی رہی اس کے چہرے پر رنگ بدلتے

رہے پھر اس نے کہا۔ ”سو فیصد وہی ہے، بس جسم ذرا بھاری ہو گیا ہے اور لباس، وہ ایک عام سی

ملازمہ تھی اور اس کے اندر یہ سلیقہ نہیں تھا جو اس تصویر میں نظر آ رہا ہے، یہ تصویر کہاں سے ملی

آپ کو؟“

”بس ایسے ہی ہمیں شبہ ہوا تھا، آپ کا شکریہ، آپ اس کی شکل کی تصدیق کرتی ہیں۔“

”میرا خیال ہے یہ رشیدہ ہی ہے، مگر یہ قیمتی لباس اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس

لباس کو بڑے سلیقے سے استعمال کیا گیا ہے لیکن یہ رشیدہ ہی ہے۔“

انسپکٹر ارسلان وہاں سے چلا آیا ذہن میں بہت سی الجھنیں تھیں۔ دو تین دن سوچتا رہا،

پھر اس نے ایک فیصلہ کیا۔ ایک خطرناک فیصلہ۔۔۔۔۔

”اگر آپ نے محسوس کیا ہے تو میں معذرت چاہتا ہوں۔ یہ آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں کہ انسان کا ایک مزاج بن جاتا ہے۔ ویسے آپ یقین کیجئے، بے شک اس وقت میں ڈیوٹی پر نہیں ہوں، لیکن آپ سے ملاقات اسی سلسلے کا ایک حصہ ہے۔ ورنہ دوستانہ طور پر تو معاف کیجئے گا آپ سے کوئی کم ہی ملتا ہوگا، دیکھئے میں زمانہ قدیم کا انسان نہیں ہوں، ہر انسان کی خواہش ہوتی ہے کہ خوبصورت چیزوں سے دلچسپی رکھے اس کے ارد گرد کا ماحول حسین ہو، حسین عورتیں اس کی دوست اور اس کی زندگی کی ساتھی ہوں، پتہ نہیں میں زیادہ بول رہا ہوں.....“

”بولتے رہئے، بولنا انسان کا فطری حق ہے۔ آپ غالباً یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اس وقت بے شک آپ وردی میں نہیں ہیں لیکن میرے پاس آپ کی آمد آپ کے فرائض ہی کا ایک حصہ ہے۔“

”بالکل، ورنہ آپ جیسی کسی خاتون کے پاس بیٹھنا مشکل ترین کام ہے، ذوق نگاہ بھی ایک چیز ہوتی ہے۔“

”شکریہ، آپ کوئی نیا کام نہیں کر رہے، لوگ اسی طرح میری بے عزتی کرتے ہیں۔“

”ویسے میڈم کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں جس میں انسان حقیقت کے مطابق عمل کرتا ہے، آپ کو اس طرح کی جگہوں پر نہیں آنا چاہئے، یہاں کا اپنا ایک مزاج ہوتا ہے، حالانکہ میں اس کلب کا ممبر نہیں ہوں لیکن پھر بھی میں دیکھ رہا ہوں کہ لوگ آپ کی جانب متوجہ نہیں ہیں۔ آپ اپنے آپ کو ایسے ماحول میں کیسے برداشت کر لیتی ہیں۔“

”میں کیا کرتی ہوں اور کیا نہیں کرتی، ظاہر ہے اس کا جواب میں آپ کو نہیں دوں گی انسپکٹر صاحب۔“

”ارسلان خان۔“

”جو بھی ہوں آپ، میں آپ سے یہ سوال کرتی ہوں کہ آپ یہاں کس لئے آئے ہیں میری بے عزتی کرنے، مجھے میری بد صورتی کا احساس دلانے؟“

”جی بالکل نہیں، میں الجھن میں ہوں، ابھی تک یہ بات میرے حلق سے نہیں اتری کہ آخر وہ دونوں افراد آپ ہی کے ذریعے..... معافی چاہتا ہوں، میرا مطلب صرف یہ ہے کہ وہ دونوں افراد آپ کے اتنا قریب کیوں تھے کہ زہر خورانی کا شکار ہوئے۔ آپ یقین کیجئے میں

☆.....☆.....☆

ہر چند کہ یہ فیصلہ خطرناک تھا اور اس میں زندگی کا خطرہ موجود تھا لیکن ارسلان خان عمر کی اس منزل میں تھا، جس میں ہر خطرناک فیصلہ کیا جاسکتا ہے۔ وہ ایک پولیس آفیسر تھا۔ اپنے فرائض کی بجا آوری کے لئے ہر لمحہ زندگی کی بازی لگانے کے لئے مستعد رہنے والا، کسی عورت سے کیسے خوفزدہ ہو سکتا تھا۔

تمام منصوبوں پر غور کرنے کے بعد وہ سادہ لباس میں کلب جا پہنچا جہاں عام طور سے مسز عالیہ شاہ کی نشست ہوا کرتی تھی۔ اس نے انتہائی خوبصورت لباس پہنا ہوا تھا۔ ویسے بھی خوش شکل آدمی تھا۔ کلب میں داخل ہو کر اس نے نگاہیں دوڑائیں تو اسے ایک میز پر عالیہ شاہ نظر آ گئی۔

وہ بے جھجک اس کے قریب پہنچ گیا۔ اس کی زیرک نگاہیں عالیہ شاہ کا جائزہ لے رہی تھیں اور اپنے تمام تجربے کی بناء پر وہ پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا تھا کہ اسے دیکھ کر عالیہ کے چہرے پر ایک لہری دوڑ گئی تھی۔

”یقیناً آپ مجھے بیٹھنے کی اجازت دے دیں گی۔“ اس نے کہا اور کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔

شکیلہ مسکرا دی پھر اس نے کہا۔ ”آپ اس وقت بھی ڈیوٹی پر ہیں؟“

”بالکل نہیں، مگر ذاتی طور پر میں آپ سے ملنا چاہتا تھا، آپ نے سوال کیوں کیا؟“

ارسلان خان نے پوچھا۔

”اس لئے کہ وردی میں نہ ہونے کے باوجود آپ جس طرح کرسی کھینچ کر بیٹھے ہیں اس سے پولیس کی جارحیت نکلتی ہے۔ ہو سکتا ہے اب یہ آپ کی فطرت کا حصہ بن گئی ہو۔“

مسلل آپ کے بارے میں تحقیقات کر رہا ہوں اور بعض چیزیں انسان کی ذات کے لئے چیلنج بن جاتی ہیں۔ خیر آپ یہ بتائیے کتنی دیر مجھے یہاں بیٹھنے کی اجازت دے سکتی ہیں؟“

”میں ہرگز یہ نہیں کہوں گی کہ آپ یہاں آرام سے بیٹھئے، حالانکہ میں اس تدبیر بد اخلاق نہیں ہوں لیکن بد تمیز لوگوں کو میں بھی برداشت نہیں کر پاتی اور آپ انتہائی بد تمیز آدمی ہیں۔“

”گڈ آپ کو غصہ آ گیا، بڑے افسوس کی بات ہے، انسان حقیقتیں تسلیم کرنے سے کتنا گریز کرتا ہے، میری باتوں پر آپ کو غصہ نہیں آنا چاہئے تھا، خیر.....“

”ہو سکتا ہے آپ مجھے غصہ دلا کر کچھ معلومات حاصل کرنا چاہتے ہوں، انسان کی فطرت ہوتی ہے کوشش تو کرتا ہے وہ۔“

”ہاں..... ایسا ہے، خیر میں آپ کو زیادہ پریشان نہیں کروں گا، اصل میں مسئلہ صرف اتنا ہے کہ میری ملاقات نادیہ نامی ایک نرس سے ہوئی ہے، آپ ہی کے بارے میں تحقیقات کرتے ہوئے اور اس نے آپ کی تصویر کو پہچانا ہے۔“

کچھ لمحوں کے لئے شکلیہ سحر زدہ ہو گئی تھی، وہ ارسلان خان کو دیکھتی رہی۔ ارسلان خان مسکراتا ہوا اس جگہ سے اٹھ گیا تھا اور پھر وہ کلب میں نہیں رکا۔ ویسے بھی باقاعدہ ممبر نہیں تھا، کلب کا کوئی ممبر ہی اسے دعوت دے سکتا تھا لیکن ایسا کوئی شناسا تھا بھی نہیں یہاں۔ وہ مسکراتا ہوا باہر نکل آیا۔ جو خلش وہ شکلیہ کے دل میں چھوڑ آیا تھا اس کے بارے میں اب بھی اسے سو فیصد یقین نہیں تھا کہ اس کی یہ کارروائی درست ہے لیکن اپنی کوششوں کو وہ جاری رکھنا چاہتا تھا۔

دو دن تک انتظار کرتا رہا کہ عالیہ شاہ اس سے رابطہ قائم کرے، اس کے ساتھ ہی ساتھ اس نے نادیہ کے ارد گرد کچھ سادہ لباس پولیس والے تعینات کر دیئے تھے جو نادیہ کی نگرانی کر رہے تھے۔ اسے یہ خیال بھی تھا کہ ہو سکتا ہے شکلیہ جو اس کی دانست میں صرف دو افراد کی قاتل تھی نادیہ کو بھی راستے سے ہٹانے کی کوشش کرے، لیکن شکلیہ بے وقوف نہیں تھی۔

ارسلان خان کے جانے کے بعد وہ بہت دیر تک کلب میں بیٹھی رہی تھی اور جب وہاں سے چلی تھی تو اس نے اس بات کا پورا پورا خیال رکھا تھا کہ نوجوان پولیس آفیسر اس کا تعاقب کرتا ہے یا نہیں، گھر آنے کے بعد بھی اس نے اس کے بارے میں بہت کچھ سوچا تھا۔ ارسلان خان کے الفاظ اس کے ذہن کو کچھ دے رہے تھے اور جب پہلی رات وہ آرام کرنے کے

لئے لیٹی تھی تو اس نے آخری الفاظ اپنے آپ کو سمجھانے کے لئے کہے تھے۔

”انسپکٹر ارسلان خان، تم لوگ اپنی موت کے پروانے پر دستخط اپنے ہاتھ سے کرتے ہو، تم یہ سمجھتے ہو کہ ایک عام سی بے بس عورت تمہارے خلاف کچھ نہیں کر سکتی اور بعد میں تم زندگی ہار جاتے ہو لیکن میرے پاس ایسے کارڈ ہیں جو تمہیں موت کی منزل تک پہنچا سکتے ہیں اگر تم نے یہ الفاظ جو میری بد صورتی کے بارے میں کہے ہیں اپنے کسی مقصد کے لئے کہے ہیں تب بھی تمہاری سزا تمہارا مقدر بن چکی ہے اور وقت چاہے کسی طرح تبدیل ہو جائے میں اپنی توہین کرنے والے کو کبھی معاف نہیں کرتی۔“

تیسرے دن ارسلان خان اپنے منصوبے کو دوسری منزل تک پہنچانے کے لئے تیار ہو گیا۔ اس نے نرس نادیہ کے گھر جا کر اس سے ملاقات کی۔

”آپ کی ڈیوٹی کس وقت ہے مس نادیہ؟“

”رات کو میں ڈیوٹی پر جاؤں گی فرمائیے۔“

”تمہیں میرے ساتھ چلنا ہوگا۔“

”میں نہیں جانتی کہ پولیس مجھے کیوں پریشان کر رہی ہے۔“ نادیہ نے کسی قدر ناخوشگوار لہجے میں کہا۔

”مس نادیہ! پہلی بات تو یہ کہ میں آپ کو بالکل پریشان نہیں کر رہا بلکہ انتہائی عاجزی کے ساتھ آپ سے درخواست کر رہا ہوں کہ میرے کام میں میری تھوڑی سی معاونت کر دیجئے۔ یوں سمجھ لیجئے کہ جس طرح آپ اس ہسپتال میں ڈیوٹی سرانجام دیتی ہیں اسی طرح تھوڑا سا سرکاری فرض بھی ادا کر دیجئے اور یہ کہتے ہوئے مجھے شرمندگی بے شک ہے لیکن مجبوراً یہ الفاظ کہہ رہا ہوں کہ اگر آپ وقت کے ضیاع کا کوئی معاوضہ مقرر کریں گی تو میں وہ ادا کرنے کے لئے تیار ہوں۔“

”نہیں ایسی کوئی بات میرے ذہن میں نہیں ہے، اصل میں بس پولیس کے بارے میں، میں نے سنا ہے کہ وہ کسی مسئلے میں الجھاتی ہے تو پھر پیچھا چھڑانا مشکل ہو جاتا ہے۔“

”میں آپ کا دوست نہیں ہوں مس نادیہ، لیکن میرا وعدہ ہے کہ آپ کو تکلیف نہیں دوں

”گا۔“

”ٹھیک ہے فرمائیے کیا کرنا ہے مجھے؟“

”میرے ساتھ چلنا ہے۔“

”کہاں، یہ بتانا پسند کریں گے۔ کیا تھانے.....؟“

”کسی سے ملنے۔“ اس نے کہا۔

”کب چلنا ہے مجھے؟“

”بس فوراً تیار ہو جائیے۔“

”ٹھیک ہے، کیا آپ باہر تشریف لے جانا پسند کریں گے؟“

”ہاں بالکل۔“ انسپکٹر ارسلان خان نے جو اس وقت خود بھی سادہ لباس میں تھا گردن خم

کر کے کہا اور کوارٹر سے باہر نکل آیا۔ تھوڑی دیر کے بعد نرس نادیا ایک سادہ سے لباس میں ملبوس ہو کر باہر نکل آئی اور ارسلان خان اسے اپنی پرائیویٹ کار میں لے کر چل پڑا۔

نادیا خاموش تھی۔ ایک پولیس آفیسر اس کے ساتھ تھا۔ تھوڑا سا خوف دل میں تھا کہ یہ شخص اسے نجانے کہاں لے جا رہا ہے؟

تھوڑی دیر کے بعد اس کی کار ایک خوبصورت کوٹھی کے سامنے پہنچی اور پھر اندر داخل ہو کر پورچ میں رک گئی۔ یہ مسز عالیہ شاہ کی شاندار کوٹھی تھی۔

ارسلان خان نے ہر پہلو کو مد نگاہ رکھا تھا۔ اس بات کے امکانات تھے کہ نادیا کے عالیہ شاہ یا جیسا کہ اس نے بتایا ماضی کی شکلیہ سے اب بھی تعلقات ہوں یا اس تفتیش کے بعد اس نے شکلیہ سے رابطہ کر کے یہ بتا دیا ہو کہ کس طرح اس کی شخصیت منظر عام پر آ گئی ہے۔

ارسلان نے نادیا کے چہرے کے تاثرات پڑھنے کی کوشش کی تھی، اسے محسوس ہوا تھا کہ نادیا کسی الجھن کا شکار ہے۔

ایک ملازم کو طلب کر کے اس نے عالیہ شاہ کے بارے میں پوچھا تو اس نے کہا۔ ”سر، میڈم، اندر موجود ہیں۔“

”آپ ان سے کہئے کہ انسپکٹر ارسلان خان آیا ہے۔“

”آئیے سر۔“ ملازم نے کہا اور ان دونوں کو لے جا کر ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا اور پھر وہ

اندر چلا گیا۔

”یہ شکلیہ، شکلیہ کی کوٹھی ہے؟“ نادیا نے پوچھا۔

”ہاں۔“ انسپکٹر بولا۔

”میں سمجھ گئی تھی۔“ نادیا نے کہا اور پھر وہ دونوں ایک دم سنبھل گئے کیونکہ اندرونی دروازے سے مسز عالیہ شاہ یا شکلیہ اندر داخل ہوئی تھی۔

نادیا سحر زدہ نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی، بہت عرصے ساتھ رہا تھا ان کا۔ وہ اس کے چہرے کے ایک ایک نقش کو پہچانتی تھی، اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ شکلیہ نے بڑے شاندار طریقے سے چولا بدل لیا تھا، اس کا بدن بھی تھوڑا سا بھاری ہو گیا تھا، چہرے پر بھی ایک تمکنت سی نظر آتی تھی لیکن اس کے باوجود نادیا پورے وثوق سے کہہ سکتی تھی کہ یہ شکلیہ ہی ہے اور اس وقت انسپکٹر ارسلان حیران رہ گیا جب شکلیہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”ہیلو نادیا کیسی ہو؟“

نادیا ایک دم اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور کئی قدم آگے بڑھ گئی۔

”شش..... شش..... شش..... شکلیہ.....“

اس کے منہ سے ہکلائی ہوئی آواز نکلی۔

شکلیہ نے آنکھیں بند کر کے مسکراتے ہوئے گردن ہلائی اور بولی۔ ”ہاں..... تمہارے لئے شکلیہ ہمیشہ شکلیہ ہی رہے گی کیونکہ تم ان لوگوں میں سے ہو جنہوں نے شکلیہ کو نئی زندگی دی تھی۔“

نادیا دوڑ کر شکلیہ سے لپٹ گئی تھی۔ ”کہاں چلی گئی تھیں تم، کہاں غائب ہوئی تھیں، کتنی بری بات ہے، میں تو تمہیں سگی بہنوں کی طرح چاہتی تھی، تم نے مجھے ہی چھوڑ دیا۔“

”آؤ بیٹھو، زندگی کی کہانیاں بلا وجہ اتنی طویل ہو جاتی ہیں، حالانکہ اگر وہ مختصر رہیں تو کوئی حرج نہیں ہوتا۔ سوری انسپکٹر ارسلان خان، ہم دونوں اتنی گہری دوست ہیں کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ہمارا خون ایک کیوں نہ ہوا۔ بیٹھو تم بھی کیا یاد کرو گے کہ کسی کے طفیل تمہیں ہزاروں الجھنوں سے نجات مل رہی ہے، آؤ نادیا بیٹھو، انسپکٹر ارسلان کیا پیو گے؟“

”نہیں میڈم! میں زندہ رہنا چاہتا ہوں۔“

اپنی مدد کے لئے رکھتا کہ وہ مجھے زندگی کے دوسرے راستے دکھائے پھر ایک موقع پر وہ میرے رازوں سے واقف ہو گئی، میرے لئے ضروری تھا کہ میں اسے دنیا سے دور کر دوں۔ نور یز کلب کا ایک ممبر تھا، اسے مجھ پر شبہ ہوا اور وہ میری کھوج میں لگ گیا، اسے کچھ ثبوت بھی حاصل ہو گئے اور مجبوراً میں نے اسے بھی قتل کر دیا۔ اب دیکھو نا مجبوریاں بھی کوئی چیز ہوتی ہیں بعض اوقات صورتحال کچھ ایسا رخ اختیار کر جاتی ہے کہ اگر آپ زندہ رہنے کے خواہشمند ہوں تو زندہ رہنے کے لئے آپ کو دوسرے کی زندگی لینا ضروری ہو جاتا ہے۔ بہر حال میں بھی اب تھک گئی ہوں، میں نے اعتراف کیا ہے تمہارے سامنے ارسلان خان تم میرے اس اعتراف کو ریکارڈ کر لو، سمجھے عدالت میں ثبوت دینے کے لئے کافی ہوگا اور پھر تمہیں ثبوت اکٹھا کرنے کی ضرورت بھی نہیں ہے کیونکہ میں خود اعتراف جرم کروں گی، تمہارا کام تو ختم ہو گیا، کیا سمجھے؟“

ارسلان خان بری طرح چونک پڑا۔ وہ اس حیرت انگیز کہانی کو بڑے سنسنی خیز انداز میں سن رہا تھا۔

نادیہ بھی سحر زدہ تھی، اس نے شکیلہ کے خاموش ہونے کے بعد کہا۔ ”نہیں شکیلہ! تم زندہ رہو گی، دنیا جانے نہ جانے میں تمہیں اچھی طرح جانتی ہوں۔ تمہارے ساتھ جو ظلم ہوا ہے شکیلہ میں اس کی راز دار ہوں۔ تمہیں ذہنی طور پر جگہ جگہ کچلا گیا ہے، اس کے بعد انسانی حالت یہی ہونی چاہئے۔“

شکیلہ نے گردن جھکالی، ارسلان خان البتہ ایک عجیب سوچ میں ڈوب گیا تھا پھر اس نے کہا۔ ”مس شکیلہ! آپ نے ایک خزانے کی بات کی تھی۔“

”ہاں، سونے اور جواہرات کے ڈھیر جو کسی کو کچھ نہیں دے سکتے، تم پتھروں سے بنی ہوئی یہ عمارت تو سونے کے عوض خرید سکتے ہو، چمچاتی ہوئی کاریں، اپنے ارد گرد ان لوگوں کا جوم کر سکتے ہو جو تم سے نہیں تمہاری دولت سے پیار کرتے ہیں لیکن تم ان سنہری دیوتاؤں سے محبت نہیں حاصل کر سکتے کسی کا خلوص نہیں حاصل کر سکتے۔ سب جھوٹ ہے بکو اس ہے وہ خزانہ جو اب بھی اتنا ہے کہ اس سے ہزاروں زندگیاں سکون سے بسر ہو سکتی ہیں، میرے لئے کچھ بھی نہیں، انسپکٹر ارسلان! میں تمہارے سامنے اپنے تمام جرائم کا اعتراف کرتی ہوں، چلو مجھے گرفتار کرو لیکن ایک بات کا وعدہ کرو، کم از کم دنیا کو یہ تسلیم کرنے پر مجبور کر دو گے کہ قصور میرا نہیں اس

جواب میں شکیلہ ہنس پڑی پھر بولی۔ ”تم بھی گن کے چکے ہو، باز نہ آئے، میں نہیں جانتی کہ تم نادیہ تک کس طرح پہنچے لیکن بہر حال تم نے بڑی صحیح جگہ ہاتھ ڈالا ہے، دنیا کے لئے میں کچھ بھی بن جاؤں لیکن نادیہ کے لئے ہمیشہ شکیلہ رہوں گی۔“

”شکیلہ! یہ سب کیا ہوا ہے پلیز مجھے بتاؤ تو سہی؟“

”نادیہ تم میری زندگی کی داستان اس سے آگے سننا چاہتی ہو جہاں سے میں تم سے جدا ہوئی یا پھر ارسلان خان کی بھرپور مدد کرنا چاہتی ہو..... ارسلان خان، ہو سکتا ہے نادیہ نے تمہیں میری زندگی کے بارے میں تھوڑا بہت بتایا ہو، بات صرف اتنی سی تھی کہ میرا باپ ایک بد صورت آدمی تھا اور میری ماں بے حد حسین اور اپنے حسن پر مغرور، میرے باپ کو خوشی سے اس نے محروم رکھا ہے۔ لیکن جب میں پیدا ہوئی تو میں بھی اپنے باپ کی طرح بد صورت تھی اور میری ماں نے مجھے بھی اپنی نفرتوں کا نشانہ بنالیا۔ مختصر یہ کہ باپ کی موت کے بعد ماں نے مجھ سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور ایسے وقت میں جب میرا کوئی سہارا باقی نہ رہا تو نادیہ نے مجھے سہارا دیا اور مجھے اپنے ہسپتال میں نرس بنوا دیا۔ میں وہاں زندگی گزارتی رہی۔ ایک بے مقصد اور بیکار زندگی جس میں میرا مذاق اڑانے کے علاوہ کوئی کام نہیں ہوتا تھا۔ نادیہ تمہیں بھی نہیں معلوم، ہسپتال میں، میں نے کتنے ہی لوگوں کو قتل کیا، ہر اس شخص کو جس نے میرا مذاق اڑایا..... نادیہ اس کے بعد مجھے ایک ایسا شخص ملا جو ایک عام مریض کی طرح ہسپتال آیا تھا لیکن درحقیقت وہ بہت دولت مند آدمی تھا اور اس نے ایک عظیم خزانہ جس کا تعلق بدھ مذہب سے تھا حاصل کیا تھا۔ یہ خزانہ اس نے اسی مکان میں ایک تہہ خانے میں چھپایا۔ میں نے اس خزانے کے ذریعے اپنے آپ کو ایک نئی زندگی کی طرف لانا چاہا اور مسز عالیہ شاہ کا روپ دھار کر منظر عام پر آئی۔ میرا خیال تھا کہ میری دولت کسی نہ کسی کو اس طرح متاثر کر دے گی کہ وہ مجھ سے محبت کا اظہار کرے گا اور پھر مجھ سے شادی کر لے گا، لیکن یہ بھی ایک دلچسپ ستم ظریفی ہے کہ مجھے کوئی بھی ایسا چاہنے والا نہیں ملا بلکہ لوگ ملے بھی تو انہوں نے میرے ساتھ مذاق ہی کیا۔ وہ شخص ایاز احمد ایک گندی فطرت کا انسان تھا اور اس نے اپنی برائیوں کے سہارے مجھے اپنی چال میں پھانسا چاہا مگر میں جانتی تھی کہ وہ ایک وقتی ہوس کا شکار ہے، میں نے اسے قتل کر دیا اور اس کے بعد میں نے وہ جگہ چھوڑ دی اور مسز عالیہ شاہ کی حیثیت سے زندگی اختیار کر لی۔ میں نے ایک گورنس کو

”یہ وہ لوگ ہوں گے شکیلہ جو اپنے آپ کو بہت کچھ سمجھتے ہیں، برا آدمی اگر مر بھی جائے تو کوئی بری بات نہیں ہوتی، بولو سودا کرتی ہو۔“

”سودا نہیں ارسلان جیسا کہ میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ میرے دل میں اس خزانے کی کوئی طلب نہیں ہے، اگر وہ تمہیں خوشی دے سکتا ہے تو مجھے کیا اعتراض ہے، ناد یہ تم بھی اگر چاہو۔۔۔۔۔“

”نہیں بابا نہیں، میں خزانوں کی شوقین نہیں ہوں، مجھے اس میں سے کچھ نہیں چاہئے۔“

”مس شکیلہ آپ مجھے وہ جگہ بتا سکتی ہیں جہاں وہ خزانہ موجود ہے۔“ ارسلان خان اب بالکل تبدیل ہو گیا تھا۔ خزانہ چیز ہی ایسی ہوتا ہے کہ بڑے بڑے عقل و ہوش کھو بیٹھتے ہیں۔ ارسلان خان پوری طرح شکیلہ کے جال میں پھنس چکا تھا اور شکیلہ ایک خوفناک مکڑی کی مانند اسے اپنے جالے میں پھانسنے کے بعد آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اس کی اداکاری اپنے عروج پر تھی۔ چہرے پر غم آلود سنجیدگی طاری تھی اور ارسلان خان کی آنکھوں میں دولت کی ہوس ناچ رہی تھی۔

آخر کار وہ شکیلہ کو اپنے ساتھ جانے پر رضامند کرنے میں کامیاب ہو گیا اور پھر شکیلہ نے لباس بدلنے کی اجازت مانگی اور دوسرے کمرے میں جا کر لباس تبدیل کر لیا لیکن باقی انتظامات بھی کرنا نہیں بھولی تھی۔ اس کے اندر ایک سفاک سی کیفیت بیدار ہو گئی تھی، جسمانی اور ذہنی طور پر وہ اس وقت بے حد چاق و چوبند تھی۔ معاملہ ایک پولیس آفیسر کا تھا جو عام لوگوں کی طرح ناکارہ نہیں ہوتا ہے بلکہ اس کی تربیت انتہائی شاندار ہوتی ہے اور جسمانی طور پر اس پر قابو پانا کوئی آسان بات نہیں ہوتی۔ اس گھر تک جانے کے لئے اس نے اپنی کارہی کا انتخاب کیا تھا اور نڈھال سے انداز میں پچھلی سیٹ پر جا بیٹھی تھی۔

”معافی چاہتی ہوں ارسلان خان، میری کار تہی ڈرائیو کرو گے۔“

ارسلان خان نے خوشی سے کار کی ڈرائیونگ قبول کر لی تھی، ناد یہ بھی پچھلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ سب سے زیادہ الجھن کا شکار وہی تھی، اسے دولت سے کوئی دلچسپی نہیں تھی لیکن وہ شکیلہ کے بارے میں بڑے عجیب سے انداز میں سوچ رہی تھی شکیلہ کتنا بڑا نفسیاتی کیس بن چکی تھی، اگرچہ وہ خود بھی ایک بد شکل عورت تھی اور زندگی بھر مذاق کا شکار رہی تھی لیکن وہ شکیلہ کی

دنیا کا تھا جس نے مجھے اس طرح وحشی اور درندہ بنادیا۔ چلو پلیز مجھے گرفتار کر لو۔“

شکیلہ نے دونوں ہاتھ آگے بڑھا دیئے، ارسلان نے ایک جھر جھری لی اور بولا۔ ”مس شکیلہ! آپ سے سودا کیا جاسکتا ہے۔“

”کیسا سودا؟“

”کیا آپ خزانے کا کچھ حصہ مجھے دے سکتی ہیں اس کے عوض میں خاموشی اختیار کر لوں گا، اس کیس کو سرے سے ختم کر دوں گا اور یہ بھی کوشش کروں گا کہ آپ کو کسی طرح ذہنی سکون حاصل ہو سکے۔“

”دیکھو انسپکٹر ارسلان خان، خزانہ میرے لئے ایک بے مقصد چیز ہے تم چاہو تو اسے لے سکتے ہو، میں تمہیں اس کا پتہ بتائے دیتی ہوں لیکن میرے لئے اب یہ زندگی ایک بے مقصد چیز ہے، کوئی فائدہ نہیں ہے مجھے اس سے۔“

”نہیں شکیلہ، ایسا مت کہو، میں تم سے کوئی لالچ نہیں رکھتی، تم جانتی ہو میں تمہاری مخلص دوست ہوں۔ مجھے نہ خزانہ چاہئے نہ اور کچھ لیکن تم زندہ رہو، انسپکٹر ارسلان خان اگر اس خزانے کا کچھ حصہ طلب کرتے ہیں تو انہیں دے دو اور اس کے بعد اپنی اس زندگی پر لعنت بھیجو میرے پاس میرے کوارٹر میں آ جاؤ۔ ہسپتال کے لوگ آج بھی تمہاری باتیں کرتے ہیں، ان میں سے کوئی تمہیں مجرم نہیں سمجھتا۔ آؤ ہم لوگ اپنی پچھلی زندگی میں لوٹ آئیں، شکیلہ ہم وہی زندگی گزاریں گے، کسی بھی دولت، کسی بھی فریبی دنیا کے لالچ سے الگ ہو کر، آخر ہم بھی تو انسان ہیں۔“

شکیلہ نے گردن جھکالی، اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے، یہ آنسو بے شک سچائی کے آنسو تھے، انسپکٹر ارسلان خان پوری طرح سنہری جال میں آچکا تھا۔ سونے کی سنہری چمک اس کی آنکھوں میں لہرا رہی تھی۔ اس نے کہا۔ ”تمہیں ایک عمدہ معاون مل جائے گا شکیلہ تم عالیہ شاہ بنی رہو۔ میں در پردہ تمہاری حفاظت بھی کروں گا۔ کوشش کروں گا کہ آئندہ کوئی اس قسم کی حرکت نہ کرے، تمہارے ارد گرد ایک محافظ کی حیثیت سے رہوں گا، تم زندہ رہو۔“

شکیلہ نے نگاہیں اٹھا کر ارسلان خان کو دیکھا اور بولی۔ ”کیا فائدہ ارسلان، یقیناً میرے ہاتھوں کچھ اور لوگ بھی موت کا شکار بنیں گے۔“

”مم..... میں..... میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکتی، مم..... میں میں.....“ نادیہ پلٹ کر سیڑھیوں کی طرف بڑھی۔

شکیلہ کی آواز ابھری۔ ”رک جاؤ نادیہ، پلیز رک جاؤ۔“
”تم قاتل ہو، تم خونی ہو، تم مجرم ہو، تم پاگل ہو گئی ہو تم..... تم نے تم نے..... آہ تم نے.....“

”رک جاؤ نادیہ، یہ تو ممکن ہی نہیں ہے کہ کوئی میرے رازوں سے واقف ہونے کے بعد باہر کی دنیا میں آزاد پھرے۔ نادیہ رکو، رک جاؤ باز آ جاؤ۔“
لیکن نادیہ کے قدم سیڑھیوں کی جانب بڑھنے لگے۔

تبھی اچانک شکیلہ کے ہاتھ سے چھری نکلی اور نادیہ کی پشت پر جا لگی۔ یہ پھینک کر مارنے والا ہتھیار نہیں تھا لیکن خوفناک چھری نادیہ کی پشت میں پیوست ہو گئی۔ نادیہ کے قدم لڑکھڑائے اور وہ گھٹنوں کے بل نیچے گر پڑی۔ پھر اس کے بعد وہ اپنی جگہ سے اٹھی لیکن اس دوران شکیلہ دوڑ کر اس کے قریب پہنچ گئی تھی۔

اس نے نادیہ کی پشت سے چھری کھینچی اور اس کے بعد پوری قوت سے دانت کچکا کر نادیہ کے پہلو میں پیوست کر دی۔ نادیہ کے حلق سے دلخراش چیخ نکلی اور اس کے بعد چھریوں کے پے درپے وارنے اسے نڈھال کر کے زمین بوس کر دیا۔

شکیلہ ایک بھیانک عفریت کی طرح اس کے سامنے آکھڑی ہوئی، اس نے پاؤں کی ٹھوکر سے نادیہ کو زمین پر گرا دیا اور بولی۔ ”ہاں نادیہ، زندگی کا حصول بڑی مشکل چیز ہے اور موت تم جیسی بے وقوف لڑکیاں اتنی آسانی سے حاصل کر لیتی ہیں، بھلا تمہارے زندہ رہنے کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے۔ تم میرا راز جان چکی ہو اور میں نے اپنا راز اسی لئے اس پولیس آفیسر کو بتا دیا تھا کہ اپنے رجسٹر سے میں اس کا نام کاٹ چکی تھی۔“

پھر اس کے بعد وہی بھیانک مناظر سامنے آئے۔ دو انسانی جسموں کو راکھ بنانے میں کافی وقت لگ گیا تھا۔ تہہ خانے کی فضا میں گوشت جلنے کی بھیانک بو پھیل رہی تھی۔ سڑاند اٹھ رہی تھی، لیکن یوں لگتا تھا جیسے شکیلہ کی انسانی حسیں ہی ختم ہو گئی ہوں۔ کافی دیر کے بعد وہ نشے میں چور باہر نکلی تھی۔ باہر نکل کر اس نے بڑی ہوشیاری کے ساتھ اپنے لباس کو دیکھا لیکن وہ

سیدھا بھی نہیں ہو پایا تھا کہ دوسرا اور اس کے سینے پر ہوا اور اس کے حلق سے ایک کراہ نکلی۔
نادیہ چونک کر پیچھے ہٹ گئی تھی، شکیلہ بھی تھوڑی سی پیچھے ہٹ گئی تھی لیکن اس کے بعد اس نے تیسرا اور اس کی گردن پر کیا اور اس بار ارسلان خان کی گردن آدھی کے قریب کٹ گئی۔
اس کے حلق سے ایک دلخراش چیخ نکلی اور دوسری چیخ نادیہ کے منہ سے نکلی۔ شکیلہ اچھل کر پیچھے ہٹ گئی تھی۔ تہہ خانے میں روشنی کی گئی۔ اس روشنی میں نادیہ کو ارسلان خان کا بھیانک روپ نظر آ رہا تھا۔ وہ دونوں ہاتھ فضا میں پھیلائے آہستہ آہستہ پیچھے کی جانب گر رہا تھا۔
”یہ کیا ہے؟“

جواب میں شکیلہ کا بھیانک قہقہہ سنائی دیا تھا۔
”ہاں نادیہ، میں نے اسی طرح اپنے آپ کو قائم رکھا ہے، یہ دنیا بھروسے کے قابل نہیں ہے، جس پر بھی بھروسہ کرو وہ تمہیں زندگی سے محروم کر دے گا، یہی سبق ملا ہے مجھے آج تک، یقین کرو، مجھے یہی سبق ملا ہے۔“

نادیہ کے حلق سے ایک بھیانک چیخ نکلی اور وہ پیچھے کی جانب مڑی۔ ”تم نے انسپکٹر ارسلان کو قتل کر دیا، تم نے.....“

”ہاں نادیہ میں تمہیں سچ بتا رہی ہوں، یہ کائنات اب بھروسے کے قابل نہیں رہی ہے، جہاں تم نے کسی پر اعتبار کیا سمجھ لو اپنی گردن میں رسی کا پھندا ڈال لیا۔ مجھے بتاؤ نادیہ میرا کیا قصور ہے۔ کیا انسان اپنی مرضی سے اپنی شکل و صورت لے کر اس دنیا میں آتا ہے۔ میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا تھا، میری زندگی تمہارے علم میں ہے۔“

”مم..... مگر تم تو کہہ رہی تھیں کہ تم ارسلان خان کو سب کچھ بتا دو گی اور ہم نے یہ طے کیا تھا.....“

”ہاں ٹھیک کہتی ہو تم لیکن میری عزیز دوست میں ایک رازدار کو زندہ نہیں رکھ سکتی تھی۔ وہ پولیس آفیسر تھا، میں اسے کسی دوسرے طریقے سے نہیں بھلا سکتی تھی۔ میں نے اس پر خزانے کا جال ڈالا تھا، آگیا میرے قریب میں۔ خزانہ واقعی میرے لئے بے مقصد چیز ہے لیکن میری زندگی کا ایک مقصد ہے..... میں آخری لمحے تک اس وقت کا انتظار کروں گی جب کوئی صاحب دل مجھے قبول کر لے، سمجھیں۔ مجھے میری بد صورتی کے ساتھ قبول کر لے۔“

طرح دیوانی نہیں ہو گئی تھی۔ شکلیہ اس قدر خوفناک ہو جائے گی اس نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔

سفر جاری رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ اس گھر کے سامنے پہنچ گئے۔ شکلیہ کی خواہش کے مطابق کار اسی سمت کھڑی کر دی گئی تھی جہاں سے وہ آسانی سے عام نگاہوں میں نہیں آ سکتی تھی۔

اس کے بعد شکلیہ ان دونوں کو ساتھ لئے ہوئے گھر کے دروازے پر پہنچ گئی۔ چابی نکال کر تالا کھولا اور اندر داخل ہو گئی۔ ارسلان اب اس سے بھرپور تعاون کر رہا تھا۔ جوان آدمی تھا، زندگی کی بہت سی امنگیں رکھتا تھا اور دولت کمانے کا خواہش مند تھا۔

شکلیہ اب ان کی رہنمائی کر رہی تھی اور اس کا رخ اسی تہہ خانے کی جانب تھا، کچھ لمحوں کے بعد وہ اس جگہ پہنچ گئی۔ ارسلان خان نے کاٹھ کباڑ ہٹانے میں اس کی مدد کی تھی اور اس کے بعد شکلیہ کی کوشش سے دروازہ نمودار ہو گیا اور ارسلان خان کے بدن میں ایک بار پھر سنسنی سی دوڑ گئی۔

”کیا اندر روشنی ہے؟“

”ہاں، آؤ یہ ایک مکمل تہہ خانہ ہے۔“ شکلیہ نے کہا اور اس کے بعد تہہ خانے کی سیڑھیاں طے کرنے لگی۔

کچھ لمحوں کے بعد وہ لوگ اس تہہ خانے میں کھڑے ہوئے تھے۔ یہاں انتہائی ناخوشگوار بو پھیلی ہوئی تھی اور نادیہ کا دل متلا رہا تھا وہ محسوس کر رہی تھی کہ یہ ہولناک تہہ خانہ بہت سے رازوں کا مسکن ہے اور شکلیہ نے اس کے خیال کی تصدیق بھی کر دی۔

”یہ تہہ خانہ بہت بھیاںک ہے اگر میں اس قدر وحشی نہ بن چکی ہوتی تو یقیناً اس تہہ خانے میں آتے ہوئے میری جان ہی نکل جاتی۔“

”یہاں ایک عجیب سی گھٹن کا احساس ہو رہا ہے، یوں لگتا ہے جیسے یہاں کبھی انسانی گوشت کو جلایا گیا ہو، کیا ایسی کوئی کارروائی یہاں ہوئی ہے مس شکلیہ؟“

”بالکل، آؤ میں وہ راکھ تمہیں دکھاؤں جو انسانی گوشت اور ہڈیوں کی ہے، واقعی یہاں ایک ناخوشگوار بو پھیلی ہوئی ہے اور کیوں نہ ہو خزانوں سے زیادہ بدبودار اور کون سی چیز ہوتی

ہے۔ یہ سب کچھ چھین لیتے ہیں انسان سے۔ یہاں تک کہ زندگی بھی، آؤ دیکھو۔ وہ انہیں لئے ہوئے اس جگہ پہنچ گئی جہاں شیلہ اور نوریز کے جسموں کی جلی ہوئی ہڈیاں پڑی ہوئی تھیں۔ اس سے زیادہ بھیاںک منظر شاید ہی کوئی اور ہوگا۔

حقیقت یہ ہے کہ نادیہ بھی ہسپتال کی عورت تھی۔ اس نے سردخانے میں رکھی ہوئی لاشوں کو بھی دیکھا تھا اور ٹوٹے پھوٹے انسانی جسموں سے بھی اس کا واسطہ پڑا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کی کیفیت بحال تھی، لیکن اس کے باوجود تہہ خانے کے ہولناک ماحول نے اسے بھی دہشت زدہ کر دیا تھا۔

بہر حال ارسلان خان نے ناک پر رومال رکھ لیا اس وقت اسے اپنا کوئی فرض یاد نہیں رہا تھا۔ خزانے واقعی انسانی ذہن کو سلا دیتے ہیں، وہ اپنا منصب بھی بھول جاتا ہے، اس نے ادھر ادھر دیکھ کر کہا۔ ”وہ..... وہ جو صندوق رکھے ہوئے ہیں، غالباً وہی۔“

”ہاں ارسلان خان انہی میں موت بند ہے، کیا سمجھے، میں تمہیں کیا بتاؤں، زندگی بھی کتنی بے وقعت ہو جاتی ہے ان چیزوں کے سامنے آؤ میرے ساتھ آؤ، دیکھو، یہ دیکھو.....“ وہ آگے بڑھی اور پھر اس نے ایک صندوق کھول دیا۔

سونا ہر حال میں چمکتا ہے، ہیرے روشنی کا مسکن ہوتے ہیں، ارسلان خان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں۔ خود نادیہ بھی بڑے سحر زدہ انداز میں ان اشیاء کو دیکھ رہی تھی، جس میں کچھ بھیاںک مورتیاں بھی تھیں، سونے کی بنی ہوئی، لیکن ان کے چہروں سے ایک خوف کا احساس ہوتا تھا۔

ارسلان خان کے بدن میں ایک کپکپی سی دوڑ گئی تھی وہ خزانے پر جھک گیا اور بولا۔ ”میرے خدا یہ تو واقعی ایک روایتی خزانہ ہے، اتنا بڑا خزانہ کہ اگر کسی ایک انسان کو حاصل ہو جائے تو تو.....“ وہ لرزتے ہاتھوں کو آگے بڑھنے سے نہ روک سکا اور خزانے کے صندوق پر جھک گیا۔

تبھی اچانک اس کے بائیں پہلو سے دائیں پہلو تک ایک شدید تکلیف پیدا ہو گئی۔ وہ اس ٹیس کو ایک لمحے تک تو سمجھ ہی نہیں سکا تھا اس نے اپنے دونوں ہاتھ اپنے پیٹ پر رکھے تو اچانک ہی اسے اپنے جسم سے پھواروں کی شکل میں نکلتے ہوئے خون کا احساس ہوا۔ ابھی وہ

ہمیشہ سارے انتظامات کر کے چلتی تھی۔

وہ تین تھے، تینوں کی الگ الگ کہانیاں تھیں۔ تینوں ہی اعلیٰ پائے کے جرائم پیشہ رہ چکے تھے اور تینوں ہی اپنی ذہانت کے سبب کبھی پولیس کے چنگل میں نہیں آئے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ دولت کمانے کے لئے بے شک انہوں نے جرائم کئے تھے لیکن اس طرح کے کہ اگر کبھی گرفتار بھی ہو جاتے تو تھوڑی بہت سزا کے علاوہ اور کچھ نہ ہوتا لیکن تینوں ہی کی آرزو تھی کہ کوئی ایسا داؤ لگے جس سے دارے کے نیارے ہو جائیں اور کوئی مشکل نہ پیش آئے۔

تقدیر ایک بار سب کو موقع دیتی ہے، انہیں بھی موقع ملا، ایک ایسے خزانے کا نقشہ جوڑی بانگ کے علاقے میں پوشیدہ تھا، نقشہ اس قدر تفصیلی تھا کہ انہیں اس بات کی امید ہو گئی کہ خزانہ ضرور ان کے ہاتھ لگ سکتا ہے لیکن اس نقشے کی مکمل تفصیلات کے لئے انہیں کسی ایک ایسے ماہر فن کی ضرورت تھی جو اس طرح کے نقشے پڑھنے میں کمال رکھتا ہو اور بلال احمد کے بارے میں کئی بار اخبارات نے بڑے تعریفی مضامین لکھے تھے۔

بلال احمد ایک آرکیالوجسٹ تھا اور اپنے فن میں استاد سمجھا جاتا تھا۔ انہوں نے اس کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کیں اور پھر اسے اس کی بیٹی کے حوالے سے دھمکیاں دے کر اپنے کام کے لئے تیار کر لیا۔ بیٹی ملک سے باہر تھی اور باپ اس کی زندگی کا خواہاں۔ بلال احمد ان کے ساتھ چلنے کے لئے تیار ہو گیا۔

وہ واقعی اپنے فن کا استاد تھا، اس نے خزانہ تلاش کر لیا لیکن اس کے بعد کچھ ایسے واقعات پیش آئے کہ بلال احمد خزانے سمیت ان کے ہاتھ سے نکل گیا اور وہ تینوں ٹاپے رہ گئے۔

اس کے بعد بلال احمد کی تلاش ان کی زندگی کا ایک مقصد بن گئی۔ انہوں نے وہ سارے جتن کر ڈالے جو بلال احمد کو تلاش کرنے کے لئے کئے جاسکتے تھے۔ ایک بار انہیں ایک ہسپتال میں وہ نظر آیا لیکن اس ہسپتال کے بہت سے چکر لگانے کے باوجود وہ دوبارہ انہیں نہیں مل سکا۔ وہ نہیں سمجھ پائے کہ بلال احمد ہسپتال کیوں آیا تھا اور کہاں غائب ہو گیا۔

بہر حال اس کے بعد ان کی زندگی چھوٹے موٹے جرائم کا شکار رہی۔ ان میں سے ایک

کا نام طارق شاہ تھا، دوسرے کا مائیکل اور تیسرے کا علی شیر تھا۔

وہ واقعہ طارق شاہ ہی کو پیش آیا۔ ایک خوبصورت تقریب میں طارق شاہ نے ایک انتہائی قیمتی نیکلس ایک عورت کی گردن سے اتار لیا۔ نیکلس میں جواہرات جڑے ہوئے تھے اور امید کی جاسکتی تھی کہ تینوں دوست اس نیکلس کو فروخت کر کے کئی مہینے آرام سے زندگی بسر کر سکتے ہیں ان کا طرز زندگی نہایت امیرانہ تھا، ایک خوبصورت سے فلیٹ میں تینوں ایک ساتھ رہا کرتے تھے اور لوگ ان کے بارے میں بڑے اچھے خیالات رکھا کرتے تھے کیونکہ ان کا طرز عمل پڑوسیوں کے ساتھ بہت ہی نرم اور خلیق تھا۔

تینوں نے اپنے کاروبار کے بارے میں ایک کہانی مشہور کر رکھی تھی، بہر حال طارق شاہ کو اس نیکلس کی فروخت کی ذمہ داری سونپی گئی اور طارق شاہ جانتا تھا کہ اسے کہاں فروخت کرنا ہے۔

وہ سیدھا زیارت شاہ کے پاس پہنچا تھا جس کی ایک انتہائی شاندار جیولرز شاپ تھی اور شہر کی ممتاز شاپ میں شمار ہوتی تھی۔ یہ بات صرف ضرورت مند لوگ ہی جانتے تھے کہ زیارت شاہ چوری اور ڈکیتی کا مال سب سے اچھی قیمت میں خرید لیتا ہے۔ اس کا ایک خفیہ شوروم بھی بنا ہوا تھا اور وہ عام طور سے اسی شوروم میں بیٹھتا تھا، چنانچہ طارق شاہ جو اس کا پرانا شناسا تھا اس کے پاس پہنچ گیا۔

اس نے نیکلس زیارت شاہ کے سامنے پیش کیا اور زیارت شاہ نے پوری ایمانداری کے ساتھ اس نیکلس کی صحیح رقم ادا کر دی۔ رقم گنتے ہوئے اچانک ہی طارق شاہ کی نگاہ زیارت شاہ کے اس شوکیس کی جانب اٹھ گئی جس میں بڑے بڑے نوادرات سجے ہوئے تھے یہ نوادرات چوری کے تھے اور بڑے بڑے فنکار انہیں جانے کہاں کہاں سے اڑا کر لائے تھے اور زیارت شاہ سے ان کی رقومات وصول کی تھیں لیکن اس وقت جو چیز طارق شاہ کی نگاہ میں آئی تھی اس نے طارق شاہ کے پورے وجود کو بھک سے اڑا دیا۔ یہ اسی خزانے کا ایک مجسمہ تھا جو ان لوگوں نے بڑی شدید اور جان لیوا جدوجہد کے بعد حاصل کیا تھا اور جو بلال احمد کے ہاتھ لگ گیا تھا، بھلا اس چھوٹے سے سونے کے مجسمے کو طارق شاہ کیسے بھول سکتا تھا جو ان کے لئے ایک دکھ بھری یاد بن چکا تھا اور اس وقت یہ دکھ بھری یاد نگاہوں کے سامنے تھی لیکن طارق شاہ ایک کایاں آدمی

تھا، اس نے فوراً ہی خود کو سنبھال لیا اور دوبارہ نوٹوں کی گنتی میں مصروف ہو گیا۔

پھر اس نے نوٹ گنتے گنتے رک کر جیب سے موبائل نکالا اور اس پر کسی کا نمبر ڈائل کرنے لگا لیکن درحقیقت اس نے موبائل کے کیمرے سے اس مجسمے کی تصویر بنائی تھی، موبائل میں بے شک ہلکی سی آواز ہوئی لیکن زیارت شاہ نے اسے محسوس نہیں کیا، وہ کسی اور کام میں مصروف ہو گیا تھا۔ طارق شاہ نے دو تین تصویریں بنائیں اور اس کے بعد موبائل اس طرح جیب میں رکھ لیا جیسے نمبر نہ مل رہا ہو۔ زیارت شاہ نے اسے دیکھا اور بولا۔

”کیوں کیا بات ہے؟“

”سگنل نہیں آرہے؟“

”میرے فون سے کلو شاہ جی، جہاں بھی کرنا ہے۔“ اس نے سامنے رکھے ہوئے ٹیلی

فون سیٹ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”نہیں شکریہ ایسی کوئی خاص بات نہیں ہے۔“

طارق شاہ نے نوٹوں کے آخری بنڈل کو گنا اور اس کے بعد یہ نوٹ جیبوں میں ٹھونسنے لگا پھر اس کے بعد بولا۔ ”بہت بہت شکریہ زیارت شاہ، آپ ہمارے لئے بڑی اہم شخصیت ہیں۔“

”آپ کا اپنا شوروم ہے، آپ ہی کے ذریعے چلتا ہے، آتے رہتے گا۔“ زیارت شاہ

نے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا اور طارق شاہ باہر نکل آیا۔ اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔

یہ مجسمہ زیارت شاہ کے پاس کہاں سے آیا؟ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ یہ وہی مجسمہ تھا جو انہوں نے خزانے کے ساتھ دیکھا تھا اور اس طرح کے کئی مجسمے تھے، بہر حال یہ بات اپنے دوستوں سے کسی طرح چھپائی نہیں جاسکتی تھی، البتہ جب وہ فلیٹ پہنچا تو مائیکل اور علی شیر نہیں تھے، تاہم اس نے اپنے کام کا آغاز کر دیا۔ موبائل سے مجسمے کی تصویریں کمپیوٹر پر منتقل کیں اور کمپیوٹر سے سکین کر کے ان کے پرنٹ بنائے، یہ سارے انتظامات ان کے پاس موجود تھے۔

پھر وہ کئی گھنٹے تک سونے کے اس مجسمے کے پرنٹ دیکھتا رہا تھا۔ کوئی شک نہیں رہا تھا اس بات پر کہ یہ وہی مجسمہ ہے، پہلے علی شیر اور پھر مائیکل دونوں واپس آ گئے تو اس نے وہ تصویریں ان کے سامنے رکھ دیں، دونوں ہی تصویروں کو دیکھ کر بری طرح اچھل پڑے تھے۔ دونوں نے ان پر

جھپٹے مارے اور انہیں آنکھوں کے قریب کر کے دیکھنے لگے۔

پھر علی شیر کی لرزتی ہوئی آواز ابھری۔ ”یہ..... یہ تمہیں کہاں سے حاصل ہو گئیں۔“

جواب میں طارق شاہ نے پوری تفصیل دونوں کو بتائی، نوٹوں کے بنڈل بھی نکال کر اس نے ان کے سامنے رکھ دیئے تھے۔ دونوں سکتے کے سے عالم میں طارق شاہ کو دیکھ رہے تھے۔

”سو فیصد وہی مجسمہ ہے لیکن زیارت شاہ کے پاس کیسے پہنچا؟“

”وہاں میں نے کسی قسم کا کوئی اظہار نہیں کیا، ظاہر ہے مناسب نہیں تھا لیکن یہ بات

زیارت شاہ ہی بتا سکے گا۔“

”پھر کیا ارادے ہیں؟“

”زیارت شاہ سے پوچھنا ہوگا۔“

”کس طرح؟“

”اسے اغواء کرنا پڑے گا۔“

”مگر وہ ہمارے لئے کس قدر قیمتی چیز ہے، اس کا تمہیں اندازہ ہے طارق شاہ۔“

”ہاں، کیا یہ کوئی بہت اہم بات ہے، ہم اسے اپنے خفیہ گھر میں لے جائیں گے،

ہمارے چہروں پر نقاب ہوگی، آوازیں بدلنا ہمارے لئے کونسا مشکل کام ہے۔“

”یہ بہتر تجویز ہے۔“ اور اس کے بعد وہ تیاریوں میں مصروف ہو گئے۔ اس سے پہلے

زیارت شاہ سے صرف اتنا تعلق رہا تھا کہ وہ لوگ اپنا چوری اور ڈکیتی کا مال جو زیورات کی شکل

میں ہوتا تھا اس کے ہاتھوں فروخت کر دیتے تھے۔ اس کے معمولات کا انہیں کوئی علم نہیں تھا

لیکن اب اس سلسلے میں باقاعدہ کارروائی شروع کر دی گئی۔

زیارت شاہ کے بارے میں یہ پتہ چل گیا کہ وہ کس وقت گھر سے آتا ہے کس وقت

واپس جاتا ہے، طے یہ کیا گیا کہ واپسی کے وقت تو کوئی بھی تبدیلی ہو سکتی ہے، البتہ صبح ساڑھے

دس بجے جب وہ اپنے گھر سے باہر نکلتا ہے تو راستے میں ایک ایسی جگہ آتی ہے جو سنسان ہوتی

ہے اور زیارت شاہ کو وہاں سے باسانی پکڑا جاسکتا ہے۔

اس کے بعد باقی کام کون سا مشکل تھا۔ زیارت شاہ اپنے معمول کے مطابق ٹھیک

ساڑھے دس بجے گھر سے نکلا تھا اور اس کے گھر سے نکلتے ہی دو کاریں اس کے تعاقب میں لگ

گئی تھیں۔ ایک، کار کافی آگے چل رہی تھی دوسری پیچھے۔ زیارت شاہ یا اس کے ڈرائیور کو کوئی شبہ نہیں ہو سکا تھا، البتہ جب وہ سنسان سڑک آگئی تو اچانک ہی آگے والی کار سڑک پر ترچھی ہو کر رک گئی اور زیارت شاہ کے ڈرائیور کو بریک لگانے پڑے۔

پیچھے والی کار اس کی کار کے برابر پہنچ گئی تھی۔ نقاب لگائے دو افراد نیچے اترے۔ زیارت شاہ کی کار کے ڈرائیور کو گریبان سے پکڑ کر نیچے گھسیٹا اور سڑک کے نشیب میں دھکا دے دیا گیا اور اس کے بعد ریوالور کے نشانے پر زیارت شاہ کو کار سے نیچے اتارا گیا اور کار کی پچھلی سیٹ پر ٹھونس دیا گیا۔ پھر ایک آدمی نے زیارت شاہ کی آنکھوں پر کالے رنگ کی ایک پٹی باندھی جس سے اسے نظر آنا بند ہو گیا اور وہ شخص زیارت شاہ کے پاس ہی بیٹھ گیا، اس کی غرائی ہوئی آواز ابھری۔ ”اگر تمہارے منہ سے ہلکی سی چوں کی آواز بھی نکلی تو تمہاری گردن دبا کر اسی جگہ ختم کر دیا جائے گا۔ ہم تمہارے منہ میں کپڑا نہیں ٹھونسنا چاہتے، لیکن احتیاط رکھنا۔“ اس کے ساتھ ہی غالباً کسی پستول کی نال زیارت شاہ کی پسلیوں میں چھپنے لگی تھی۔

باقی جو افراد تھے وہ اگلی سیٹ پر بیٹھ گئے اور کار سٹارٹ ہو کر چل پڑی۔ زیارت شاہ بذات خود مجرمانہ ذہنیت کا حامل نہیں تھا جو کاروبار اس نے کر رکھا تھا وہ کچھ ایسے تعلقات کی بنیاد پر تھا جس کی وجہ سے اسے کسی بھی خطرناک مرحلے پر تحفظ مل سکتا تھا۔ اس طرح وہ اپنا کاروبار چلا رہا تھا۔ یہ افتاد اس کی زندگی میں پہلی بار پڑی تھی۔

اغواء برائے تاوان کے بے شمار کیس اخبارات میں نگاہوں کے سامنے سے گزر چکے تھے، وہ بذات خود بہت بڑی حیثیت کا حامل تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ ابھی تک اس کے ساتھ کوئی ایسا واقعہ پیش نہیں آیا تھا لیکن اس کے ذہن میں صرف یہی خیال گزرا تھا کہ اسے کسی بڑے تاوان کے لئے اغواء کیا جا رہا ہے۔

پھر کار کسی عمارت میں رکی اور اسے بازوؤں سے پکڑ کر اندر لے جایا گیا۔ ایک بڑے سے ہال نما کمرے میں اس کی آنکھیں کھول دی گئیں۔

نقاب پوشوں کی تعداد تین تھی، وہ کافی چست و چالاک نظر آ رہے تھے اور ان کے چہرے اس طرح چھپے ہوئے تھے کہ زیارت شاہ ان کی ایک جھلک بھی نہ دیکھ پائے۔ ان میں سے ایک شخص نے غرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”بیٹھو، کچھ دیر یہاں آرام کرو اس کے بعد تم سے

بات چیت کی جائے گی۔“ زیارت شاہ کے منہ سے کوئی آواز نہیں نکلی تھی۔

وہ تینوں دروازے کی جانب بڑھے، پھر ان میں سے ایک نے پلٹ کر کہا ”نہ تمہیں کسی طرح کی اذیت دی جائے گی نہ کوئی جسمانی تکلیف تمہیں اٹھانا پڑے گی تم سے کچھ معلومات حاصل کی جائیں گی اور پھر تمہیں چھوڑ دیا جائے گا۔“

”تم لوگ مجھ سے کیا چاہتے ہو؟“ زیارت شاہ بمشکل تمام بولا۔

”کہانا تم سے کچھ نہیں چاہئے، بس تھوڑی سی معلومات کرنی ہیں تم سے۔“ یہ کہہ کر وہ تینوں باہر نکل گئے۔

زیارت شاہ گم صم بیٹھا رہا تھا۔ اس کے ذہن میں بے شمار خیالات گردش کر رہے تھے۔ کار میں بیٹھتے ہی اس کے قریب بیٹھنے والے شخص نے اس کی جیبوں کی تلاشی لے کر اس کا موبائل فون اور پرس وغیرہ نکال لیا تھا۔ بہر حال زیارت شاہ کو اندازہ تھا کہ وہ کسی بہت بڑی مشکل میں پھنس گیا ہے۔ کوئی ایک گھنٹے تک قید رہنے کے بعد باہر دروازے پر ہلکی ہلکی آوازیں ابھریں اور پھر دروازہ کھل گیا۔ آنے والے وہی نقاب پوش تھے جنہوں نے اس وقت بھی اپنے چہرے سے نقاب نہیں اتارے تھے۔ ان میں سے ایک نے کہا۔ ”آئیے شاہ جی۔“

زیارت شاہ اٹھ کھڑا ہوا تھا، ان دونوں نے پستول تانے ہوئے تھے۔ زیارت شاہ لڑکھڑاتے قدموں سے ان کے ساتھ چل پڑا۔ وہ اسے ایک دوسرے کمرے میں لے گئے جہاں کافی سامان موجود تھا، پھر انہوں نے اسے صوفے پر بیٹھنے کے لئے کہا اور وہ صوفے پر بیٹھ گیا۔

”شاہ جیسا کہ آپ سے کہا گیا کہ آپ کو کوئی تکلیف نہیں دی جائے گی، بس آپ سے کچھ معلومات درکار ہیں، یہ تصویر دیکھئے۔“ یہ کہہ کر اس شخص نے ایک تصویر زیارت شاہ کی جانب بڑھا دی اور زیارت شاہ بری طرح چونک پڑا۔

یہ سونے کے ایک مجسمے کی تصویر تھی جسے اس نے اس بد صورت ملازمہ سے خریدا تھا ایسے چار مجسمے زیارت شاہ خرید چکا تھا اور ان کے عوض اسے بھاری رقومات ادا کرنی پڑی تھیں۔ یہ ایک مجسمہ اس کے شوکیس میں رکھا ہوا تھا اس نے اپنے شوکیس کو پہچان لیا۔ وہ شخص خاموشی سے زیارت شاہ کی صورت دیکھ رہا تھا۔

”سونے کا یہ مجسمہ آپ کے پاس کہاں سے آیا شاہ جی، ہمیں آپ سے صرف یہ معلومات کرنی ہیں۔“

”بس اتنی سی بات تھی۔“

”چرب زبانی بالکل نہیں، جو کچھ آپ سے پوچھا جا رہا ہے اس کا جواب اسی انداز میں دیجئے جس انداز میں آپ سے سوالات کئے جا رہے ہیں، اگر اپنی طرف سے آپ نے کوئی چالاکی کی تو نقصان کے علاوہ اور کچھ نہیں حاصل ہوگا آپ کو۔“

”بھئی میں سونے کا کام کرتا ہوں اور بہت سے لوگوں کی مدد بھی کر دیا کرتا ہوں، یعنی جو لوگ خفیہ طور پر اپنا سامان بیچنا چاہتے ہیں اور کسی کی نگاہوں میں نہیں آنا چاہتے ہیں ان سے تھوڑے سے مارجن کے ساتھ وہ سامان خرید لیتا ہوں۔ ایسے چار مجسمے میں نے خریدے ہیں۔ باقی تین کو تو ہم نے پگھلا کر اس کا سونا اور اس میں جڑے ہوئے جواہرات نکال لئے ہیں، یہ مجسمے چونکہ بذات خود مجھے بہت پسند تھے مگر سارے مجسمے اپنے پاس جمع نہیں کر سکتا تھا، یہ ایک مجسمہ میں نے اپنے لئے رکھ لیا۔“

”آپ کے پاس یہ کہاں سے آیا؟“

”ایک عورت اسے میرے پاس فروخت کر گئی تھی، چاروں مجسمے اس نے فروخت کئے تھے، اس کا کہنا تھا کہ یہ اس کے مالکان کی ملکیت ہے اور چونکہ وہ خود منظر عام پر نہیں آنا چاہتے اس لئے انہوں نے اس عورت کو اس کام کے لئے استعمال کیا ہے۔“

زیارت شاہ نے اس تمام طریقہ کار کی تفصیل بتائی جس کے تحت یہ مجسمہ اس تک پہنچا تھا۔

”اس عورت کے بارے میں کچھ اور بتائیے زیارت شاہ؟“

”آپ یقین کیجئے کہ میں اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا، وہ ایک بد صورت سی ملازمہ تھی، معمولی سے لباس میں ملبوس، مجسمے لانے اور رقم لے جانے کا وہی ذریعہ بنی تھی۔“

”ایک ایک کر کے مجسمہ فروخت کیا تھا اس نے آپ کے ہاتھ۔“

”آپ نے اس کا نام وغیرہ پوچھا؟“

”نہیں جناب، اس کی نہ ضرورت تھی نہ گنجائش۔“ زیارت شاہ نے جواب دیا۔

”اس کا حلیہ بتا سکتے ہیں آپ؟“

”ہاں مجھے یاد ہے، بد نما نقوش، سانولے سے کچھ گہرا رنگ تھی جوان۔“

”زیارت شاہ آپ ہماری مدد کیجئے، ہم اس کا ایک خاکہ بنانا چاہتے ہیں۔“

”کیا ان مجسموں کا تعلق آپ سے ہے؟“

”پہلے بھی آپ سے کہہ دیا گیا تھا کہ سوالات کے جواب کے علاوہ کوئی سوال نہیں۔“

”ٹھیک ہے مجھے اعتراض نہیں ہے آپ جیسا مناسب سمجھیں۔“ زیارت شاہ نے جواب

دیا اور اس کے بعد وہ لوگ تیاریاں کرنے لگے۔

زیارت شاہ کی یادداشت کے مطابق ایک خاکہ تیار کیا، مائیکل ایک اعلیٰ پائے کا مصور تھا اور اپنے کام میں سب سے زیادہ نمایاں حیثیت کا حامل۔ زیارت شاہ کی یادداشتوں کے سہارے جو چہرہ تیار کیا گیا وہ سو فیصد شکلیہ ہی کا چہرہ تھا اور اسے دیکھتے ہی طارق شاہ کے منہ سے نکلا۔ ”اوہ مائی گاڈ، مائی گاڈ۔“

وہ دونوں چونک کر اسے دیکھنے لگے لیکن طارق شاہ نے ایک دم زبان بند کر لی تھی۔

”زیارت شاہ آپ سے ہمیں کوئی دشمنی نہیں ہے، نہ ہی ہم آپ کے ساتھ کوئی غلط کارروائی کرنا چاہتے ہیں، بس ایک بات ذہن میں رکھیں آپ کو ہماری مدد کرنی ہوگی۔ درحقیقت یہ مجسمے ہماری ملکیت ہیں آپ نے انہیں جس طرح بھی خریدا اور جتنی رقم کے عوض خریدا ہمیں اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے، ہم اس عورت کے بارے میں تفصیل جاننا چاہتے ہیں اگر یہ آپ کے پاس کوئی اور چیز لے کر آئے تو اس وقت آپ کی ذمہ داری ہوگی کہ آپ فوراً ہمیں اس موبائل نمبر پر اطلاع دیں۔ یہ بات ذہن میں رکھیں کہ اس نمبر کا سراغ آپ کہیں سے بھی نہیں لگا سکتے۔ بڑی معمولی سی بات ہے، یہ سمجھ لی نام سے خریدی گئی ہے اور اس سے آپ کو کوئی اندازہ کبھی نہیں ہو پائے گا، ہم یہ نمبر آپ کے موبائل میں فیڈ کئے دیتے ہیں جیسے ہی وہ عورت آئے آپ ایک لمحے کے اندر اندر ہمیں اطلاع دیں گے۔“

زیارت شاہ نے تعاون کے انداز میں گردن ہلا دی تھی۔

بات کسی حد تک درست نکلی۔ طارق شاہ دوبارہ اسی تصویر کے سامنے جا کھڑا ہوا، علی شیر اور مائیکل خاموشی سے اس کے فارغ ہونے کا انتظار کرتے رہے، وہ واپس پلٹا تو علی شیر نے کہا۔ ”بہت سسپنس بڑھ گیا ہے طارق شاہ.....! کیا تم اس عورت کے بارے میں کچھ جانتے ہو؟“

”دوستو.....! تم لوگ میری یادداشت کی ہمیشہ تعریف کرتے ہو، اسی یادداشت کی بناء پر میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ یہ عورت ایک بار میری نگاہوں میں آ چکی ہے۔

”کب..... کہاں؟“

”تمہیں وراثت بیگ یاد ہوگا جو میرا خیال ہے ہمارا آخری شکار تھا۔“

”کیوں نہیں، دن ہی کتنے گزرے ہیں۔“

وراثت بیگ کا تعاقب کرتے ہوئے ایک کلب گیا تھا، وہاں میں نے وراثت بیگ کو ایک میز پر بیٹھے ہوئے دیکھا، اس کے برابر والی میز پر یہ عورت بیٹھی ہوئی تھی، وہاں بہت سے افراد تھے لیکن وہ میری توجہ کا مرکز اس لئے بنی کہ اس نے ایک قیمتی ہار اور انگوٹھیاں پہن رکھی تھیں جو لا جواب ہیروں سے مزین تھیں، ایسا ہی معاملہ اس ہار کا بھی تھا، وراثت بیگ چونکہ میرے لئے ایک قیمتی شکار تھا، اس لئے میں نے اس وقت اس عورت کو چھیڑنا مناسب نہیں سمجھا اور مسلسل وراثت بیگ کے تعاقب میں رہا، لیکن یہ بات میں نے دل میں طے کر لی تھی کہ جب بھی فرصت ملی، میں کلب میں اس عورت کو دیکھوں گا کہ وہ کون ہے اور اس کی کیا حیثیت ہے۔

اس کے بعد مجھے آؤٹ آف سٹی جانا پڑا اور پھر وراثت بیگ کو شکار کرنے کے لیے جو جو چالیں چلنی پڑیں، تم لوگوں کو معلوم ہے چنانچہ کچھ وقت کے لیے یہ عورت میرے ذہن سے نکل گئی اور اب جب مائیکل نے یہ تصویر بنائی اور زیارت شاہ نے اس کی تصدیق کی تو وہ عورت میرے ذہن میں پھر سے زندہ ہو گئی۔“

”ایشین کلب کی ایک مالدار عورت لیکن اب تو اس عورت کی صورتحال بدل چکی ہے، ویسے یہ بات ہمارے ذہنوں میں بھی گردش کر رہی ہے کہ ممکن ہے زیارت شاہ نے ہمیں بھٹکانے کی کوشش کی ہو، مجھے کی کہانی کچھ اور ہی ہو۔“

”زندگی کی کہانی ہار جائے گا اگر اس نے ایسا کیا تو۔ تاہم میں نے اس بات کو نظر انداز نہیں کیا، وہ جس انداز میں تصدیق کر رہا ہے، اس سے یہی پتہ چلتا ہے کہ جو کہانی اس نے سنائی

☆.....☆.....☆

کچھ لمحات تک مکمل خاموشی طاری رہی تھی، اس کے بعد طارق شاہ نے کہا۔ ”زیارت شاہ.....! تم نے جو کچھ کہا ہے، ہم نے تمہاری بات پر یقین کر لیا ہے، لیکن ایک بات ذہن میں رکھنا، یہ آخری بار تم سے کہی جا رہی ہے، ہم لوگ جو کوئی بھی ہیں، اپنے دوستوں کو دوست اور دشمنوں کو دشمن گردانتے ہیں اور ہماری دشمنی آج تک کسی کے لیے اچھی نہیں ثابت ہوئی۔ زیارت شاہ! تھوڑی دیر کے بعد ہم تمہیں آزاد کر دیں گے لیکن تمہیں ہماری مدد کرنی ہوگی، کسی بھی شکل میں.....! اگر تم نے کوئی غلط بیانی کی یا چالاکی کرنے کی کوشش کی تو زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھو گے، اگر زندہ رہنا چاہتے ہو تو وہی کرنا جو ہم نے کہا ہے، ہم تمہیں مزید کچھ وقت دے رہے ہیں، سوچ لو، غور کر لو، اس کہانی میں اگر کوئی تبدیلی کرنا پسند کرو تو ایک گھنٹے کے اندر اندر ہمیں اصل بات سے آگاہ کر دینا۔“

زیارت شاہ نے کچھ بولنے کی کوشش کی تو طارق شاہ بولا۔ ”نہیں ابھی کچھ نہیں، ایک گھنٹہ مزید تمہیں ہمارا مہمان رہنا ہوگا اوکے.....! اور اس کے بعد وہ تینوں واپسی کے لیے پلٹ پڑے۔

زیارت شاہ کو اس کمرے سے نکال کر اسی بڑے کمرے میں لے جایا گیا جہاں اسے پہلے قید کیا گیا تھا۔ غالباً ان کی نگاہوں میں وہ جگہ زیادہ محفوظ تھی، دروازہ باہر سے بند کرنے کے بعد وہ واپس اس کمرے میں آ گئے جہاں مائیکل کی بنائی ہوئی تصویر موجود تھی۔ علی شیر اور مائیکل کا ذہن بری طرح الجھا ہوا تھا، طارق شاہ نے اس تصویر کو دیکھ کر جس طرح ”اومائی گاڈ“ کہا تھا، اس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ طارق شاہ اس تصویر والی عورت کے بارے میں کچھ جانتا ہے اور

ہے، وہ ٹھیک ہے لیکن پھر بھی ہمیں اس بات کا جائزہ لینا ہوگا البتہ وہ عورت..... وہ عورت.....!“

”فکر کی کوئی بات نہیں ہے طارق شاہ.....! ہم زیارت شاہ کی تصدیق یا اس کی کسی اطلاع کا انتظار کئے بغیر کیوں نہ ایشین کلب میں اس عورت کو دیکھ لیں، ویسے بھی تم بتاتے ہو کہ وہ ایک دولت مند عورت ہے، کم از کم ہمارا انگوٹھیوں کی حد تک۔“

”ہاں بالکل.....!“

تینوں اس بات پر متفق ہو گئے تھے۔

کلب میں اس عورت کو ٹریس کرنے کی ذمہ داری مائیکل کو دی گئی تھی، یہ لوگ ہر طرح سے احتیاط رکھنا چاہتے تھے، طارق شاہ چونکہ پہلے وراثت بیگ کا تعاقب کرتا ہوا کلب جا چکا تھا، ان لوگوں کو اس بات کا خطرہ تھا کہ کہیں اس عورت کی نگاہ بھی طارق پر نہ پڑ گئی ہو، چنانچہ ڈیوٹی مائیکل کی تھی اور مائیکل نے مسز عالیہ شاہ کو پہچان لیا تھا۔ بہر حال منصوبے کے مطابق مائیکل اس وقت تک کلب میں رہا جب تک کلب کے ممبران اٹھنے نہ شروع ہو گئے۔ مائیکل، عالیہ شاہ کے پیچھے پیچھے باہر نکل آیا تھا۔

باہر کار میں علی شیر اور طارق شاہ اس کے منتظر تھے، عالیہ شاہ اپنی قیمتی اور شاندار کار میں بیٹھ کر باہر نکلی تو علی شیر نے منصوبے کے مطابق کار اشارٹ کر دی اور پھر بڑی احتیاط کے ساتھ عالیہ شاہ کی کار کا تعاقب کرنے لگا۔

آخر کار عالیہ شاہ اپنی عظیم الشان کوٹھی میں داخل ہو گئی اور یہ لوگ کافی فاصلے پر رک گئے، رات کا وقت تھا، قرب جوار بالکل سنسان تھے، اس وقت عالیہ شاہ کے بارے میں تفصیلات نہیں معلوم کی جاسکتی تھیں، یہ ذمہ داری علی شیر کو سونپی گئی کہ وہ رات کو یہیں رک کر اس کوٹھی کی نگرانی کرے وہ لوگ اب اسے نظر انداز نہیں کرنا چاہتے تھے۔

علی شیر ساری رات وہاں رہا، صبح کو وہ دونوں چاق و چوبند ہو کر وہاں پہنچ گئے۔ ثابت یہ ہوا کہ عالیہ شاہ اسی کوٹھی میں رہتی ہے اور رات کو اس کی کوئی خاص مصروفیات نہیں رہی تھیں۔

علی شیر رات بھر کا تھکا ہوا تھا، اس لئے ڈیوٹی بدل دی گئی اور اس کے بعد باقی پورا دن طارق شاہ نے وہاں گزارا تھا، کوئی خاص بات معلوم نہیں ہوئی تھی، عالیہ شاہ معمول کے مطابق سات بجے گھر سے نکلی تھی اور کار میں بیٹھ کر کلب پہنچ گئی تھی، اس کی مصروفیات کا تین دن تک

جائزہ لیا گیا، کسی ایسے آدمی کو اس کے ارد گرد نہیں دیکھا گیا تھا جو کسی شکل میں مشکوک ہوتا، بڑی تنہا زندگی گزارنے کی عادی تھی۔

چوتھے دن انہوں نے اپنے منصوبے پر عمل کرنے کا فیصلہ کیا اور دن کو گیارہ بجے کے قریب وہ عالیہ شاہ کی کوٹھی پر پہنچ گئے۔ عالیہ شاہ کے معمولات کا انہیں علم تھا، اندر اطلاع بھجوائی اور انہیں بڑے احترام کے ساتھ اندر بلا لیا گیا، عالیشان ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر وہ عالیہ شاہ کا انتظار کرنے لگے۔

کچھ دیر بعد ایک سفید گاؤں میں ملبوس عالیہ شاہ اندر داخل ہو گئی، بد شکل عورت تھی لیکن پروقار انداز میں چلتی ہوئی ان کے سامنے پہنچ گئی، اس نے ان لوگوں سے بڑی پر تپاک ملاقات کی اور انہیں بیٹھنے کا اشارہ کر کے خود بھی بیٹھ گئی۔

”میرا خیال ہے ہماری پہلے کبھی ملاقات نہیں ہوئی، میں آپ لوگوں کے بارے میں جاننا چاہتی ہوں۔“

”مسز عالیہ شاہ.....! آپ براہ کرم یہ تصویر دیکھئے اس کے بعد ہماری گفتگو کا آغاز ہوگا۔“ طارق شاہ نے مجسمے کی تصویر عالیہ شاہ کے سامنے کر دی۔

عالیہ شاہ یہ تصویر دیکھ کر بری طرح چونکی۔

”یہ..... یہ تصویر آپ کے پاس کہاں سے آئی؟“ اس نے حیرانی سے سوال کیا۔

”پہلے یہ بتائیے کہ کیا آپ کو اس مجسمے کے بارے میں کچھ معلومات حاصل ہیں؟“

”ایک منٹ.....!“ عالیہ شاہ نے کہا اور اپنی جگہ سے اٹھ کر ایک طرف چل پڑی، مائیکل نے غیر محسوس انداز میں ریوالور نکال لیا اور اسے اس طرح اپنے لباس میں چھپا لیا کہ ایک لمحے کے اندر اندر اسے گرفت میں لے کر استعمال کر سکے۔

عالیہ شاہ واپس پلٹی اس نے کہا۔ ”میں آپ کو اس بارے میں ساری تفصیل بتا دوں گی، لیکن آپ اپنا تعارف تو کرائیں، آپ لوگ کون ہیں؟“

”آپ ہمیں بالکل نہیں جانتی ہوں گی، ہم آپ سے اس مجسمے کے حوالے سے گفتگو کرنا چاہتے ہیں آپ یہ بتائیے کہ کیا کبھی کسی بلال احمد نامی شخص سے آپ کی ملاقات ہوئی تھی؟“

”آہ..... آپ کہیں وہ تو نہیں ہیں جو بلال احمد کو تلاش کرتے پھر رہے ہیں؟“ عالیہ شاہ نے براہ راست سوال کیا اور تینوں ایک دوسرے کی شکل دیکھنے لگے۔

”آپ کو اس بارے میں کیوں کر شبہ ہوا کہ ہم لوگ بلال احمد کو تلاش کر رہے ہیں؟“ بلال احمد کی جو کہانی میرے علم میں آئی، وہ اسی بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ شاید آپ وہی لوگ ہوں جو بلال احمد کو کسی خزانے کی تلاش میں اپنے ساتھ لے گئے تھے۔“ شکیلہ دھماکے پر دھماکے کر رہی تھی۔ مجسمے کی تصویر اور بلال احمد کی کہانی اس کے ذہن سے محو نہیں ہوئی تھی، ایک لمحے کے اندر اندر اس نے سمجھ لیا تھا کہ یہ وہی لوگ ہو سکتے ہیں، وہ تینوں چہرے ہی سے جرائم پیشہ معلوم ہوتے تھے۔ چنانچہ جب وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر الماری کے پاس گئی تھی تو گریم سی کی چھوٹی سی شیشی اس کے ہاتھ میں منتقل ہو گئی تھی۔

اس نے اپنی گفتگو سے ان تینوں کو حیرت زدہ کر دیا تھا۔

آخر کار طارق شاہ نے کہا۔ ”دیکھئے مسز عالیہ شاہ.....! اگر آپ کو بلال احمد کے بارے میں اتنی تفصیلات معلوم ہیں تو پھر ہمیں یہ بتانے میں عار نہیں ہے کہ ہم وہی لوگ ہیں۔“

”جی میں نہیں جانتی کہ مجسمے کی یہ تصویر آپ کو کہاں سے حاصل ہوئی لیکن میں یہ مجسمہ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکی ہوں، میری ایک جڑواں بہن ہے اس کا نام رشیدہ ہے، ہم دونوں نے ایک غریب گھرانے میں آنکھ کھولی، بہت ہی غربت تھی ہمارے ہاں۔ یہ سمجھ لیجئے فاقہ کشی کرتے تھے، بڑے ہوئے تو باپ کا انتقال ہو گیا، ذریعہ آمدنی کچھ نہیں تھا، ہم دونوں بہنوں نے گھروں میں نوکریاں شروع کر دیں، میں عدنان شاہ نامی ایک شخص کے ہاں نوکری کرنے لگی، وہ عمر میں مجھ سے کافی بڑا تھا وہ مجھے پسند کرنے لگا اور اس نے مجھ سے شادی کر لی، شادی کے بعد وہ شخص مجھے لے کر ساؤتھ افریقہ چلا گیا، میں نے وہیں زندگی گزاری اور میری بہن یہاں وقت گزارتی رہی، آخر کار عدنان شاہ کا انتقال ہوا تو میں وطن واپس آ گئی، اس دوران میری بہن نوکریاں کرتی رہی تھی، وہ ایک ہسپتال میں ملازم تھی اس ہسپتال میں اس کی ملاقات بلال احمد نامی ایک شخص سے ہوئی جس نے اسے اپنی بیٹی کے بارے میں بتایا جو ملک سے باہر تعلیم حاصل کر رہی تھی، اس نے رشیدہ کو ایک کہانی سنائی جس میں اس طرح کی تفصیلات تھیں کہ وہ کچھ افراد کے ساتھ تبت کے کسی علاقے میں گیا تھا جہاں سے اسے بدھ مت کے زمانے کا ایک خزانہ حاصل

ہوا اور بلال احمد خزانے کو لے کر یہاں تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا، مجھے مکمل تفصیلات تو نہیں بتائی گئیں لیکن یہ پتہ چل گیا کہ بلال احمد اس خزانے کا مالک بن چکا تھا ہسپتال میں میری بہن نے بلال احمد کی بہت زیادہ خدمت کی تو بلال احمد نے اسے اپنے ہاں ملازم رکھ لیا، ہسپتال سے فراغت کے بعد اس نے ایک شاندار کونٹری خریدی اور میری بہن کو اسی کونٹری میں بلا لیا، ایک منٹ، آپ لوگ کوئی ٹھنڈا مشروب لیں گے..... کافی یا چائے.....!

”نہیں میڈم..... اس کی ضرورت نہیں ہے۔“

”نہیں پلیز! بس یہ بتائیے کہ ٹھنڈا لینا پسند کریں گے یا گرم؟“

”آپ بلا وجہ تکلف کر رہی ہیں، ہم اتنے اچھے لوگ نہیں ہیں کہ آپ ہماری خاطر مدارت کریں۔“

”یہ آپ کی سوچ ہے، ایک منٹ.....! شکیلہ نے کہا اور ملازم کو بلانے کے لیے بیل بجا دی، ملازم اندر آیا تو اس نے کہا۔ ”بہت عمدہ سی کافی بنالاء، ہم چاروں کے لیے۔“

ملازم گردن خم کر کے چلا گیا۔ ایک لمحے کے لیے طارق شاہ نے اپنے دونوں ساتھیوں کی شکل دیکھی پھر بولا۔ ”جی آپ ہمیں کچھ بتا رہی تھیں۔“

”ہاں رشیدہ میرے پاس آتی رہتی ہے اور مجھے اپنے مالک کے بارے میں بتاتی رہتی ہے جو اپنی بیٹی کا انتظار کر رہا ہے۔ البتہ اس دوران اس نے رشیدہ سے کچھ اہم کام لئے، سونے کا یہ مجسمہ جس کی تصویر آپ نے مجھے دکھائی ہے، رشیدہ اپنے ساتھ لے کر ہانپتی کانپتی میرے پاس آئی تھی اور اس نے مجھے بتایا تھا کہ بلال احمد یہ مجسمہ فروخت کرنا چاہتا ہے، اس نے غالباً جیولرز سے بات کر لی تھی اور یہ مجسمہ رشیدہ کے ہاتھوں وہاں بھیجا گیا تھا، میں نے رشیدہ کو یہ بات بتادی تھی کہ کہیں ان حالات میں وہ کسی مصیبت میں نہ پھنس جائے، رشیدہ اب خود بھی پریشان رہتی ہے، اس کا کہنا ہے کہ بلال احمد کے پاس بہت بڑا خزانہ ہے، وہ بہت مضطرب رہتا ہے، خود سکون سے رہتا ہے نہ رشیدہ کو رہنے دیتا ہے۔“

”رشیدہ نے اسے چھوڑ کیوں نہیں دیا؟“

”وہ رشیدہ کو بیٹی کی طرح چاہتا ہے اسے ہر آسائش دی ہے اس نے لیکن یہ بھی کہہ دیا ہے کہ اگر خزانے کا راز کہیں اور گیا یا رشیدہ نے غداری کی تو وہ زندہ نہیں رہے گی، بقول رشیدہ

کے اس نے کچھ آدمی ملازم رکھے ہوئے ہیں کیونکہ رشیدہ جب بھی گھر سے باہر جاتی ہے، کچھ نامعلوم لوگ اس کے تعاقب میں ہوتے ہیں۔“

”تب تو وہ لوگ تمہارے بارے میں بھی جانتے ہوں گے؟“ طارق شاہ نے پر تشویش لہجے میں کہا۔

”سو فیصد جانتے ہیں، یہ بات رشیدہ کو بھی معلوم ہے، بلال احمد کے پوچھنے پر رشیدہ نے میرے بارے میں پوری تفصیل بھی بتادی ہے جس پر بلال احمد نے اس سے کہا تھا کہ وہ بے شک اپنی بہن سے مل سکتی ہے لیکن خبردار خزانے کے بارے میں کسی کو علم نہیں ہونا چاہئے، رشیدہ نے مجھ سے کہا ہے کہ میں اگر اس کی زندگی چاہتی ہوں تو اس کے راز کو راز رکھوں۔“

”اور بلال احمد کی بیٹی.....؟ مائیکل نے سوال کیا۔

”اس کے بارے میں رشیدہ کو کچھ علم نہیں ہے لیکن بلال احمد کا اس سے رابطہ ہے۔“

”اوہ.....! صورتحال خاصی بگڑی ہوئی ہے۔“ علی شیر نے کہا۔ ان تینوں کے چہرے غور و فکر کا نشان بن گئے تھے، ویسے مسز عالیہ شاہ نے ان کے ساتھ جو تعاون کیا تھا اس سے وہ خاصے متاثر ہوئے تھے۔

ملازم اس دوران کافی ان کے سامنے رکھ گیا اور عالیہ شاہ ان کے لیے پیالیوں میں کافی انڈیلنے لگی، ان تینوں کے فرشتوں کو بھی اس بات کا علم نہیں ہو سکا تھا کہ سامنے بیٹھی ہوئی خوفناک عورت کے مشاق ہاتھوں نے کافی کی ان تین پیالیوں میں گریم سی کی گولیاں ڈال دیں جن میں کافی انڈیلی گئی تھی، چوتھی پیالی بالکل خالی تھی، پھر اس نے شکر کے بارے میں ان سے پوچھا اور ان کی خواہش کے مطابق شکر ڈال کر کافی میں حل کی اور اہتمام سے کافی ان کے سامنے پیش کر دی۔

طارق شاہ نے کہا۔ ”آپ کے اس تعاون کا ہم دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں میڈم اور اب کسی ثبوت کی ضرورت نہیں ہے، آپ کی بہن آپ کو بتا چکی ہے کہ بلال احمد ایک غاصب آدمی ہے، وہ اس خزانے کو اکیلا ہی ہڑپ کر جانا چاہتا ہے جبکہ وہ خزانہ ہماری زندگی کے لیے بہت بڑی اہمیت کا حامل ہے محترمہ! وہ شخص آپ کی بہن کو بے وقوف بنا کر اپنا الوسیدھا کر رہا ہے، وہ مجسمے فروخت کر رہا ہے اور اس دولت کو غالباً ملک سے باہر منتقل کر رہا ہے اور جب اس کا

یہ کام مکمل ہو جائے گا تو میں دعوے سے کہتا ہوں کہ اپنے راز کو راز رکھنے کے لیے وہ آپ کی بہن کو قتل کر دے گا، حقیقت آپ کی نگاہوں کے سامنے ہے، کیا آپ ہماری مدد نہیں کریں گی، اس مدد کے عوض جو بھی چاہیں گی، ہم کرنے کے لیے تیار ہیں خزانے کا کچھ حصہ دینے کے لیے تیار ہیں، پھر آپ کی بہن کی زندگی بھی بچ جائے گی اس طرح۔“

”آپ لوگ یقین کیجئے، عدنان شاہ کی موت کے بعد جو زندگی میں نے اپنائی ہے، اس میں کہیں کوئی ضرورت نہیں رہی ہے میرے لئے، میں نے عدنان شاہ کے اثاثے ساؤتھ افریقہ سے اپنے وطن میں ٹرانسفر کر لئے ہیں، تنہا ہوں، میرے لئے وہ اثاثے کافی ہیں، لیکن بہر حال اپنی بہن کی زندگی میں ضرور چاہتی ہوں، اگر آپ لوگوں نے میری نشاندہی پر کوئی کارروائی کی تو کہیں میری بہن کی زندگی خطرے میں نہ پڑ جائے۔“

”ہمارے ذہن میں ایک پلان ہے، آپ اس پر غور کیجئے یقیناً آپ ہم سے تعاون کریں گی۔“

”پلیز کافی لیجئے۔“ شکیلہ نے بڑے سادہ سے انداز میں اپنی پیالی میں کافی انڈیلی اور اس میں آدھا چمچہ شکر ڈال کر ہلانے لگی۔

”آپ غالباً.....! میرے لئے آدھی پیالی کافی ہوتی ہے۔“ عالیہ شاہ نے کہا اور جلدی سے کافی اٹھا کر ہونٹوں سے لگالی۔ وہ تینوں بھی کافی پی رہے تھے اور شکیلہ دل ہی دل میں مسکرا رہی تھی کہ دوستو! خزانہ تمہارے معدے میں منتقل ہو رہا ہے۔

ان میں سے ایک نے کہا۔ ”ہم آپ کے بتائے ہوئے پتے پر پہنچ جائیں گے اور سب سے پہلے ہم یہ جائزہ لیں گے کہ وہ کون لوگ ہیں جو آپ کی بہن کا تعاقب کرتے ہیں پھر ہم انہیں ڈاج دے کر رشیدہ کو نکال لیں گے جب تک ہم یہ کام نہیں کر لیں گے آپ بالکل بے فکر رہیں ہم بلال احمد کی جانب رخ بھی نہیں کریں گے رشیدہ کو محفوظ مقام پر پہنچا کر چاہے وہ آپ کا گھر ہی کیوں نہ ہو، ہم بلال احمد سے خزانے کے بارے میں معلومات حاصل کریں گے، جو لوگ بلال احمد کے لیے کام کر رہے ہیں انہیں راستے سے ہٹانا ہماری ذمہ داری ہے، دیکھئے ہماری پوری زندگی کا سوال ہے اور ہم لوگ کوئی شریف لوگ نہیں ہیں، آپ یقین کریں اگر آپ ہم سے تعاون نہ کرتیں تو ہم آپ کو بھی نقصان پہنچا سکتے تھے خزانے کے حصول کے لیے ہم دنیا

آیا، میں نے اسے صفحہ ہستی سے مٹا دیا اور اب تمہاری باری ہے۔“
”مم..... مگر تم تم.....!“

”تم تینوں بھی ختم ہو چکے ہو، ذرا اپنے آپ کو جنبش دے کر دیکھو، تمہارے جسم مفلوج ہو گئے ہیں، کافی میں تمہیں ایک بہت ہی تیز قسم کا زہر دے دیا گیا ہے۔“
”کیا.....؟“ تینوں کے منہ سے بیک وقت نکلا۔ انہوں نے اپنے جسموں کو جنبش دینے کی کوشش کی لیکن گریم سی آج بھی اپنے جوبن پر تھی، ان کے چہرے ہلدی کی طرح زرد ہو گئے۔

شکیلہ قہقہے لگانے لگی پھر اس نے کہا۔ ”تھوڑی دیر کے بعد تمہارے جسم روح سے آزاد ہو جائیں گے، البتہ ایک مسئلے پر میں خاص طور سے غور کر رہی ہوں، لاشیں ٹھکانے لگانے کے لیے مجھے کوئی مناسب طریقہ کار اختیار کرنا ہوگا۔“

وہ تینوں آہستہ آہستہ حواس کھوتے جا رہے تھے اور شکیلہ کی آنکھوں میں فاتحانہ چمک بڑھتی جا رہی تھی۔ یہاں تک کہ سب سے پہلے مائیکل کی گردن ڈھلکی، اس کے بعد طارق شاہ اور آخر میں علی شیر بے جان ہوا، تب شکیلہ نے اپنی جگہ چھوڑی اور ان کے قریب آ کر ان کا جائزہ لینے لگی۔

☆.....☆.....☆

دنیا اس کے لیے کیسی ہی ہو، لیکن نجانے کیوں تقدیر ہمیشہ اس کا ساتھ دیتی تھی، اب تو اسے یاد بھی نہیں رہا تھا کہ کتنے افراد کو اس نے زندگی سے محروم کر دیا تھا، اس کے اندر کی دیوانگی میں ابھی تک کوئی فرق نہیں آیا تھا، بڑے بڑے خطرناک لوگ اس کے ہاتھوں موت کے گھاٹ اتر گئے تھے، اس کی مثال وہ تینوں جرائم پیشہ افراد تھے، مائیکل، طارق شاہ اور علی شیر..... نجانے اپنی زندگی میں وہ کیسے کیسے لوگوں سے نبرد آزما ہو چکے تھے لیکن اس معمولی سی عورت نے ان لوگوں کی زندگی کی کہانی ختم کر دی تھی، البتہ کبھی کبھی اس پر بڑی دیوانگی کے دورے پڑتے تھے، وہ اپنے بال نوچتی تھی، اپنے آپ کو مارتی تھی، اس وقت وہ بڑی زخم خوردہ ہو جاتی تھی، اسے احساس ہوتا تھا کہ انسانوں کو زندگی سے محروم کر کے اس نے قانون کی نگاہوں میں ہی نہیں

کا ہر کام کر سکتے ہیں۔“

”میں جانتی ہوں تم لوگوں نے واقعی خزانے کے حصول کے لیے بڑی محنت کی ہے اور تم لوگ یقین کرو کہ اگر میری زندگی کی کہانی اس کہانی سے مختلف ہوتی تو شاید یہ خزانہ میرے لئے بھی بڑی اہمیت کا حامل ہوتا۔“

شکیلہ نے ان تینوں کی پیالیاں خالی دیکھ لی تھیں اور اب وہ نڈر اور شیر ہوتی جا رہی تھی۔
”آپ یوں کریں مسز عالیہ.....! آپ کی بہن نے اپنی رہائش گاہ کا پتہ تو بتایا ہی ہوگا؟“

جواب میں مسز عالیہ یا شکیلہ کے حلق سے ایک قہقہہ آزاد ہو گیا تھا۔ وہ تینوں حیرانی سے اسے دیکھنے لگے۔ مائیکل نے کہا۔ ”ہنسنے کی کیا بات ہے؟“

”آپ لوگوں نے میری فرضی کہانی پر یقین کر لیا؟“ عالیہ کی آواز ابھری اور وہ تینوں اس کے الفاظ کا مفہوم سمجھنے کی کوشش کرنے لگے اور جب وہ الفاظ ان کے ذہنوں میں فٹ ہوئے تو علی شیر کی حیران آواز ابھری۔ ”کیا کہا آپ نے فرضی کہانی.....؟“

”سو فیصد فرضی..... اصل میں وقت نے مجھے کہانیاں سنانا سکھا دیا ہے، میں کیا کروں سلوک ہی میرے ساتھ ایسا ہوا ہے، میری کوئی بہن نہیں ہے، بلال احمد سے براہ راست میری ملاقات ہوئی تھی، میں اس ہسپتال میں نرس تھی جس میں بلال احمد تم لوگوں سے خوف زدہ ہو کر آچھپا تھا، تم لوگ اسے اعلیٰ درجے کے کمروں میں تلاش کرتے رہے، تم نے سوچا کہ اپنی حیثیت کے مطابق ہی ہسپتال میں جگہ بنائے گا لیکن وہ تم سے زیادہ چالاک نکلا، اس نے جنرل وارڈ میں ایک معمولی مریض کی حیثیت سے اپنے آپ کو داخل کرایا اور تم اس طرف نہ آ سکے پھر اس نے مجھے اپنے بارے میں بتایا، بھلا ہسپتال میں کام کرنے والی ایک معمولی سی نرس کو ایسے کسی خزانے کا راز معلوم ہو جائے اور وہ خزانے کے مالک کو زندہ چھوڑ دے کیا یہ ممکن ہے، میں نے اسے قتل کر دیا، یہ کام میرے لئے مشکل نہیں تھا اور اس کے بعد میں نے ہسپتال چھوڑ دیا اور اس خزانے تک پہنچ گئی، اب یہ تو تمہیں معلوم ہے ہی کہ ایک معمولی سی ملازمہ قسم کی عورت نے وہ مجھے زیارت شاہ کو فروخت کئے تھے، وہ میں ہی تھی اور اس کے بعد میں نے اپنی زندگی، اپنی بود و باش بدل لی اور اپنے راستے کے ہر کانٹے کو صاف کرتی چلی گئی، جو بھی میرے راستے میں

انسانیت کی نگاہوں میں بھی کتنا بڑا جرم کیا ہے۔
رات کی تنہائیوں میں اسے شدید احساس ہوتا تھا کہ اس کائنات میں وہ کس قدر تنہا ہے، کبھی کبھی اس کی آنکھیں کسی ایسے انسان کی تلاش میں بھٹکتی تھیں جو محرم راز ہو، جو اس کے دل کی آواز سنے، جو اس سے کہے کہ شکلیہ! تم بے گناہ ہو، جو کچھ کیا ہے دنیا نے کیا ہے، دنیا نے تمہارے ساتھ نا انصافی کی ہے اگر کوئی بد صورت ہے تو اس میں اس کا قصور تو نہیں ہے، بے شمار افراد اس کائنات میں بد صورت ہوتے ہیں۔

کبھی کبھی وہ کسی بھرے پرے بازار میں جہاں کار کھڑی کرنے کی جگہ ہوتی تھی تنہا اپنی کار میں بیٹھ کر انسانوں کا جائزہ لیتی تھی، اس کی آنکھیں ایسے جوڑوں کی تلاش میں بھٹکتی تھیں جو اس کی طرح بد صورت ہوں لیکن ہنستے بولتے نظر آتے ہوں اور بار بار اس نے ایسے لوگوں کو دیکھا تھا ایک بد صورت عورت ایک خوش شکل مرد بظاہر بالکل مطمئن اور مسرور، بیشتر اس کا دل چاہا کہ ایسے لوگوں سے ملاقات کرے اور پوچھے کہ کیا اس کا شوہر اس کی بد صورتی سے نفرت نہیں کرتا، مرد سے پوچھے کہ وہ اس بد صورت عورت کے ساتھ کیسے گزارہ کر رہا ہے لیکن پھر خود ہی اپنے آپ کو روک لیتی تھی۔ بس ایک نفسیاتی مریضہ کی حیثیت سے زندگی گزار رہی تھی وہ..... اس کی متلاشی آنکھیں بے شمار چہروں پر بڑے حسرت بھرے انداز میں گڑ جاتی تھیں، راحیل بھی ایسا ہی ایک نوجوان تھا، ایک خوبصورت سے جنرل سنور میں وہ لباس کے سیکشن میں خوبصورت لباس دیکھ رہی تھی اور کچھ الجھی الجھی سی تھی کہ وہ دبلا پتلا، خوبصورت سانو جوان اس کے قریب آ گیا۔

”ایکسیکسکوز میڈم..... کیا میں آپ کی کچھ مدد کر سکتا ہوں؟“ شکلیہ نے پلٹ کر اسے دیکھا۔ ایک لمحے کے لیے اسے یہ نوجوان بڑا پیارا محسوس ہوا، دبلا پتلا، سبک سے نقوش، آنکھوں پر عینک، چہرے پر ایک ہلکی پھلکی شریسی مسکراہٹ جو شاید قدرتی تھی بہر حال وہ سنبھل گئی۔ اس نے کہا۔ ”کیا مطلب، کیا مدد کریں گے آپ میری.....؟“

”میں اس اسٹور کا منیجر ہوں، آپ کو بہت دیر سے دیکھ رہا تھا، نجانے کیوں میرا دل چاہا کہ لباس کے انتخاب میں آپ کی مدد کروں، یہ سیلز مین شپ نہیں ہے بلکہ بس یوں سمجھ لیجئے کہ دل کے کہنے پر میں آپ کے پاس آ گیا ہوں، اگر آپ کو میری آمد ناگوار گزری ہو تو معافی مانگ کر واپس چلا جاؤں گا۔“

نجانے کیوں شکلیہ کا دل بری طرح دھڑکا، اس نے سوچا کہ اگر تم دل کی آواز پر یہاں تک آئے ہو تو میرے دل کے اندر بھی جھانک کر دیکھ لو، کیا طلب ہے میری، بہر حال وہ ایک لمحے کے لیے سب کچھ بھول گئی تھی۔

نوجوان نے کہا۔ ”آپ اگر واقعی لباس خریدنا چاہتی ہیں تو آئیے میں آپ کو اس طرف کچھ لباس دکھاؤں، خواتین کا خیال ہے کہ لباس کے سلیکشن میں، میں بڑی مہارت رکھتا ہوں، آپ یقین کیجئے آئیے نا میرے ساتھ.....“ اس نے اس طرح کہا جیسے شکلیہ اس کی بات ضرور مان لے گی اور شکلیہ نے اس کی بات مان لی تھی۔ وہ اس کے ساتھ ساتھ چل پڑی۔

”تو میں کہہ رہا تھا کہ منطق کی رو سے خواتین کے لیے خوبصورت لباس کا انتخاب مرد ہی کر سکتے ہیں، اصل میں خواتین خود اپنے طور پر جو فیصلے کرتی ہیں، وہ زیادہ تر غلط ہوتے ہیں، مرد ہی یہ فیصلہ کر سکتا ہے کہ کون سی خاتون کون سے لباس میں دلکش لگ رہی ہے۔“ نوجوان کی باتیں شکلیہ کو دلکش لگ رہی تھیں۔ جہاں وہ جا کر رکھا، وہاں بھی بہت سے لباس لٹکے ہوئے تھے۔

”دیکھئے یہ..... یہ دیکھئے میں خاص طور سے ان تین لباسوں کی طرف آپ کی توجہ دلاؤں گا، آپ کا رنگ تو سانولا ہے، سانولا میں اخلاقاً کہہ رہا ہوں، آپ اچھی خاصی کالی ہیں، منطق کی رو سے حالانکہ جہاں تک میرا اندازہ ہے عمر زیادہ نہیں ہے لیکن آپ کے بدن پر چربی کی تہیں اپنا قبضہ جمانے لگی ہیں اگر آپ یہ ہلکے پھلکے لباس پہنیں گی تو آپ یقین کیجئے اچھی نہیں لگیں گی، آپ کو اپنے جسم کے لحاظ سے لباس پہننے چاہئیں، مجھے معاف کیجئے گا اگر آپ ایک نوجیز حسینہ بننے کی کوشش کریں گی تو منطق کی رو سے.....!“ نوجوان خاموش ہو گیا۔

شکلیہ کا چہرہ اتر گیا تھا، ایک لمحے کے لیے نجانے وہ کن خوابوں میں کھو گئی تھی۔ اس شخص نے جہاں سے اپنی گفتگو کی ابتداء کی تھی، وہاں شکلیہ کو ایک خواب سا نظر آنے لگا تھا لیکن آخر میں وہ خواب ہمیشہ کی طرح چکنا چور ہو گیا تھا۔

نوجوان اپنی رو میں بولے جا رہا تھا۔ ”میں اسٹور کے منیجر کی حیثیت سے ہی نہیں ایک دوست کی حیثیت سے آپ کو یہ مشورہ دے رہا ہوں، لیکن منطق کی رو سے فیصلے آپ ہی کو کرنے ہیں۔“

شکلیہ نے رحم آمیز نگاہوں سے اسے دیکھا اور دل ہی دل میں بولی کہ بے وقوف آدمی کم

از کم جھوٹ ہی بول دیتا، کچھ دیر اسی طرح قائم رہنے دیتا میرے ان احساسات کو لیکن تونے تو لمحے بھی نہ لگائے اور میرے اندر کی سفاکی جگا دی۔ بہر حال اس نے خود کو سنبھال لیا تھا۔ وہ مسکرا کر نو جوان کی طرف دیکھنے لگی، پھر بولی۔ ”تمہیں اس بات کا احساس ہے کہ میں ایک کالے رنگ کی بد صورت عورت ہوں پھر بھی تم مجھے لباس کے معاملے میں مشورے دے رہے ہو، تمہیں تو یہ کہنا چاہئے تھا کہ میڈم اپنی اوقات میں رہیں، جیسی منحوس صورت آپ نے پائی ہے، اس پر کوئی بھی چیز پہن لیں، آپ کو اچھی نہیں لگے گی کیوں.....؟ یہی کہنا چاہئے تھا نا تمہیں۔“

”ارے تو بہ..... منطق کی رو سے اگر یہ الفاظ کہہ دیتا تو آپ اپنے پاؤں سے سینڈل نکال کر میرے سر پر طبلہ بجانا شروع کر دیتیں، بھلا حقیقتیں کون برداشت کر سکتا ہے مگر سچ بتاؤں میں حقیقت پسند ہوں، میرا کام سچ بولنا ہے اور اکثر سچ بول کر نقصان اٹھا چکا ہوں۔“

”بے فکر رہو، مجھ سے سچ بول کر تم نقصان نہیں اٹھاؤ گے، کیا نام ہے تمہارا؟“

”راجیل..... راجیل عزیز۔“

”نو کری کرتے ہو یہاں؟“

”جی ہاں میجر ہوں، میرا مالک بس..... اللہ ہی اس طرح کے مالکوں سے محفوظ رکھے، دنیا کی دولت خود جمع کر لینا چاہتا ہے اور اس کی خواہش ہے کہ ملازم کبھی خوشحال نظر نہ آئیں، سس..... سوری..... سوری میں نے کیا بکواس شروع کر دی، بات اصل میں صرف اتنی سی ہے کہ حقیقتیں کوئی پسند نہیں کرتا، اب دیکھئے ناب صورت سے بد صورت انسان آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر کس طرح اپنے وجود کو سنوارتا ہے، اپنے چہرے کے ایک ایک نقش کو دیکھتا ہے اور یہی سوچتا ہے کہ کائنات میں اس سے زیادہ حسین اور کوئی نہیں ہے، قدرت انسان کو اگر یہ حس نہ دیتی تو آدھے لوگ تو اپنی بد صورتی کے نتیجے میں خودکشی کر لیتے، میں پھر کچھ زیادہ بول رہا ہوں منطق کی رو سے معافی چاہتا ہوں۔“

”نہیں مجھے تمہاری باتیں بہت اچھی لگ رہی ہیں، نکال دو میرے لئے یہ تینوں لباس، پیک کرادو جن کا انتخاب تم نے کیا ہے۔“

اشارہ کیا اور نو جوان نے خوشی سے گردن ہلادی۔

”آپ کی قدر افزائی کا شکریہ۔“ وہ گردن خم کر کے بولا۔

”طوطے کی طرح بولتے ہو، مجھے اچھے لگے، کبھی میرے پاس آؤ۔“

”میں ضرور حاضری دوں گا، ایسے لوگ جو میری بات مان لیتے ہیں مجھے بھی اچھے لگتے ہیں۔“

”میرے پاس میرا کارڈ نہیں ہے، میرا پتہ نوٹ کر لو اور فون نمبر بھی، جب بھی آؤ مجھے فون کر کے آنا۔“

”بہت اچھی ملاقات رہی میری اور آپ کی میڈم.....! نجانے کیوں میں یہ سمجھتا ہوں کہ میں ایک بہترین ایڈورٹائزر ہوں، چلئے ٹھیک ہے، بات کریں گے آپ سے، میں آپ کو کچھ اچھے مشورے بھی دوں گا منطق کی رو سے۔“

شکیلہ ہنستی ہوئی وہاں سے چلی آئی۔ کار میں آ کر بیٹھی اور اس کے بعد گھر چل پڑی۔

گھر آنے کے بعد اس نے ان لباسوں کو کھول کر دیکھا، بڑے ہی بدنما لباس تھے، اس کا خون کھولنے لگا، نو جوان کی باتیں اسے یاد آنے لگیں اور اس کے بعد اس پر دورہ سا پڑ گیا، اس نے ان لباسوں پر مٹی کا تیل ڈال کر آگ لگا دی، لباس جل کر خاکستر ہو گئے تھے، اس کے پورے جسم میں تشنج کی کیفیت تھی اور وہ بری طرح غرار ہی تھی۔

”سیاہ چہرہ، بھدے نقوش..... میں بہت ہی بدنما ہوں اور کچھ کہنا چاہتا تھا تو ٹھیک ہے، تم لوگوں کی حسن پرستی تمہاری موت بن رہی ہے تو میں کیا کروں۔“ اس نے دل ہی دل میں کہا اور ٹھنڈے پانی کے کئی گلاس پینے کے بعد ایک آرام دہ کرسی پر نیم دراز ہو گئی، اس کا سارا وجود جل رہا تھا، ایک بھی ایسا نہیں ہے، کوئی بھی نہیں ہے جو مجھے تھوڑا سا سکون دے دے، آہ.....! یہ حسرت یہ آرزو شاید میری موت کے ساتھ ہی قبر میں جائے گی۔

”کیا کرنا چاہئے، میں جیوں یا دوسروں کو جینے دوں آہ.....! میری ماں اتنی زندگیاں لے چکی ہوں میں، تو نکل گئی میرے ہاتھوں سے، کاش اس وقت میں تیرے بارے میں کوئی صحیح فیصلہ کر لیتی جب تو یہاں موجود تھی، اگر میں تجھے اسی طرح خاک و خون میں نہلا دوں تو شاید میرے اندر کی درندگی ختم ہو جائے لیکن تیرے بارے میں کہاں سے پتہ لگاؤں، کوئی ذریعہ نہیں

ہے، آہ کاش، آہ کاش.....!“ یہ اذیتیں، یہ احساسات تو اب اس کی زندگی کا حصہ بن چکے تھے، کوئی ذریعہ نظر نہیں آتا تھا زندگی گزارنے کا، بس ایک جنون تھا جو زندہ رکھے ہوئے تھا۔

بارہا اس کے دل میں خیال آیا کہ اس بیکار زندگی سے کیا حاصل، کیوں نہ زندگی کی اس کہانی کو ختم کر دیا جائے، اس سے بہت سی زندگیاں بچ جائیں گی، لیکن اس کا جنون اس عمل سے بھی روک دیتا تھا اور وہ سوچتی تھی کہ میرا کوئی قصور نہیں ہے، میری اس فطرت کی تشکیل میری ماں نے کی ہے جو زندہ ہے اور اپنے محبوب کے ساتھ گل چہرے اڑا رہی ہے۔ اگر میری ماں میری پیدائش کے فوراً بعد مجھے زندگی سے محروم کر دیتی تو بات ہی ختم ہو جاتی، وہ خود بھی اذیتوں سے بچ جاتی اور میں بھی، اب اگر میں اپنے آپ کو ختم کر لوں تو اپنے ساتھ ایک اور زیادتی کروں گی، نہیں یہ نہیں ہونا چاہئے۔

لوگ جو مجھ سے نفرت کرتے ہیں، میری شکل و صورت کا مذاق اڑاتے ہیں، انہیں کیفر کردار تک پہنچنا چاہئے، ہاں اگر کبھی قانون کو اس بات کا علم ہو گیا کہ ان لاتعداد انسانوں کی قاتل میں ہوں اور مجھے گرفتار کر لیا گیا تو میں خوشی سے اپنے آپ کو قانون کے حوالے کر دوں گی اور ہر قتل کا اعتراف کر لوں گی، میرے انکشافات سے لوگ کانپ اٹھیں گے۔ واہ کیا دلچسپ مشغلہ ہوگا، لیکن اس کے لیے انتظار کرنا ہوگا اور یہ انتظار بہت ہی پر لذت ہوگا، اب کتنے لوگوں کی تعداد بڑھ جاتی ہے، یہ ان لوگوں پر منحصر ہے۔

سب سے بڑی اور سب سے بُری بات یہ تھی کہ کوئی اس کا راز دار نہیں تھا، کبھی کبھی تو دل چاہتا تھا کہ دیوار کے سامنے کھڑے ہو کر اپنی داستان سنائے، کہہ دینے سے نجانے کیا کیا کچھ ہو جاتا ہے، اگر احساسات اندر ہی اندر گھٹتے رہیں تو بہت خوفناک شکل اختیار کر جاتے ہیں کہہ دینا بہت سے معاملات سے نجات دلا دیتا ہے، مگر کس سے.....

جسے بھی اپنا راز دار بناتی، وہ جان کا گاہک بن جاتا۔ یہ خطرہ وہ آج مول نہیں لے سکتی تھی اور آئندہ بھی مول نہیں لینا چاہتی تھی۔ سوچ بچار کے دوران اس کے ذہن میں ایک خیال آیا، ڈائری کاغذ اور قلم..... آہ اب تک میں نے اس بارے میں کیوں نہیں سوچا پھر ایک انتہائی خوبصورت ڈائری کا آغاز ہو گیا اور اس نے اس دن سے اپنے دل کی کہانی اوراق پر منتقل کرنا

شروع کر دی۔ جس دن سے اس نے ہوش سنبھالا تھا اور جس دن اسے اپنے باپ، اپنی ماں اور اپنے چھوٹے سے ماضی کے بارے میں علم ہوا تھا، اوراق اس کا سہارا بن گئے۔ جوں جوں وہ اپنی داستان کاغذ کی نذر کر رہی تھی، اسے اپنے بوجھ کے ہلکے ہونے کا احساس ہو رہا تھا۔

ادھر راحیل بھی اس کے ذہن سے نہیں نکلا تھا، ڈائری نے کمال کیا تھا، وہ بہت ہشاش بشاش ہو گئی تھی، لیکن اپنی طلب اور اپنے مزاج کو وہ تبدیل نہیں کر سکتی تھی، راحیل کو فون کیا تو راحیل نے اسے فوراً پہچان لیا۔

اصل میں میڈم.....! ہر شخص کو اپنی اوقات کا خیال رکھنا چاہئے، آپ بہت بڑی شخصیت کی مالک ہیں، میں نے آپ کے بارے میں معلومات حاصل کی تھیں، میں نے سوچا کہ کسی کو عزت سے ایک بار پکار لینا الگ بات ہے لیکن گلے پڑنا بڑا مشکل کام ہے اور جو لوگ اس فن سے واقف ہیں، وہی کامیاب ہوتے ہیں۔“

”بھئی بہت باتیں مت کرو طوطے.....! مجھے طوطے بے شک اچھے لگتے ہیں لیکن بس زیادہ باتیں کرنا اچھا نہیں لگتا، میرے پاس آؤ، مجھ سے ملو۔“

”حکم فرمائیے، کب حاضر ہو جاؤں؟“

”اپنے کام سے کب فارغ ہوتے ہو؟“

”منیجر کی جگہ ملی ہے مجھے، پابندی بہت زیادہ نہیں ہے، جب آپ حکم دیں آ جاؤں۔“

”شام کو چائے پر آ جاؤ۔“ اور اس دن شام کی چائے پر راحیل اس کے پاس موجود تھا۔

”آپ کی اس قدردانی اور محبت کا کوئی جواب نہیں ہے، ایک معمولی سی بات کہہ دی تھی میں نے، آپ نے اسے اہمیت دے دی، یہ آپ کی بڑائی ہے۔“

”ارے نہیں..... کوئی بھی لباس لے لیتی میں وہاں سے، بس تم نے مشورہ دے دیا لیکن بعض لوگ اچھے لگتے ہیں، اب یہ الگ بات ہے کہ بعض اوقات دن وے ٹریفک چلانا پڑتا ہے مثلاً تم مجھے اچھے لگے، میں تمہیں اچھی نہیں لگی، یہ میرا اور تمہارا عمل ہے۔“

”نہیں میڈم.....! ایسی بات نہیں ہے، میں معذرت چاہتا ہوں، میں نے جو کچھ کہا ہے

تکلفی سے کہہ دیا کیونکہ لفظوں کی تراش خراش مجھے نہیں آتی، آج بھی اگر آپ یہ کہیں کہ میں آپ کو خوبصورت کہوں تو آپ بتائیے یہ کیسے ممکن ہے؟“

”ہاں یہ بات تو ٹھیک ہے..... اب فرض کرو اگر میں تمہیں اپنے ساتھ سیروسیاحت کی دعوت دوں؟“

”تو بابا میں نہیں قبول کروں گا، زندگی میں انسان کے کچھ اصول ہوتے ہیں، آپ میری کرم فرما تو ہو سکتی ہیں، میری دوست نہیں۔“

”ہاں یہ بھی ٹھیک ہے اچھا راحیل.....! خیر چھوڑو اپنے بارے میں بتاؤ۔“

”بس کچھ نہیں..... تمہارا رہتا ہوں، شادی نہیں کی، ہم دو بھائی ہیں، بڑے بھائی نے بھی شادی نہیں کی، بڑے بھائی مجھ سے دو سال بڑے ہیں اور ملک سے باہر ہیں، وہ ایک خاص شعبے میں تربیت لینے کے لیے گئے ہوئے ہیں، مگر میرا خیال ہے واپسی کا ارادہ نہیں رکھتے، سال دو سال میں ایک آدھ بار آ جاتے ہیں، مجھے بہت عزیز ہیں، میں ان کا بے حد احترام کرتا ہوں اور وہ مجھے اپنے بچوں کی طرح چاہتے ہیں۔“

”گڈ.....! اور والدین؟“

”اور کوئی نہیں ہے، والدین میرے بچپن میں انتقال کر گئے تھے، یہی وجہ تھی کہ بڑے بھائی نے میری پرورش کی اور مجھے سہارا دیا، منطق کی رو سے۔“

شکیلہ ہنس پڑی۔ یہ منطق کی جو باتیں کر رہا تھا، اس کے بارے میں نہیں جانتا تھا کہ اپنے لئے کتنا گہرا گڑھا کھود رہا ہے۔

وہ راحیل سے کئی بار ملی، راحیل کچھ کھسکا ہوا تھا، یہ بات اس نے بار بار کہی کہ مسز عالیہ شاہ ایک بد صورت عورت ہے، اس کا مزاج اچھا ہے لیکن اس کی شکل بہت بُری ہے۔

بس یہی کہا جاسکتا ہے کہ موت راحیل کو گھیر رہی تھی اور آخر کار وہ وقت آ گیا جب شکیلہ نے راحیل کی موت کا فیصلہ کر لیا حالانکہ وہ اس طوطے کی طرح بولنے والے نوجوان کو کھونا نہیں چاہتی تھی لیکن اس کی باتیں سن کر اس کے دل میں جو گھٹن اور جو احساس پیدا ہو جاتا تھا، وہ اسے دیوانہ کئے دیتا تھا، اس کی ڈائری میں اب اس کے ہر احساس کی تفصیل موجود تھی۔ راحیل کے

ایک دوست نے جو اس کے ساتھ ہی سٹور میں کام کرتا تھا اور اکاؤنٹنٹ تھا، راحیل سے کہا۔

”ان دنوں تمہارے پاس مسز شاہ کے فون بہت آتے ہیں، خیر تو ہے؟“

”یار.....! میری بہت اچھی دوست ہے حالانکہ ایک بد صورت عورت ہے لیکن بعض اوقات صورتوں سے کچھ نہیں ہوتا، وہ مجھ سے بہت اچھی باتیں کرتی ہے اور مجھے پسند کرتی ہے۔“

”تو شادی کر لو اس سے۔“

”لغت ہے تم پر..... اگر پسندیدگی کا اظہار کیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس سے شادی کر لی جائے، یار کہاں میں کہاں وہ..... دولت مند ہوگی اپنے گھر کی ہوگی، میرے پاس اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔“

راحیل سمجھتا تھا کہ یہ باتیں کوئی حیثیت نہیں رکھتیں، بس یہی اس کی نا تجربہ کاری تھی کیونکہ ایک دن مکمل تیاریوں کے بعد آخر کار گریم سی اس کے معدے میں بھی پہنچ گئی اور جب گریم سی اس کے معدے میں اتر گئی تو شکیلہ نے اس سے کہا۔ ”راحیل.....! میں بہت بد صورت ہوں نا؟“

”آپ بار بار اپنی صورت کا تذکرہ کیوں کرتی ہیں؟“

”میں ایک سوال کرنا چاہتی ہوں تم سے۔“

”کیجئے۔“

”اگر میں کہوں کہ مجھے تم سے محبت ہو گئی ہے اور میں تم سے شادی کرنا چاہتی ہوں تو تم

اس کا کیا جواب دو گے؟“

راحیل بھونچکا ہو کر اسے دیکھنے لگا پھر وہ بولا۔

”اگر یہ صرف سوال ہے اور اس سوال کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے تو میں آپ سے

عرض کروں کہ آپ میری عمر سے مطابقت رکھتی ہیں اور نہ میرے معیار سے..... مجھ میں اور

آپ میں بہت فرق ہے، آپ ایک بد شکل خاتون ہیں اور میں شکل و صورت کو بنیادی حیثیت

دیتا ہوں کیونکہ اس سے انسان کا پورا مستقبل وابستہ ہوتا ہے ساری عمر انسان ایک ایسے وجود کو

دے کہ شکیلہ تو اس طرح نہ بھٹک، زندگی کو سمجھ کر جی، کیا طریقہ کار ہو سکتا ہے اس کا اور پھر بہت دیر تک غور کرنے کے بعد اس نے سوچا کہ کیوں نہ میں گوشہ نشین ہو جاؤں، کیا ضروری ہے کہ انسانوں کے غول میں جا کر انسانوں سے اپنا مذاق اڑاؤں اور اس کے بعد ان کی زندگی کے درپے ہو جاؤں، میں خود ہی اپنے آپ کو کیوں نہ سنبھالوں، اگر میں باہر نہ نکلوں تو یہ زیادہ بہتر ہوگا، زندگی گزارنے کے بے شمار لوازمات میرے پاس موجود ہیں۔

میں وہ زندگی کیوں نہ گزاروں جو آسمانوں سے میرے لئے مقدر کر دی گئی ہے کمال کی بات ہے ایک میں ہی بد صورت تو نہیں ہوں اس دنیا میں، میں لوگوں سے زندگی چھینتی پھر رہی ہوں، میری زندگی مجرمانہ ہو گئی ہے، ایسا نہیں ہونا چاہئے، ایسا واقعی نہیں ہونا چاہئے۔“

بہر حال راحیل کی لاش کو ٹھکانے لگانے کے بعد وہ درحقیقت گوشہ نشین ہو گئی، گھر میں پڑی رہتی، زیادہ سے زیادہ اس کا محبوب مشغلہ ڈائری لکھنا تھا اور اس ڈائری میں اس نے اپنا کلیجہ نکال کر رکھ دیا تھا اور دنیا سے انصاف مانگا تھا۔ اس نے لکھا تھا کہ ہو سکتا ہے کہ یہ تنہائی مجھے ختم کر دے لیکن اگر کوئی صاحب دل اس ڈائری کو پڑھے تو یہ فیصلہ کرے کہ میں کہاں کہاں غلط تھی۔

بہت دن گزر گئے، گھر کے ملازمین کے سامنے بھی وہ کم ہی آتی تھی دنیا سے رابطہ کٹا ہوا تھا، کوئی بھی ایسا نہیں تھا جو اس کی طویل کمشدگی سے پریشان ہو کر اس تک آئے، اس سے پوچھے کہ کیا بات ہے، تم اس طرح کیوں منظر عام سے غائب ہو گئی ہو؟

نجانے کتنا عرصہ اس طرح اور گزر گیا، ایک طرح سے اسے گھن لگ گیا تھا پھر بری طرح اکٹا گئی تو گھر سے باہر نکلی، کلب جانے کو دل نہیں چاہتا تھا، کیا فائدہ، وہی لگا بندھا معمول، وہی بے نیاز لوگ جو اسے نگاہ بھر دیکھنا بھی پسند نہیں کرتے تھے جبکہ ان کی آپس میں خوب دوستیاں تھیں، وہ ایک دوسرے سے ملتے تھے، ایک دوسرے کے دکھ درد کے شریک تھے، آپس میں بیٹھ کر قہقہے بھی لگاتے تھے۔

وہ ان قہقہوں سے محروم تھی، اپنا تجزیہ بھی کر رہی تھی، اس نے یہ بھی سوچا تھا کہ کیا ضروری ہے کہ نوجوانوں کے درمیان اپنے آپ کو روشناس کرائے۔

برداشت نہیں کر سکتا جسے صبح اٹھ کر دیکھنے کو جی نہ چاہے، آپ خود سوچئے اس طرح کیا کسی کی زندگی خوشگوار رہ سکتی ہے، ایک شخصیت ایسی ہوتی ہے جسے ہر طرح سے اپنے معیار کے مطابق ہونا چاہئے معاف کیجئے گا میرے.....“ راحیل کا لہجہ لڑکھڑا گیا۔ اسے اپنی پلکوں پر بوجھ محسوس ہو رہا تھا۔ شکیلہ نے افسوس بھرے انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”آہ کاش ایک شخص کوئی ایک شخص مجھے ایسا مل جاتا جو مجھ سے کہتا کہ نہیں شکیلہ ظاہری حسن کوئی حیثیت نہیں رکھتا، انسان اندر سے خوب صورت ہو تو صحیح معنوں میں وہ حسین کہلانے کا مستحق ہے۔“

”یہ..... یہ مجھے کیا ہو رہا ہے مسز شاہ.....! نجانے کیوں میں اپنے بدن کو بے جان ہوتے ہوئے محسوس کر رہا ہوں؟“

”تمہارا یہ احساس آخری ہے راحیل.....! میں تمہیں موت کی خوشخبری دیتی ہوں، حسن چاہئے نا تمہیں، بد صورتی سے نفرت ہے تمہیں، موت خوب صورت ہے یا بد صورت..... اب یہ فیصلہ تم کرو گے، تم موت کی آغوش میں جا رہے ہو کیونکہ تم نے مجھ سے نفرت کا اظہار کیا ہے راحیل.....! میں اپنے آپ کو بالکل بے قصور سمجھتی ہوں، تم سب مجھ سے زندگی چھین لینا چاہتے ہو، مجھے یہ احساس دلا کہ اس دنیا میں میرا کوئی مقام نہیں ہے، لیکن میں نے تم سے لڑنے کا فیصلہ کر لیا ہے اور لڑ رہی ہوں۔“

راحیل نے پورے الفاظ سنے یا نہیں یہ نہیں معلوم، اس کا ذہن تو ماؤف ہوتا جا رہا تھا اور پھر ایک خاموش موت نے اسے گلے لگا لیا اور زندگی کے حسن کو زندگی بھر خوبصورت دیکھنے کا خواہشمند موت کی تاریک آغوش میں چلا گیا۔

وہ واقعی دلکش تھا، دلفریب تھا، شکیلہ اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے قریب بیٹھ گئی اور اس کے چہرے کو دیکھنے لگی، اس کے سبک نقوش، اس کی نوعمری اور اس کے چہرے پر موت کی تحریر دیکھ کر نجانے کیوں شکیلہ کا دل بھر آیا اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی، نجانے کتنی دیر تک وہ روتی رہی تھی۔

اس نے زار و قطار روتے ہوئے کہا۔ ”کیا ہے یہ سب کچھ، کیا ہے، آہ کوئی ہے جو مجھے راستہ دکھائے، جو مجھے بتائے کہ اب میں کیا کروں، خدا کے لیے خدا کے لیے کوئی مجھ سے کہہ

آخر ناد یہ بھی تھی جس نے اپنا ایک ماحول بنالیا تھا اور کسی حد تک مطمئن زندگی گزار رہی تھی، دل کے کسی گوشے میں کسی اپنے کی طلب ہو سو ہو، لیکن بظاہر اس نے اپنے آپ کو ایک معمول میں ڈھال لیا تھا، ہاں ایسا بھی تو ہو سکتا ہے مجھے ایسے ہی کسی فارمولے پر غور کرنا چاہئے۔

وہ ساحل سمندر کی جانب چل پڑی، سمندر کا نظارہ بڑی تقویت کا باعث ہوتا ہے، اتنی وسعتوں میں پھیلے ہونے کے باوجود اس کے اندر ایک پرسکون وقار ہوتا ہے۔

ساحل پر پہنچ کر وہ لہروں کا تجزیہ کرنے لگی اور اس کے اپنے احساسات اسے مختلف باتیں سوچنے پر مجبور کرتے رہے۔ سمندر کو پرسکوت کہا جاتا ہے لیکن کیا یہ لہریں سمندر کا حصہ نہیں ہیں، یہ اس قدر بے قرار کیوں ہوتی ہیں یہ کس کی طلب میں دوڑتی ہیں اور سرخ کر ختم ہو جاتی ہیں۔

وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھتی رہی اور پھر ایک بہت بڑی لہر نے اس کے پاؤں اکھاڑ دیئے اور وہ قلابازی کھا گئی، ایک لمحے کے لیے اس کے ہوش و حواس گم ہو گئے تھے سوچنے سمجھنے کی قوتیں، سلب ہو گئی تھیں، لہر اسے زمین سے اٹھا کر سمندر کی جانب لے چلی اور وہ بے بس ہو گئی لیکن اسی وقت دو طاقتور بازوؤں نے اس کے گرد گرفت قائم کر لی۔

ایک قوی ہیکل بدن نے اسے اپنے وجود میں سمیٹ لیا اور لہر سے طاقت آزمائی کرتا ہوا اسے ساحل کی جانب گھسیٹنے لگا۔

قلابازیاں کھانے سے حلق اور ناک میں پانی بھر گیا اور اس کا سانس اکھڑنے لگا لیکن جو کوئی بھی اسے ساحل تک لایا تھا، وہ اس کی اس کیفیت سے واقف تھا، اس نے اسے زمین پر اوندھا لٹایا اور اس کے بدن کو دبائے لگا، پانی اس کے منہ سے خارج ہوا اور کچھ لمحوں کے بعد سانس کی واپسی ہو گئی، تب اس نے اسے سیدھا کیا اور سانس کی بحالی کا عمل کرنے لگا، وہ ہوش و حواس میں تھی، کھلی آنکھوں سے اس قوی ہیکل وجود کو دیکھ رہی تھی جو اسے زندگی کی طرف لانے کی جدوجہد میں مصروف تھا۔

اس کے بدن کا بھرپور لمس محسوس کر رہی تھی اور ایک عجیب سی کیفیت کا شکار ہوتی جا رہی

تھی، یوں لگ رہا تھا جیسے اس نے خود بھی گریم سی استعمال کر لی ہو، پلکیں بوجھل ہو رہی تھیں، دماغ ہوا میں اڑنے لگا تھا۔

پھر جب اس قوی ہیکل وجود نے اسے سمندر کے مضمرات سے پیدا ہونے والے اثر سے آزاد کر دیا تو وہ دو قدم پیچھے ہٹ گیا اور شکیلہ نے اس کا چہرہ دیکھا خاص طور سے آنکھیں.....

نجانے کیوں اس کے ذہن کو ایک شاک سا لگا، اس کی آنکھوں میں ایک نرمی، ہمدردی اور محبت تھی۔

ریستوران تک چلتے ہیں جہاں ہم بیٹھ کر اطمینان سے باتیں کر سکیں گے۔“
”میری حالت اس قابل نہیں ہے، آپ دیکھ رہے ہیں کپڑے بھیگ کر بدن سے چپک رہے ہیں۔“

”ہم مجبور ہیں ایک دوسرے کے احساسات اور خیالات جاننے کے لئے، کیا آپ میری اس درخواست کو ضرورت سے زیادہ تو نہیں سمجھ رہیں۔ آپ سوچ رہی ہوں گی کہ ایک چھوٹا سا کام کر کے یہ شخص میرے سر پر پڑنا چاہتا ہے۔“

”جی نہیں میں بالکل یہ نہیں سوچ رہی، آپ یہ بتائیے گاڑی ہے آپ کے پاس؟“
”نہیں۔“

”میری گاڑی ہے، آئیے جب آپ نے میری زندگی بچالی ہے تو بھلا آپ سے زیادہ محسن اور کون ہو سکتا ہے میرے لئے۔ میرے گھر چلے میں گھر چل کر لباس تبدیل کروں گی اور اس کے بعد ہم بیٹھ کر باتیں کریں گے۔“

جواب میں نو جوان مسکرا دیا پھر بولا۔ ”اب میں یہ کہوں گا کہ آپ اپنی عمر کے حساب سے نا تجربے کار بھی ہیں، میرے جیسے بے شمار لوگ ایسے چکروں میں پھرتے ہیں، وہ کسی حسینہ سے قربت کے خواہش مند ہوتے ہیں اور ایسے کسی موقع سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہیں۔ آپ جیسی نا تجربے کار لڑکیاں ان کا شکار ہو جاتی ہیں، آپ کو کیا معلوم کہ میں واقعی کوئی شریف آدمی ہوں اور اس چھوٹے سے احسان کے بدلے آپ کی قربت حاصل کرنے کا خواہش مند نہیں ہوں۔ آئیے میں آپ کو آپ کی گاڑی تک چھوڑ دوں آپ آرام سے گھر جائیے۔ لباس تبدیل کیجئے اور خدا کے لئے زندہ رہئے، زندگی ایک بار ملتی ہے بار بار نہیں۔“

وہ مسکرا دی پھر بولی۔ ”مجھے میری کار تک تو چھوڑنے چل رہے ہیں نا آپ؟“

”ہاں آئیے، کیا وہ دور کھڑی ہے؟“

”ہاں وہ کافی فاصلے پر کھڑی ہے۔ وہ اس طرف دیکھئے۔“

نو جوان نے اس کی طرف دیکھا پھر بولا ”آئیے“ اور وہ دونوں چل پڑے۔

اچانک ہی شکیلہ نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا پھر بولی۔

”کوئی ہے نہیں آپ کے ساتھ، آپ تنہا ہیں۔“

☆.....☆.....☆

ہو سکتا ہے یہ وقتی طور پر متاثر ہو جانے کا نتیجہ ہو۔ اتنی قربت، ایسا گہرا لگاؤ آج تک اسے محسوس نہیں ہوا تھا اور پھر سب سے بڑی بات یہ کہ نو جوان کی آنکھوں میں اس کے لئے نرمی اور محبت نظر آئی تھی۔ پتہ نہیں یہ اس کی بھول تھی یا پھر یہ شخص واقعی سچا تھا تبھی اس کی آواز ابھری۔ ”کیا کر رہی تھیں آپ، کیا آپ خودکشی کرنے جا رہی تھیں، میں نے دور سے آپ کو بے خودی کے عالم میں سمندر کی جانب بڑھتے ہوئے دیکھا تھا، مجھے بتائیے یہ صرف ایک حادثہ تھا یا جانا بوجھا قدم۔“

اس نے نگاہیں اٹھا کر نو جوان کو دیکھا اور بولی۔ ”آپ یہ کیوں پوچھ رہے ہیں؟“
”میں سمجھتا ہوں یہ سوال غیر ضروری ہے، کیا آپ انسان نہیں ہیں، ایک انسان زندگی کھونے جا رہا ہے اور دوسرا اس سے لا تعلق رہے اور پھر آپ ایک دلکش خاتون ہیں۔ یہ عمر زندگی کھونے کی تو نہیں ہے، میں کیسے مرنے دیتا آپ کو اور یہ سوال بھی میں اسی جذبے کے تحت کر رہا ہوں، اگر کوئی دکھ آپ کو زندگی کھونے پر آمادہ کر رہا ہے تو آپ یقین کیجئے میں آپ کو اس دکھ سے نکال لوں گا، یہ میرا وعدہ ہے۔“

”ارے آپ تو خود اتنے جذباتی ہو رہے ہیں، میں کیا کہوں آپ سے؟“

”کچھ نہ کہیے بس زندہ رہیں، وعدہ کریں کہ جو کچھ کر رہی تھیں اب اس کے بارے میں

آئندہ سوچیں گی بھی نہیں۔“

”آپ میری زندگی کیوں چاہتے ہیں؟“

”کہا نا.....“ نو جوان نے ادھر ادھر دیکھا پھر بولا ”آئیے تھوڑا سا فاصلہ طے کر کے اس

”جی، کوئی نہیں ہے۔“

”آئیے آئیے۔“ پھر وہ اسے لے کر اپنی گاڑی تک پہنچی اور اسے گاڑی کی چابی نکال کر دیتے ہوئے کہا۔ ”اول تو میں اس حادثے سے نروس ہو رہی ہوں، دوسرے بھیکے لباس کے ساتھ ڈرائیونگ کرنا میرے لئے مشکل ہوگا۔ مجھے یقین ہے کہ آپ گاڑی ضرور چلا لیتے ہوں گے۔“

”گویا آپ مجھے ساتھ لے جائے بغیر نہیں مانیں گی؟“

”ہاں نہیں مانوں گی۔“ وہ مسکرا کر بولی۔

نوجوان نے ایک گہری سانس لے کر چابی لے لی اور بولا۔ ”راستہ بتاتی جاسیے۔“

”ہاں مگر میں پچھلی سیٹ پر بیٹھوں گی، کیونکہ آپ کے کپڑے خراب ہو جائیں گے ارے کیسی بے وقوف ہوں میں، آپ کے کپڑوں پر غور ہی نہیں کیا، آپ تو خود بھی بری طرح بھیکے ہوئے ہیں۔“

نوجوان نے مسکرا کر کار کی چابی اس سے لے لی۔ ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھولا، پھر پچھلا دروازہ کھولا اور اس کے بعد خود ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔

”چلئے، گاڑی سٹارٹ کیجئے۔“ وہ پچھلی سیٹ پر نیم دراز ہو گئی۔ نوجوان کا چہرہ عقب نما آئینے میں نظر آ رہا تھا۔ وہ ایک خوش شکل اور سمارٹ نوجوان تھا۔ چہرے پر ایک وقار تھا۔ بہر حال اس نے گاڑی سٹارٹ کر کے آگے بڑھادی اور شکیلہ نے آنکھیں بند کر لیں۔ نوجوان کی آنکھوں کا اندازہ اور پھر اس کی گفتگو اس کے رگ و پے میں ایک سرور دوڑا رہی تھی اور وہ لمحہ لمحہ الفاظ کے مزے لے رہی تھی۔

نوجوان نے کہا۔ ”میرا نام ثنائی ہے، بیرون ملک رہتا ہوں، لیکن یہ میرا وطن ہے، جب دل گھبراتا ہے تو یہاں آ جاتا ہوں، میری سینکڑوں یادیں یہاں سے وابستہ ہیں، والدین کی تدفین یہیں ہوئی۔ کچھ اور عزیز واقارب تھے جواب نہیں ہیں، ہوٹل میں قیام کرتا ہوں اور تھوڑا سا یہاں رہنے کے بعد پھر واپس چلا جاتا ہوں۔“

”کہاں رہتے ہیں آپ؟“

”فرانس، مستقل وہیں قیام ہے میرا، وہیں کا شہری ہوں۔“

”گڈ، کیا کرتے ہیں وہاں؟“

”بس کسی نہ کسی طریقے سے روزی کما لیتا ہوں، آپ کا نام کیا ہے؟“

”عالیہ، عالیہ شاہ۔“

”اب آپ مجھے بتائیں گی نہیں کہ کیا ہوا تھا، آپ خود کشتی کرنے کیوں جا رہی تھیں؟“

شکیلہ آہستہ سے ہنس پڑی پھر بولی۔

”گھر چل کر بتاؤں گی، ہاں ٹھیک ہے، اب یہاں سے لیفٹ پر لے لیجئے۔“

ایک راؤنڈ اباؤٹ سے اس نے کار اپنے گھر کی جانب مڑوا دی اور پھر راستے بتاتی ہوئی اپنی کٹھی میں داخل ہو گئی۔ نجانے کیوں اسے یہ احساس ہو رہا تھا کہ آج وہ کسی شکار کو لے کر نہیں آئی بلکہ یہ شخص اس کی روح کی تشنگی مٹا سکتا ہے۔ اس کے تئیں یہی بتا رہے تھے۔ اس نے اسے بڑی عزت و احترام کے ساتھ ڈرائیونگ روم میں بیٹھنے کی پیشکش کی۔

نوجوان بولا۔ ”میرا لباس بھی خراب ہے۔ آپ کا صوفہ بہت قیمتی ہے۔“

”کیا میری زندگی سے زیادہ قیمتی ہے یہ؟“ وہ بولی۔

نوجوان ہنس پڑا۔ ”شکریہ۔“

نوجوان نے مسکرا کر کہا۔ ”آپ مجھے یہاں لائی ہیں تو کافی یا چائے ضرور پلوائیں گی؟“

”ہاں کیوں نہیں، آپ بیٹھئے، میں ابھی آتی ہوں۔“

نوجوان مسکراتا ہوا صوفے پر بیٹھ گیا، تھوڑی ہی دیر میں شکیلہ واپس آ گئی اور بولی۔

”کافی کے لئے کہہ دیا ہے میں نے، آپ نے اپنا نام ثنائی بتایا تھا نا؟“

”ہاں، اور آپ نے اپنا عالیہ شاہ۔“

”جی۔“

”ثنائى صاحب آپ بہت رحمدل اور اچھے انسان معلوم ہوتے ہیں، میں کچھ تلخ باتیں کہنے جا رہی ہوں لیکن بڑی سچائی ہے ان باتوں میں۔ میرا اب تک کا یہی تجربہ ہے کہ اگر کوئی نوجوان ہیرو بننے کی کوشش کرتا بھی ہے تو خوبصورت لڑکیوں کے لئے۔ آپ کی جگہ اگر اور کوئی ہوتا اور میری شکل دیکھ لیتا تو سوچتا کہ مرقی ہے تو مر جانے دو میرا کیا جاتا ہے، ہاں کسی

خوبصورت لڑکی کو نہیں مرنا چاہئے۔“

ثنائی نے عجیب سی نگاہوں سے شکیلہ کو دیکھا پھر بولا۔ ”میں مانتا ہوں لوگ برے ہیں مگر آپ یہ بتائیے کہ آپ اس احساس کا شکار کیوں ہیں کہ خدا نخواستہ آپ بد صورت ہیں۔ دیکھئے محترمہ! یہ لوگوں کے احمقانہ نظریات ہوتے ہیں کہ سانولے رنگ کو وہ بد صورتی کا نشان سمجھتے ہیں۔ سفید رنگ اور لمبے پتے نقوش ان کی نگاہوں میں حسن کہلاتے ہیں۔ حالانکہ جتنے اور بجنل آپ کے نقوش ہیں اور جتنا ملیح آپ کا رنگ ہے وہ کوئی میری نگاہوں سے دیکھے۔ میں یہی کہوں گا کہ آپ ایک مکمل خاتون ہیں، ہر طرح سے محبت کے قابل۔ اس قابل کہ آپ کی زندگی بچانے کے لئے اپنی زندگی قربان کر دی جائے۔“

شکیلہ کے ہوش اڑنے لگے۔ اس نے سوچا کہ اب ان الفاظ کی ادائیگی کے بعد یہ شخص قہقہے لگائے گا اور اپنا منہ پیٹے گا لیکن اس کی آنکھوں میں سچائی کی لکیریں نظر آرہی تھیں۔ دیر تک شکیلہ پر ان الفاظ کا سحر طاری رہا۔

ملازم کافی لے آیا۔ شکیلہ نے اپنے ہاتھوں سے نوجوان کے لئے کافی بنائی اور ایک پیالی اسے دے کر دوسری پیالی اپنے سامنے رکھی اور بولی۔

”آپ کچھ الگ قسم کے انسان لگتے ہیں یا پھر آپ بڑی سنجیدگی سے میرا مذاق اڑا رہے ہیں۔“

”آج کے بعد میں دوبارہ کبھی آپ کے پاس نہیں آؤں گا۔ میں نہیں جانتا آپ اس قدر بے اعتمادی کا شکار کیوں ہیں۔ اس کے علاوہ میں آپ کے حسن کے گن گار آپ پر کوئی جال نہیں ڈالنا چاہتا لیکن ایک بات بالکل سچ کہہ کر یہاں سے اٹھ جاؤں گا جو لوگ آپ کو بد صورت کہتے ہیں وہ خود اس قدر بدنما ہیں کہ ان پر تھوکنے کو بھی دل نہ چاہے۔“ ثنائی کا لہجہ کافی سنجیدہ ہو گیا اور یوں لگا جیسے وہ ناراض ہو گیا ہو۔

شکیلہ جلدی سے بولی۔ ”خدا کی قسم ثنائی صاحب آپ ناراض نہ ہوں پلیز۔ میری باتوں میں کہیں بھی کسی جگہ کوئی بناوٹ نہیں ہے۔ دنیا نے آج تک میرے ساتھ جو سلوک کیا ہے اسی کی روشنی میں بول رہی ہوں میں، آپ پلیز میری باتوں کا برا نہ مانیں۔“

”آپ ایک بات کا یقین کر لیں کہ میں آپ کا مذاق اڑا رہا ہوں، نہ آپ کو بد صورت

سمجھتا ہوں اور نہ ہی میں آپ سے کوئی لالچ رکھتا ہوں، بس اتنا ضرور سمجھ لیجئے آپ۔“

”آپ ناراض نہ ہوں، میرے لئے تو آپ سے زیادہ قیمتی اور کوئی نہیں ہے کیونکہ آج تک دنیا کی نفرتوں کا شکار رہی ہوں۔“

شکیلہ کے حلق سے ایک سسکی سی نکل گئی اور ثنائی اسے دیکھنے لگا۔ وہ جس قدر محبت سے شکیلہ کو دیکھ رہا تھا یہ شکیلہ کے لئے زندگی کی سب سے عجیب نگاہ تھی۔ کبھی کسی نے اسے اس انداز میں نہیں دیکھا تھا نجانے یہ شخص ایسا کیوں کر رہا ہے۔

کافی دیر تک ثنائی شکیلہ کے ساتھ بیٹھا رہا۔ موضوع بدل گیا تھا، مختلف باتیں ہوئی تھیں۔ اس نے بتایا کہ کافی عرصے پہلے وہ وطن سے چلا گیا تھا کچھ عرصے جرمنی میں رہا، جہاں اس نے پلاسٹک سرجری کا فن سیکھا اور اس کے بعد فرانس پھر بیلجیئم اور آخر میں کینیڈا آ گیا۔ آج کل میں کینیڈا ہی میں رہتا ہوں۔ تنہا زندگی گزار رہا ہوں۔“

نجانے کیوں کینیڈا کا سن کر شکیلہ کے دل پر ایک گھونسا سا لگا تھا۔ اسے اپنی ماں یاد آ گئی تھی لیکن بہر حال اس نے ثنائی سے کوئی ایسا تذکرہ نہیں کیا۔ اور پھر ثنائی نے رخصت کی اجازت مانگی۔

”ایک وعدے کے ساتھ، جب تک آپ یہاں ہیں روزانہ مجھ سے ملیں گے۔“

”ایک شرط کے ساتھ۔“ ثنائی نے مسکرا کر کہا۔

”مجھے منظور ہے۔“

”نہیں زیادہ جذباتیت کا مظاہرہ نہ کریں۔ آپ میرے سامنے ایسی کوئی بات نہیں کہیں گی جس سے آپ اپنے آپ کو بد صورت ظاہر کریں۔ آپ یقین کیجئے یہ میرے احساس کی توہین ہوگی اور اگر احساس کی توہین کی جائے تو.....“ وہ خاموش ہو گیا۔

شکیلہ نے مسکرا کر کہا۔ ”اگر واقعی آپ سچ کہہ رہے ہیں تو میں آپ کی شرط قبول کرتی ہوں۔“

”ایک اور شرط..... جب تک میرا کوئی جھوٹ آپ کے سامنے کھل نہ جائے آپ مجھے جھوٹا نہیں سمجھیں گی۔“

شکیلہ ہنس پڑی پھر بولی۔ ”منظور ہے۔“

ہوگی۔“

دونوں ہنسنے لگے، ثنائی بہت اچھے مزاج کا مالک تھا، اس نے اپنے معمولات شکلیہ کو بتائے تو شکلیہ بولی۔ ”اور جناب عالی اب آپ یہاں جتنے عرصے بھی رہیں گے میری مصیبت میں گرفتار رہیں گے، بعض اوقات انسان ایسی ہی کسی نہ کسی مشکل میں پھنس جاتا ہے۔“

”اگر سچ بولنے کی ہو رہی ہے سز شاہ تو پھر آپ بھی یہ سمجھ لیجئے کہ میں پاکستان آیا تو ہوں لیکن رشتے ناتے کی بات تو دور کی ہے، شناساؤں تک سے محروم ہوں ایسی صورت میں اگر کوئی دلکش ساتھی مل جائے تو کیا بات ہے۔“ یہ دلکش کالفظ بھی شکلیہ کے لئے ایک لذت انگیز تحفہ تھا۔

اس نے اس پر کوئی تبصرہ نہیں کیا، کیونکہ تبصرہ اس لذت کا مزہ خراب کر دیتا۔

ثنائی اس کی زندگی میں ایک نئے انداز سے شامل ہو گیا تھا۔ اب کلب جانے کی ضرورت تھی نہ کسی اور شناسائی کی، مزاج میں زبردست تبدیلی رونما ہوتی جا رہی تھی۔ ہر چیز اچھی لگنے لگی تھی۔

ثنائی کے ساتھ روز سیر و تفریح کے لئے نکلتی۔ ایک پبلک مقام پر ایک چھوٹا سا واقعہ پیش آیا وہ دو تین نوجوان تھے، شکلیہ اور ثنائی کو دیکھ کر ان میں سے ایک نے کہا۔ ”یار شعر الٹا ہو گیا پہلے پہلوئے حور میں لنگور کہا جاتا تھا لیکن اب پہلوئے لنگوری میں حورا ہو گیا، ذرا دیکھو۔“

یہ الفاظ شکلیہ نے بھی سنے اور ثنائی نے بھی۔

ثنائی بڑی سنجیدگی سے واپس مڑا اور اس نے نوجوان سے کہا۔ ”بھائی صاحب ایک منٹ دیں گے آپ مجھے۔“

نوجوان تھوڑی دیر کے لئے تو بھونچکا ہو گیا۔ پھر ست روی سے چلتا ہوا ثنائی کے پاس پہنچ گیا۔

”بڑی دلچسپ بات کہی تھی آپ نے ابھی ہم لوگ محسوس کر رہے تھے کہ کیا ہی پر لطف تبصرہ کیا ہے آپ نے ہم دونوں پر، بڑے مزے کی بات ہے، آپ نے لنگوری اور حورا کا جو تصور پیش کیا ہے وہ بڑے کمال کا ہے۔“

”بات تو میں نے سچ کہی تھی۔“ نوجوان بولا۔

ثنائی چلا گیا لیکن شکلیہ کے لئے ایک خوشگوار احساس چھوڑ گیا۔ زندگی کا آج تک کا دن، ان الفاظ سے عاری تھا جو ثنائی کی زبان سے ادا ہوئے تھے۔ اس نے پہلی بار کسی کی محبت کو محسوس کیا تھا یہ ثنائی کس طرح کا انسان ہے۔ اس کی سوچ کا انداز کیا ہے۔ اصل میں لوگ ہی اسے برے ملے تھے ورنہ کسی کی کیسی ہی شکل ہو کسی کو اس پر اعتراض نہیں ہونا چاہئے، کچھ نہ کہے وہ اس کے بارے میں خاموشی اختیار کر لے تو کیا حرج ہے لیکن اپنے آپ کو حد سے زیادہ معتبر سمجھنے والے خاک و خون میں لپٹ کر سو چکے تھے۔ میں نے جو کیا ٹھیک کیا..... بھلا کسی کے احساس کا مذاق اڑانا کوئی اچھی بات ہے۔ اس کا دل ثنائی کے لئے بے قرار ہونے لگا۔ آہ یہ تو بڑا ہی برا ہوا، میں نے اس سے اس کا صحیح پتہ تک نہیں پوچھا۔ کسی ہوٹل کا نام لیا تھا اس نے لیکن میں نے اس کا روم نمبر نہیں پوچھا۔ ہوٹل کا نام بھی صحیح طریقے سے یاد نہیں۔ وہ اپنے ذہن پر زور دینے لگی اور وہ اس وقت تک بے چین رہی جب تک ثنائی کی آمد کی اطلاع نہ ملی۔ وہ ثنائی کو دیکھ کر خوشی سے کھل اٹھی۔

ثنائی بولا۔ ”بعض اوقات ذرا سا لگاؤ وبال جان بن جاتا ہے، آپ نے تھوڑی سی عزت دی مجھے ایک معمولی سے احساس کے عوض اور میں پھر نازل ہو گیا۔“

شکلیہ نے شکایت بھری نگاہوں سے اسے دیکھا اور بولی۔ ”اور آپ نے مجھے اس قابل بھی نہیں سمجھا کہ اپنا فون نمبر اور ہوٹل کا صحیح پتہ دے دیتے۔“

”آپ اگر خواہش کا اظہار کرتیں تو میں ایسا ضرور کرتا، آپ خود سوچئے کسی کے لئے تھوڑا سا کام کر کے اس پر مسلط تو نہیں ہوا جاسکتا۔“

شکلیہ اسے ڈرائنگ روم میں لے گئی، بڑے پیار سے اسے بیٹھنے کی پیشکش کی اور بولی۔ ”جناب عالی! آپ ذرا اپنے الفاظ پر غور کر لیجئے۔ جس احساس کو آپ دوبار معمولی کام کہہ چکے ہیں وہ میری زندگی اور موت کا مسئلہ تھا اب میں اپنے منہ سے کیا کہوں لیکن آپ بتائیے کیا میری زندگی اتنی معمولی ہے کہ آپ اسے معمولی معمولی کہہ کر ٹالتے رہیں۔“

”شرمندہ ہو گیا، بخدا شرمندہ ہو گیا۔ میں تو اپنے آپ کو ہی زبان داں سمجھتا تھا لیکن جناب ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں۔“

”دوسرا مصرعہ میں نہیں دہراؤں گی، کیونکہ اپنی اوقات سے بڑھ جانے والی بات

تب ثنائی کا الٹا تھپڑ اس کے منہ پر پڑا۔ تھپڑ ایسے زور کا تھا کہ نو جوان کا ہونٹ تو کٹا ہی وہ توازن بھی برقرار نہ رکھ سکا اور نیچے جا پڑا۔

ثنائی خونی نگاہوں سے ان تینوں کو دیکھتا ہوا بولا۔ ”اور کون شاعر ہے آپ لوگوں میں۔“
تینوں نو جوانوں پر کچھ اس طرح رعب پڑ گیا کہ انہوں نے دم دبا کر بھاگ جانا ہی مناسب سمجھا۔

شکیلہ کو یوں محسوس ہوا جیسے اب اس کی زندگی کا رخ بدل گیا ہے، جیسے کوئی محافظ مل گیا ہے اسے جو اس کے احساسات کی تذلیل ہونے سے بچاتا ہے۔ وہ خوشی میں نجانے کیا سے کیا بن گئی۔ ایک ہوٹل میں بیٹھ کر اس نے کہا۔ ”ثنائی، میرے پاس ایک عظیم الشان خزانہ ہے، میں تمہیں اسے دکھانا چاہتی ہوں۔“

”میرے پاس بھی ایک بہت ہی عظیم الشان خزانہ ہے۔“ ثنائی نے اس کے الفاظ سے متاثر ہوئے بغیر کہا۔

”میں جھوٹ نہیں بول رہی، میں ایک سچے اور اصلی خزانے کی بات کر رہی ہوں۔“
”میں بھی جھوٹ نہیں بول رہا عالیہ، میرا خزانہ تم ہو، اس کے علاوہ مجھے کوئی خزانہ درکار نہیں ہے، چاہے تمہارے پاس کتنے ہی خزانوں کے انبار کیوں نہ ہوں۔“

شکیلہ کی زبان بند ہو گئی تھی وہ لمحہ لمحہ ثنائی کی محبت میں ڈوبتی جا رہی تھی اور پھر وہ دونوں ملتے رہے، شکیلہ نے کتنی ہی بار پیشکش کی کہ ثنائی ہوٹل چھوڑ دے اس کے پاس آ جائے لیکن ثنائی نے کہا۔ ”ابھی نہیں عالیہ، میں اپنی زندگی کے کچھ فیصلے کر رہا ہوں۔“

ثنائی زیادہ تر شکیلہ کے ساتھ ہی رہتا تھا، شکیلہ اب خود بھی اس کے آس پاس رہنا چاہتی تھی۔ وہ انتظار کر رہی تھی اس بات کا کہ ثنائی اسے اپنی زندگی میں شامل ہونے کی پیشکش کرے۔ ثنائی نے اسے مختصر اپنے بارے میں بتا دیا تھا لیکن اس نے کبھی شکیلہ سے اس کے بارے میں نہیں پوچھا تھا۔

بارہا شکیلہ کے دل میں یہ خیال آیا کہ ثنائی کو مختصر اپنی زندگی کے واقعات بتا دے لیکن وہ خوفزدہ ہو جاتی تھی، جینے کا ایک چھوٹا سا سہارا ملا تھا اسے کہیں اپنے ہاتھوں سے گوانہ دے۔ بہت دن تک ثنائی نے اپنی زبان نہ کھولی۔

ثنائی اسے لے کر بڑے پر اعتماد انداز میں گھر سے باہر نکلتا تھا لیکن وہ جملے جو لوگ ان کے بارے میں کہتے تھے شکیلہ کے کانوں میں زہر گھولتے رہا کرتے تھے۔ کتنی ہی بار ثنائی نے ایسے سڑک چھاپ نو جوانوں کی پٹائی کی تھی۔ ایسے لمحات میں شکیلہ اسے روک دیا کرتی تھی۔
”نہیں ثنائی، بس کرو۔ یہ لوگ بے قصور ہیں، جو دیکھتے ہیں وہ کہتے ہیں کس کس کو روکو گے۔“

”سب کو..... انہیں کیا حق ہے کہ میری محبوب ہستی کی دل شکنی کریں۔“
”محبوب ہستی۔“ شکیلہ کے منہ سے سسکی جیسی آواز نکلی۔

”ہاں، محبوب شک ہے تمہیں اس بات پر؟“

ثنائی کے لہجے میں بے پناہ سنجیدگی تھی شکیلہ کچھ نہ بول سکی تو اس نے مزید کہا۔ ”عالیہ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں، تمہیں زندگی بھر کے لئے اپنا نا چاہتا ہوں، بولو میری زندگی میں شامل ہوگی۔“

شکیلہ نے سنجیدہ نگاہوں سے اسے دیکھا اور بولی۔ ”ثنائی تم جس قدر اچھے انسان ہو میں تمہیں اس کی سزا نہیں دوں گی، تم بہت رحمدل ہو تم نے میرے ٹوٹے ہوئے دل کو جوڑا ہے لیکن اس کا یہ مقصد نہیں ہے کہ میں تمہاری پوری زندگی کو زخم بنادوں۔ تم بہت پیاری شکل و صورت کے مالک ہو، تمہیں جو بھی میرے ساتھ دیکھے گا وہی سب کچھ کہے گا جو لوگ سڑکوں پر کہتے ہیں۔ وہ تمہارا مذاق اڑائیں گے، میں ڈرتی ہوں اس بات سے ثنائی، دہشت زدہ ہوں اس بات سے، مجھے اپنی صورت کا احساس ہے۔“

”اور میں یہ کہتا ہوں عالیہ کہ یہ صرف تمہاری غلط فہمی ہے۔ یہ اندھے لوگوں کی اندھی باتیں ہیں جو تم نے اپنے آپ کو اس طرح سمجھ لیا ہے ایسی بات ہے نہیں عالیہ اور جہاں تک میری اپنی نگاہ کا تعلق ہے تو میں تمہارے چہرے سے بھی مطمئن ہوں اور دل سے بھی۔“

”ثنائی تم نجانے مجھے کیا دینا چاہتے ہو؟“

”ٹھیک ہے عالیہ، میں تمہیں جو دینا چاہتا ہوں اب وہ دینے کے بعد ہی تم سے بات کروں گا۔“

”میں سمجھی نہیں۔“

چہرہ بدل سکتا ہے؟“

”اس کے لئے تم ثنائی پر بھروسہ کرو۔“ ثنائی نے کہا اور پھر اس دن سے ایک نئے کھیل کا آغاز ہو گیا۔

شکیلہ کی لاکھ فرمائش پر بھی ثنائی نے اس کے ہاں قیام کرنا قبول نہیں کیا تھا۔ شکیلہ نے اس سے کہا۔ ”میں تمہیں بتا چکی ہوں ثنائی کہ میرا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے، کوئی پابندی نہیں ہے میرے اوپر، کوئی پوچھنے والا نہیں ہے کہ ثنائی کون ہے، میں جانتی ہوں کہ ثنائی کون ہے اور بس اتنا کافی ہے میرے لئے تم یہاں بے دھڑک قیام کرو۔“

”نہیں عالیہ، تمہارے کسی معیار کو میں کسی بھی جگہ ہلکے انداز میں نہیں دیکھ سکتا، عالیہ تم اسی طرح آرام سے رہو پورا دن تو میں تمہارے ساتھ رہتا ہوں۔ بس رات کو ہوٹل چلا جاتا ہوں یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ ہم یکجا رہیں گے لیکن ان تمام اصولوں کے ساتھ جو معاشرے نے مقرر کئے ہیں ایک انگلی ہماری جانب نہیں اٹھ سکے گی۔“

شکیلہ نے شکر گزار نگاہوں سے اسے دیکھا تھا۔ ثنائی پورا دن مصروف رہا اور اس کے بعد شکیلہ کے چہرے پر ایک ماسک لگا کر واپس چلا گیا۔ اس ماسک کے پیچھے کون سے نقوش ترتیب پا رہے تھے شکیلہ کو ان کا علم نہیں ہو سکا۔ پانچ دن تک اسے مختلف مراحل سے گزرنا پڑا۔ کبھی اس کے چہرے میں شدید سوزش ہوتی تھی اور وہ ساری ساری رات نہیں سو پاتی تھی، ثنائی مخصوص اوزاروں سے اس کے چہرے کو کھرچتا تھا۔ وہ یہ تکلیف خاموشی سے برداشت کر لیتی تھی۔

رات کی تنہائیوں میں اسے عجیب و غریب احساسات گھیر لیتے تھے، پرانا شناسا اب کوئی نہیں تھا، کلب کے ممبر تھے جن کا اس سے کوئی خاص تعلق نہیں تھا اور بس، یا پھر ایک اور کردار زیارت شاہ کا تھا جس سے اب اسے ملنے کی ضرورت نہیں تھی۔

ثنائی سے باتیں ہوتی رہتی تھیں وہ کہتا تھا۔

”ہم یہاں قیام نہیں کریں گے عالیہ۔ کینیڈا چلیں گے وہاں بھی ایک نئی دنیا آباد ہوگئی ہے۔ وہ دنیا ہمارے اپنے ہم وطنوں کی ہے، بڑی تعداد میں لوگ وہاں موجود ہیں۔“

”ایک کام ضرور کریں گے ثنائی۔“

”ہاں بولو۔“

”سمجھا دوں گا میں تمہیں، میں تمہارا خوف دور کئے دیتا ہوں۔“

پھر اس کے بعد ثنائی نجانے کیا کیا خریداریاں کرتا پھرتا تھا اور پھر سمجھ میں نہ آنے والے سامان کا بیگ لے کر وہ شکیلہ کے ہاں پہنچ گیا۔ اس نے کہا۔

”تمہیں پندرہ دن کے لئے بیمار ہونا پڑے گا۔“ شکیلہ اس کی بات نہیں سمجھ سکی تو وہ دوبارہ بولا۔ ”میں نے تمہیں بتایا تھا کہ دنیا کے تین ملکوں سے میں نے پلاسٹک سرجری کی تعلیم لی ہے اور اب کینیڈا میں بھی میرا پلاسٹک سرجری کا کلینک ہے اور مجھے ایک ماہر فن کہا اور تسلیم کیا جاتا ہے، میں صرف تمہاری خوشنودی کے لئے تمہیں مطمئن کرنے کے لئے تمہارے چہرے میں تھوڑی سی تبدیلی کروں گا تاکہ تمہارا یہ خوف مٹ جائے۔“

شکیلہ اچنبھے سے اسے دیکھتی رہ گئی تھی پھر اس نے کہا۔ ”ہاں تم نے مجھے بتایا تھا مگر میرے ذہن میں یہ بات کبھی نہیں آئی کہ تم میرے چہرے میں کچھ تبدیلیاں بھی کر سکتے ہو۔“

”میں چاہتا تو تمہیں یہ پیشکش بہت پہلے کر سکتا تھا عالیہ، لیکن میں نے ضرورت نہیں محسوس کی، بڑے بڑے حسین اور خوشنما چہرے دیکھے ہیں میں نے لیکن ایک بڑا غلط تجربہ پایا بلکہ میں یہ کہتا ہوں کہ سفید چمڑی اور سبک نقوش اپنا سارا میل دل میں منتقل کر دیتے ہیں۔ اگر ان کے دل تک رسائی ہو جائے تو تم دیکھو گی کہ ان کے دل کس قدر بد نما ہوتے ہیں۔ کوئی فائدہ نہیں عالیہ، چہرے اگر ہمارے معیار حسن پر پورے نہ اترتے ہوں تو کوئی حرج نہیں ہے لیکن اگر دل بد نما ہوں تو پھر یہ سمجھ لو کہ انہیں کسی قیمت پر حسین نہیں کہا جاسکتا۔“

”بڑی بلند سوچ ہے تمہاری ثنائی اس لئے نہیں کہ تم ایک بد شکل عورت کو ذہنی فرحت بخش رہے ہو بلکہ تمہارا معیار زندگی اور تمہاری سوچ بہت ہی مثبت ہے۔“

”بس پھر میں آج سے کام شروع کر رہا ہوں اور سنو اگر تم یہ سمجھو کہ میں تمہارا چہرہ اپنی کسی پسند سے منسوب کر رہا ہوں تو بالکل اس خیال کو دل سے نکال دینا۔ میری پسند تم ہو جو اس وقت میرے سامنے ہو۔ تمہیں دوسرا چہرہ میں تمہاری خوشی کے لئے دے رہا ہوں اگر کوئی نقش تمہارے اپنے ذہن میں ہے تو مجھے اس سے آگاہ کرو تاکہ میں تمہیں ان نقوش میں ڈھالوں۔“

شکیلہ اچنبھے سے اسے دیکھتی رہی۔ پھر بولی۔

”ایسا تو میں شاید کبھی نہیں کر سکوں گی، میں تو صرف یہ غور کر رہی ہوں کہ کیا واقعی میرا

”کوئی خاص بات ہے اس لباس میں؟“
 ”کوئی خاص بات نہیں ہے، میں نئے روپ میں تمہیں اس لباس میں دیکھنا چاہتا ہوں۔“

وہ ثنائی کی ہر بات خوشی سے ماننے لگی تھی۔ اندر لے جا کر لباس کا پیکٹ کھولا تو آنکھیں شدت حیرت سے پھیل گئیں، اتنا حسین لباس تھا کہ نگاہ نہ ٹھہرتی تھی، صحیح معنوں میں ثنائی آسمان سے تارے توڑ لایا تھا۔ پورے لباس میں سونے کے ستارے جگمگا رہے تھے، بہت قیمتی لباس تھا۔ شکلیہ کے لئے کچھ بھی نہیں تھا لیکن جس نے یہ لباس پیش کیا تھا اس کے بعد اس کی قیمت لاکھوں گنا بڑھ گئی تھی۔ شرما شرما کر اس نے یہ لباس پہنا، پتہ نہیں چہرہ اس لباس کے قابل نکلے گا بھی یا نہیں تاہم ثنائی کی خوشی تھی، پھر وہ ثنائی کے پاس پہنچ گئی۔

ثنائی نے کلائی کی گھڑی میں وقت دیکھا اور بولا۔ ”ٹھیک بیس منٹ کے بعد میں تمہارے چہرے سے یہ پٹیاں اتار دوں گا۔“
 ”بیس منٹ بعد کیوں؟“ اس کے منہ سے نکلے بغیر نہ رہ سکا۔

”وہ وقت پورا ہوتا ہے جو اس کے لئے ضروری تھا۔“ ثنائی نے اسے ایک آرام کرسی پر بٹھا دیا اور پھر انتظار کرنے لگا۔ پھر اس کے مشاق ہاتھ مختلف محلولوں کے ساتھ اس کے چہرے کی پٹیاں اتارنے لگے اور رفتہ رفتہ چہرہ نمایاں ہوتا چلا گیا اس نے آئینہ اپنے پاس رکھنا چاہا تھا لیکن ثنائی نے منع کر دیا۔ ”نہیں عالیہ! سب سے پہلے تمہارا چہرہ میں دیکھوں گا، اس سے پہلے تم بھی نہیں دیکھو گی۔“

”جو حکم میرے سرکار۔“ اس نے گردن خم کر کے کہا تھا۔
 ثنائی نے اس کا چہرہ دیکھا۔ دیر تک دیکھتا رہا، شکلیہ اس کی آنکھوں میں اپنا چہرہ تلاش کرتی رہی تھی لیکن نجانے کیوں یہ چہرہ اسے ثنائی کی آنکھوں میں نظر نہیں آیا۔ ثنائی نے ایک لوشن سے اس کا چہرہ دھویا۔ چہرے پر ہلکی سی جلن ہونے لگی۔

”ثنائی میرے چہرے پر جلن ہو رہی ہے۔“

”زیادہ۔“

”بہت زیادہ نہیں لیکن ہے۔“

”میں وہاں اپنی ماں کو تلاش کروں لی، ملوں لی ضرور ایک بار ان سے۔“
 ”مگر وہ تمہیں پہچان تو نہیں سکیں گی۔“

”پہلے میں ان سے دوستی کروں گی، اس کے بعد انہیں اتنا قریب کر لوں گی کہ وہ میرے بغیر زندگی نہ گزار سکیں۔ پھر میں انہیں بتاؤں گی کہ میں ان کی وہ بد صورت بیٹی ہوں، کیا سمجھے۔“
 ”ارے ہاں، یہ تو ایک دلچسپ مشغلہ ہے، حیران رہ جائیں گی وہ، تسلیم ہی نہیں کریں گی۔“

”میں انہیں وہ البم دکھاؤں گی جن میں میری اور خود ان کی تصویریں موجود ہیں۔“
 ”نجانے کیا کیا باتیں کرتی رہتیں تھی وہ۔“

وقت گزر رہا تھا۔ چہرے پر بینڈیج تھی اور پندرہ دن کے بعد یہ بینڈیج اترنی تھی۔ ثنائی نے بڑی مہارت سے اپنا فن اس کے چہرے پر استعمال کیا تھا، یہاں تک کہ وہ دن آ گیا جب شکلیہ کو آئینے میں ایک نئی شکل نظر آنے والی تھی۔ ثنائی نے اسے بتا دیا تھا کہ کل اس کے چہرے کی پٹیاں کھلیں گی، وہ تیار رہے اور وہ رات شکلیہ کے لئے ایک انوکھی رات تھی۔ دل کی دھڑکنیں تھیں کہ قابو میں ہی نہیں آتی تھیں۔ ایک عجیب سی سنسنی، ایک عجیب سا خوف۔ ایک بیٹھا بیٹھا احساس اس کے سارے وجود کو مضطرب کئے ہوئے تھا۔ پلاسٹک سرجری کے بارے میں اس نے بہت بار سنا تھا لیکن غور کبھی نہیں کیا تھا بات ہی ذہن میں نہیں آئی تھی کہ وہ اپنے چہرے کی کچھ نہ کچھ مرمت کرائے۔ اصل میں اپنے چہرے سے اسے کبھی اختلاف نہیں تھا۔ اختلاف صرف ماں کے رویے سے تھا۔ ماں نے اسے اس طرح پامال کیا تھا کہ اس کے بعد اچھی سوچ کے تمام راستے بند ہو گئے تھے۔ وہ صرف مجسم نفرت بن کر رہ گئی تھی۔ اب دیکھیں کیا ہوتا ہے۔
 نجانے کس طرح یہ رات کئی تھی اور صبح ہوئی تھی پھر اس کے بعد وہ ثنائی کا انتظار کرتی رہی تھی۔

کوئی ڈھائی بجے کے قریب ثنائی آیا اس دوران کتنی ہی بار چاہنے کے باوجود وہ ثنائی کو فون نہ کر سکی۔ کیا سوچے گا وہ۔ کتنی بے صبر ہے وہ اپنی نئی شکل سے آشنا ہونے کے لئے۔ ثنائی ایک بڑا پیکٹ ساتھ لایا تھا جو خوبصورت ریپر میں تھا۔

”یہ کیا ہے ثنائی؟“

”یہ لباس پہن لو۔“

آئینے کے سامنے سے ہٹ گئی، اسے چکر سا آ رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ”ثنائی میں بیٹھنا چاہتی ہوں۔“

ثنائی اسے اس کمرے سے نکال لایا، ڈرائنگ روم میں اسے بٹھا دیا۔ وہ بولی۔ ”تمہیں یقین تھا کہ میرے چہرے کے نقوش اتنے حسین ہو جائیں گے۔“ ثنائی مسکرا دیا پھر بولا۔ ”میں نے تمہارے چہرے کی تشکیل کی ہے، یہ نقوش میں نے ترتیب دیئے ہیں تمہارا کیا خیال ہے مجھے نہیں معلوم ہوگا۔“

”ثنائی میں پاگل ہو جاؤں گی۔“
”تمہیں اب ہوش میں آ جانا چاہئے، پاگل تم پہلے تھیں جو اپنے اچھے خاصے خوبصورت چہرے کو نفرت کی نگاہوں سے دیکھتی تھیں۔“

”میں کیا کروں ثنائی، دنیا اسی طرح کی ہے، لوگوں کا انداز فکر نجانے کس طرح کا ہے۔“
”اور اب تم پبلک مقامات پر جاؤ گی اور اپنے حسن کا کمال دیکھو گی۔“ ثنائی نے کہا۔

وہ ثنائی ہی کے ساتھ اس طرح گھر سے باہر نکلی جیسے پہلی بار انسانوں کے سامنے جا رہی ہو اور حقیقت یہ ہے کہ پبلک مقامات پر اس کی جو پذیرائی ہوئی وہ قابل دید تھی۔ وہ روزانہ ثنائی کے ساتھ باہر جاتی تھی، کئی بار مختلف قسم کے واقعات ہوئے۔ ایک بار وہ ایک جنرل سٹور میں داخل ہوئی تو وہاں موجود تمام خواتین و حضرات اس کی جانب متوجہ ہو گئے جنرل سٹور کا مالک جو ایک نوجوان اور خوبصورت آدمی تھا اس کی پذیرائی کے لئے پاس آ گیا۔

”آپ پہلی بار ہمارے سٹور میں تشریف لائی ہیں میڈم، میں کچھ خریداری سے پہلے آپ کو اپنے ساتھ چائے کی دعوت دیتا ہوں۔“ یہ انتہائی حسین نوجوان تھا۔ بڑی پُر سحر شخصیت کا مالک، شکیلہ نے اس کی دعوت قبول کر لی۔

ثنائی ایسے موقعوں پر بے تعلق رہتا تھا۔ ایک طرح سے وہ شکیلہ کے سیکرٹری کے فرائض انجام دے رہا تھا، یہی نہیں جہاں بھی جاتی وہاں لوگوں کو اپنے سامنے زیر ہوتے ہوئے دیکھتی اور اس وقت اسے احساس ہوتا کہ اس کی زندگی بھر کی کوفت ختم ہو گئی ہے۔ اب اسے صلہ مل رہا تھا اور جس طرح وہ سلگتی رہتی تھی اب اس کا ازالہ ہو رہا تھا۔ کئی بار وہ کلبوں میں بھی گئی جہاں گئی وہاں حسین و جمیل نوجوانوں، بوالہوس ادیبز عمروں اور عمر کی آگ میں جلتے بوڑھوں کے

”ایسی جلن تو کئی بار تمہارے چہرے پر ہوئی ہوگی۔“

”ہاں ہوئی ہے کیوں؟“ وہ بولی۔

”یہ کیمیکلز جو میں تمہارے چہرے پر استعمال کرتا ہوں، ان میں سے کچھ ایسے ہیں جن کی وجہ سے شدید سوزش ہوتی ہے لیکن ابھی تمہیں تین ماہ تک یہ کیمیکل برداشت کرنا پڑیں گے۔“

”تین ماہ تک۔“

”ہاں، تمہارے چہرے کے ان نقوش کی پختگی کے لئے، ویسے تم نے جس صبر و سکون کے ساتھ یہ پندرہ دن گزارے ہیں میں اس کی داد دیتا ہوں۔“
”ہائے مجھے میرا چہرہ تو دکھا دو۔“

”آؤ۔“ ثنائی نے کہا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر کسی ملکہ کی طرح سنبھالے ہوئے آئینہ خانے میں پہنچ گیا۔

یہاں قد آدم آئینے موجود تھے اور پہلی بار شکیلہ نے اس آئینے میں اپنے آپ کو دیکھا۔ ادھر ادھر دیکھنے لگی، جو عکس اس آئینے میں نظر آ رہا تھا وہ اس کا نہیں تھا۔ جسمانی موزونیت کسی زمانے میں بہت حسین تھی بعد میں تھوڑا سا بھدا پن آ گیا تھا لیکن پچھلے کچھ عرصے سے اس نے اپنے آپ کو سنبھالا تھا۔

ایک ایسا شخص مل گیا تھا جس نے اس کی پذیرائی کی تھی، چنانچہ اس وقت وہ بہت دلکش جسم کی حامل تھی اور پھر یہ چہرہ، اوپر سے یہ لباس جس کا انتخاب ثنائی نے کیا تھا اس کا دل چاہا کہ اسی جگہ دم توڑ دے۔

ساری عمر جس وحشت میں گزری تھی جس طرح لوگوں کے مذاق کا نشانہ رہی تھی اس وقت سب کی تردید ہو رہی تھی۔ ایک ابدی سکون اس کی روح میں اتر رہا تھا۔ نجانے کب تک وہ پتھرائی نگاہوں سے آئینے میں اپنے آپ کو دیکھتی رہی۔ پیچھے ثنائی کھڑا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اس نے مڑ کر ثنائی کو دیکھا اور پھر بولی۔ ”ثنائی کیا واقعی یہ میں ہی ہوں۔“

”ہاں یہ تم ہو۔“ ثنائی نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

”کیا واقعی..... واقعی.....“ اس کے منہ سے کئی بار آہستہ آہستہ نکلا اور اس کے بعد وہ

اجہاسات کو دیکھتی رہی۔ لوگ اس طرح ظاہری حسن پر مرتے ہیں۔ اسے ایسے ایسے شاندار لوگوں کی جانب سے پذیرائی ملی کہ وہ دنگ رہ گئی، اکثر وہ ثنائی سے کہتی تھی۔ ”ثنائی! کیا بنا دیا تم نے مجھے، یوں لگتا ہے جیسے تم نے اس خزانے سے بڑا خزانہ مجھے دے دیا ہو جو ایک تہہ خانے میں پڑا ہوا ہے، ثنائی میں اب جینا چاہتی ہوں، صحیح معنوں میں جینے کا حوصلہ مجھے پہلی بار ہوا ہے۔“

شہر کا ایک انتہائی دولت مند شخص جس کی دولت کے بے پناہ چرچے تھے اور جس کا نام رضا خان تھا اتفاقاً طور پر ایک جگہ اس سے ملا تو اس کے قریب پہنچ گیا، بڑا بے باک آدمی تھا۔ ”میرے شہر میں حسن و جمال کی یہ صورت موجود اور میں اس سے ناواقف ہوں۔ خاتون معذرت خواہ ہوں، اپنا تعارف کرا سکتی ہیں۔“

یہ دولت مند شخص خود بھی انتہائی اعلیٰ پر سنائی کا مالک تھا، شکلیہ نے ثنائی کے کہنے پر اپنا نام بدل لیا تھا اور کچھ دنوں سے وہ سوچ رہی تھی کہ یہ مکان بھی تبدیل کر دے تاکہ اس کی پرانی شخصیت دفن ہو جائے۔ اس نے رضا خان سے کہا۔ ”بس جناب! آپ کے شہر میں اجنبی ہوں۔“

”تو یہ اجنبیت دور کر لیجئے، کیا آپ آج کا کھانا میرے ساتھ کھانا پسند کریں گی، میرے گھر میں، میری کوٹھی میں۔“

اس نے ثنائی کی طرف دیکھا، ثنائی بے تعلقی سے دوسری طرف دیکھنے لگا۔ رضا خان بولا۔ ”یہ آپ کے.....؟“

ثنائی فوراً اس طرف متوجہ ہو گیا اور اس نے کہا۔ ”جی سر میں ان کا سیکرٹری ہوں۔“

”اوہو، اچھا اچھا۔“ رضا خان نے کسی قدر مطمئن لہجے میں کہا پھر بولا۔ ”جی میڈم.....“

نجانے کیوں شکلیہ نے اس کی یہ دعوت قبول کر لی اور پھر اس نے رضا خان کی عالیشان کوٹھی دیکھی، کوٹھی کیا تھی پورا محل تھا۔ ملازموں کی فوج، رضا خان کے اہل خاندان بھی اس سے بہت محبت کے ساتھ ملے اور اس کے بعد اس شرط پر اسے چھوڑا گیا کہ وہ رضا خان سے ملتی رہے گی۔ رضا خان نے چوتھی ملاقات میں اسے پیشکش کر دی۔

”میں نے شادی نہیں کی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میرا ایک معیار حسن تھا اور سچی بات یہ ہے

وہ شخصیت مجھے نہیں ملی جسے میں اپنی زندگی میں شامل کرنا چاہتا تھا اور اب یوں لگتا ہے جیسے وہ مجھے مل گئی ہے۔ آپ براہ کرم غور کیجئے میں آپ کو اپنی زندگی میں شامل کرنا چاہتا ہوں۔“

اس رات وہ سخت بے چین ہو گئی۔ ثنائی نے اسے ایک چہرہ دیا تھا حقیقت یہ ہے کہ یہ حیثیت اسے ثنائی ہی کی دی ہوئی تھی لیکن ایک اور خیال اس کے دل میں آیا، بہت دن کے بعد اس نے اپنی ڈائری اٹھائی اور اس کے اوراق کھول کر بیٹھ گئی۔

ڈائری کی تحریریں پڑھ کر اس نے اپنے ماضی کو یاد کیا اور اس کے بعد اس نے ڈائری میں آگے لکھنا شروع کیا۔

”ثنائی ایک عام انسان ہے، میں اب جس حیثیت میں ہوں اسی حیثیت میں اپنی زندگی بھر کی محرمیوں کا ازالہ کر سکتی ہوں، میری اس نئی حیثیت کا راز دار صرف ثنائی ہے، ایک عام شخص جو کینیڈا میں رہتا ہے۔ پلاسٹک سر بھری کے ذریعے روزی کماتا ہے، یہ شخص ان سے مختلف ہے لیکن یہ میری ود عزت نہیں کر سکے گا جو دوسرے کر سکتے ہیں۔ رضا خان سے شادی کروں یا نہ کروں، اب وقت ہے کہ میں اپنے حسن کا خراج وصول کروں لیکن ایک شخص ایسا ہے جس کی نگاہوں میں، میں کچھ بھی نہیں ہوں اور وہ ہے ثنائی۔ نہیں ثنائی، پلیز ایک اور احسان کرو مجھ پر، اس دنیا سے چلے جاؤ، گریم سی کی ایک کولی تمہارے لئے بھی ضروری ہے، ہاں بہت ضروری، مجھے معاف کرنا ثنائی مجھے معاف کر دینا۔“ ڈائری میں آخری لفظ لکھنے کے بعد اس نے آنکھیں بند کیں اور گہری گہری سانسیں لینے لگی۔

وہ سوچ رہی تھی کہ اس کا فیصلہ درست ہے یا نہیں اور پھر اس نے آخری بات یہی سوچی کہ اس کا یہ فیصلہ بالکل درست ہے۔ اب اس فیصلے پر عمل کے لئے کچھ وقت درکار تھا، اس دن ثنائی سامنے آیا تو وہ بہت دیر تک اسے دیکھتی رہی، ثنائی نے بھی اس بات کو محسوس کر لیا اور مسکرا کر بولا۔ ”کیا دیکھ رہی ہو عالیہ؟“

”تمہیں۔“ اس نے جواب دیا۔

”ہاں ثنائی، میں سوچ رہی ہوں کہ تمہیں اس احسان کا کیا صلہ دوں جو تم نے مجھ پر کیا ہے۔“

ثنائی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے مدہم لہجے میں کہا۔ ”عالیہ! یہ فیصلہ کرنا

کون سا مشکل کام ہے، میں نے تم سے کہا تھا کہ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں، شادی کرنے کے بعد ہم دونوں کینیڈا چلے جائیں گے، تم نے مجھ سے کہا تھا کہ وہاں تم اپنی ماں کو تلاش کرو گی۔ عالیہ میں سب کچھ تمہیں تمہاری خواہش کے مطابق دوں گا، تم نے اپنے آپ کو بد نما سمجھا، میں نے تمہیں ایک خوشنما چہرہ دے دیا اور بھی مجھ سے جو کچھ چاہتی ہو مجھے بتاؤ۔“

”نہیں ثنائی، جتنا کچھ تم دے چکے ہو وہی میرے لئے بہت ہے، میں بس تمہیں تمہارے شایان شان تحفہ دینا چاہتی ہوں۔“

”اس کا فیصلہ تمہیں ہی کرنا ہوگا عالیہ۔“

”آج کیا دن اور کیا تاریخ ہے ثنائی؟“

”بدھ کا دن کہے اور ستائیس تاریخ ہے۔“

”اتوار کو ہم لوگ زندگی کا کوئی اہم فیصلہ کریں گے۔ بس تین دن میں، صرف تین دن۔“

”ٹھیک ہے، میں بھی اب زیادہ عرصے یہاں نہیں رہ سکتا مجھے واپس جا کر اپنا کام سنبھالنا ہے۔“

”ٹھیک ہے، اتوار آنے میں زیادہ دن نہیں ہیں۔“

ثنائی خاموشی سے آنکھیں بند کر کے کچھ سوچتا رہا تھا اور شکلیہ اس کا چہرہ دیکھتی رہی تھی۔ اتوار کا دن واقعی کچھ خصوصیتوں کا حامل تھا، صبح ہی سے موسم ابر آلود ہو گیا اور پھر ننھی ننھی پھواروں نے ماحول کو انتہائی خوشگوار بنا دیا۔ اس دن شکلیہ اپنی زندگی کا آخری کھیل کھیلنے کے لئے تیار تھی۔ اپنے طور پر اس نے یہی فیصلہ کیا تھا کہ اس کھیل کو آخری کھیل بنا دے۔ ایک خوبصورت جگہ منتخب کر لی تھی اس نے اور یہ طے کر چکی تھی کہ یہ نشست ثنائی کے ساتھ آخری نشست ہوگی۔

گریم سی کی شیشی سے اس نے گولی نکال لی تھی اور اسے اپنی انگلیوں کے درمیان محفوظ کر لیا تھا۔ اس وقت بھی ثنائی اس کے چہرے کو دائی ٹیچ دے رہا تھا۔ ایک خوشبودار محلول کو برش سے وہ اس کے چہرے پر پینٹ کر رہا تھا۔

شکلیہ نے کہا۔ ”آج میرے چہرے پر سوزش نہیں ہو رہی۔ اس کے علاوہ اس محلول کی

خوشبو بھی الگ ہے۔“

”ہاں یہ الگ چیز ہے اس سے تمہارے چہرے کی دلکشی ہمیشہ برقرار رہے گی۔“

”تم نے میرے لئے بہت کچھ کیا ہے ثنائی، میں سوچتی ہوں کہ زندگی کے کسی دور میں تمہیں اس کا بدل بھی دے سکوں گی یا نہیں۔“

ثنائی خاموش ہو گیا، کچھ دیر کے بعد وہ اپنے کام سے فارغ ہو گیا، شکلیہ ہنس کر کہنے لگی۔

”اتفاق سے آج موسم بھی کمال کا ہے۔“

”ہاں واقعی، اتنا حسین موسم کم ہی ہوتا ہے۔“

”میں کافی بنواتی ہوں۔“

”لطف دے جائے گی۔“ ثنائی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

شکلیہ اپنی جگہ سے اٹھ گئی۔ ثنائی مسکراتے ہوئے اسے دیکھتا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد شکلیہ واپس آ گئی اور اس کے پیچھے پیچھے ملازم بھی اندر داخل ہو گیا۔

”ارے کافی اتنی جلدی تیار ہو گئی۔“

”میں اسے پہلے سے کہہ چکی تھی۔“ شکلیہ نے کہا اور ملازم کے جانے کے بعد کافی بنانے لگی۔

پھر ایک پیالی اس نے ثنائی کی طرف سرکادی۔ باہر بادل زور سے گرے تھے اور دونوں اس طرف متوجہ ہو گئے تھے، شکلیہ نے اپنی پیالی سے کافی کا سپ لیا وہ اس کافی کو جھوٹا کر دینا چاہتی تھی تاکہ بیچ میں کوئی گڑبڑ نہ ہو جائے، ثنائی مسکراتا ہوا بولا۔ ”کمال کا موسم ہے۔“ وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور کافی کی پیالی لے کر کھڑکی کے پاس پہنچ گیا۔

کھڑکی کے دوسری طرف سرسبز و شاداب لان پھیلا ہوا تھا بوندیں اب بارش میں تبدیل ہو چکی تھیں اور مدھم مدھم چھینٹیں بہت خوشگوار لگ رہی تھیں۔ شکلیہ بھی اپنی کافی کی پیالی لے کر کھڑکی کے پاس آ کھڑی ہوئی۔

ثنائی نے کہا۔ ”مجھے بارش بہت پسند ہے، ہمیشہ بارش میں میرے اندر ایک عجیب سی جولانی پیدا ہو جاتی ہے، آؤ بیٹھیں۔“ وہ واپس آ گیا اور پھر کافی کے چھوٹے چھوٹے سپ لینے لگا۔

شکیلہ مسکراتی نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی، اس نے کہا۔ ”کینیڈا میں تو کافی بارش ہوتی ہے۔“

”ہاں تم وہاں کے موسم کو دیکھو گی تو تمہیں خوشی ہوگی، حقیقت یہ ہے کہ ہم لوگوں کے لئے وہ موسم کافی دلکش ہوتا ہے۔“

”مگر ثنائی ایک بات بتاؤ۔“ شکیلہ نے آخر کار اپنے کام کا آغاز کر دیا۔

ثنائی نے کافی ختم کر کے اپنا خالی کپ میز پر رکھ دیا۔

شکیلہ نے ایک نگاہ اس پر ڈالی اور پھر ایک گہری سانس لے کر بولی۔ ”ثنائی انسان کس قدر خود غرض ہے کیا کبھی کسی انسان نے کسی دوسرے کے بارے میں بھی سوچا ہوگا؟“

”لوگ ہمیشہ ایک دوسرے کے بارے میں سوچتے ہیں، ان کی شخصیت کو پڑھنے کی کوشش کرتے ہیں بشرطیکہ وہ اجنبی ہوں۔“

”میں خود غرضی کی بات کر رہی تھی۔ ایک وقت وہ تھا ثنائی جب میری بد صورتی مجھے دیوانہ کئے ہوئے تھی اور تم نے بڑے ماہرانہ طریقے سے مجھے یہ حسین نقوش دے کر میری ازلی پیاس بجھا دی لیکن جب بھی میں نے اپنے ماضی، حال اور مستقبل کے بارے میں سوچا ایک عجیب خیال میرے دماغ میں جڑ پکڑتا رہا وہ یہ کہ ابھی کچھ عرصے پہلے دنیا کا ہر شخص مجھے بد صورت قرار دے کر مجھ سے نفرت کا اظہار کرتا رہا اور اب جبکہ میرے نقوش تبدیل ہو چکے ہیں بڑے بڑے لوگ میرے ارد گرد چکرانے لگے ہیں۔ میں خاص طور سے رضا خان کی بات کر رہی ہوں، وہ صاحب حیثیت بھی ہے، خوب صورت بھی ہے اور سچ بات یہ ہے کہ اپنا ایک مقام رکھتا ہے، مجھے دولت سے دلچسپی نہیں ہے کیونکہ دولت میرے پاس بہت ہے، میں صرف ایک مقام کے بارے میں سوچتی ہوں جو مجھے مل رہا ہے۔۔۔۔۔ ثنائی لوگ مجھے بد صورت کہتے تھے اور میں۔۔۔۔۔“ وہ رکی تو ثنائی ہنس کر بولا۔ ”ہاں اور تم انہیں موت کے گھاٹ اتار دیتی تھیں۔ اپنے دریافت شدہ زہر اور اپنے لباس میں چھپی ہوئی ایک چھری کے ذریعے جس کے استعمال میں تم نے مہارت حاصل کر لی تھی۔“

شکیلہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگی تو ثنائی مزید بولا۔ ”تمہارا اصل نام شکیلہ ہے، اس کے بعد تم رشیدہ بنیں، رشیدہ کے بعد مسز عالیہ شاہ اور اس کے بعد تم نے جتنے افراد کو

قتل کیا کہو تو ان کے نام بھی میں تمہیں بتاؤں۔ پچارے ایک ذرا سی غلطی کا شکار ہوئے، بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ ایک معمولی سی لغزش نے انہیں زندگی سے محروم کر دیا۔ تم شکیلہ ایک انتہائی بھیا نک عورت ہو۔ اصولی طور پر تمہارا چہرہ بھیا نک ہی رہنا چاہئے تھا۔“

شکیلہ کا چہرہ دھواں ہو گیا تھا۔ اس نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا ”نت۔۔۔۔۔ تمہیں، تمہیں یہ ساری باتیں کیسے معلوم ہوئیں؟“

”شکیلہ قدرت ہر مظلوم کا انتقام لیتی ہے۔ تم پر ڈائری لکھنے کی دیوانگی سوار ہوئی اور تم نے اپنا ہر جرم اس ڈائری میں منتقل کر دیا۔ یہ قدرت کی طرف سے ایک عمل تھا جو اس نے تم سے شروع کرایا۔ میں تمہارے ساتھ کتنا وقت گزار چکا ہوں تمہیں اس کا علم ہے، میں نے اس ڈائری کا ایک ایک صفحہ پڑھا ہے اور آخری بھی، جس میں تم نے میرے قتل کا فیصلہ کیا تھا، شکیلہ اب مجھ سے میری کہانی سنو۔ میرا نام ثنائی ہے۔ راجیل جسے تم نے زندگی سے محروم کر دیا۔ میرا چھوٹا بھائی تھا۔ اس نے کبھی تمہیں میرے بارے میں بتایا، یا نہیں مجھے نہیں معلوم لیکن جب میرے علم میں یہ بات آئی کہ وہ گم ہو چکا ہے تو میں سب کچھ چھوڑ کر یہاں واپس آ گیا اور میں نے اس کے بارے میں ہر طرح سے چھان بین شروع کر دی۔ میں اپنے بھائی پر اپنی زندگی بچھا کر رہا تھا۔ مختلف جگہوں سے معلومات حاصل کرنے پر مجھے تمہارا نشان ملا کچھ لوگوں نے مجھے تمہارے بارے میں بتایا کہ تم ایک پراسرار شخصیت کی مالک ہو۔ راجیل کو تمہارے ساتھ دیکھا گیا تھا اور اس کے بعد وہ اچانک گم ہو گیا۔ شکیلہ میں نے تم تک پہنچنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ کچھ لوگوں سے مجھے تمہارے کمپلیکس کے بارے میں علم ہو چکا تھا۔ میں نے وہی چال چلی جو مجھے چلنی چاہئے تھی۔ ساحل سمندر پر تمہاری زندگی بچاتے ہوئے میں نے محبت کا بیج دیا اور تم میرے جال میں پھنس گئیں۔ راجیل کی موت کے بارے میں مجھے کچھ نہ پتہ چلتا اگر تمہارے گھر میں یہ ڈائری مجھے نہ مل جاتی۔ تم اتنی بد بخت عورت ہو شکیلہ کہ تم نے میرے بھائی کی لاش بھی گم کر دی اور اس کا کوئی نشان بھی نہ رہنے دیا۔ شکیلہ گریم سی کی یہ گولی جو تم نے میری کافی کی پیالی میں ڈالی تھی تمہارے معدے میں بھی اتر سکتی تھی۔ میں تمہیں جیل میں بھی ڈلوا سکتا تھا تمہیں قتل بھی کر سکتا تھا لیکن بات ہی کیا ہوتی تمہیں مارنا تو میرے لئے بہت آسان تھا مگر اس سے میرا بھائی تو مجھے واپس نہیں مل جاتا۔ لطف تو اب آئے گا کہ تم زندگی بھر اذیت میں

گرفتار رہو گی، شکلیہ! کافی کی وہ پیالی جو تم نے میرے لئے بنائی تھی وہ تو کھڑکی کے دوسری طرف تمہارے لان پر خالی ہو چکی تھی میں بس اسے ہونٹوں سے لگا لگا کر تمہیں یہ احساس دلاتا رہا کہ میں کافی پی چکا ہوں۔ بے شک انسان بہت خود غرض ہوتا ہے، تم رضا خاں سے شادی کے بارے میں سوچ رہی تھیں کر لینا اس سے شادی مجھے تم ایک بد نما تصور کے علاوہ اور کچھ نہیں محسوس ہوتیں۔ مجھے تم سے جو انتقام لینا تھا وہ لے چکا ہوں۔ اپنا چہرہ دیکھ لو جو نقوش میں نے تمہیں دیئے تھے وہ واپس لے لئے ہیں، میں نے، کیا سمجھیں۔“

شکلیہ کے حلق سے ایک چیخ نکل گئی۔ اب تک کی گفتگو اس نے بڑے صبر و سکون سے سنی تھی لیکن یہ الفاظ اس کے لئے سخت وحشت کا سبب تھے۔

ثنائی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”یہ ڈائری میں اپنے ساتھ لئے جا رہا ہوں شکلیہ تاکہ تمہارے جرائم کی فہرست میرے پاس رہے۔“

شکلیہ نے کچھ نہیں سنا وہ دوڑتی ہوئی آئینے کے سامنے پہنچ گئی۔

ثنائی کے الفاظ نے اسے انتہائی خوفزدہ کر دیا تھا اور جب اس نے اپنا چہرہ دیکھا تو اس کے حلق سے ایک دلخراش چیخ نکل گئی۔ اس کا چہرہ جگہ جگہ سے پھٹ رہا تھا۔ چہرے پر دراڑیں پڑ رہی تھیں اور وہ اس قدر بھیا نک لگ رہی تھی کہ دیکھنے والا اسے دیکھے تو چیخ مار کر بے ہوش ہو جائے۔ اس کے حلق سے وحشت بھری آواز نکلی۔ ”ثنائی ثنائی یہ تم نے کیا کیا؟“ یہ کہہ کر وہ پلٹی لیکن ثنائی جا چکا تھا۔

(ختم شد)